ذکر و فکر
مفتی محمد تقی عثمانی
مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

ذِکر و فکر

مُفتی محمد تقی عُثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم
و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

پیش لفظ

مجھ سے روزنامہ ''جنگ'' کی انتظامیہ نے فرمائش کی تھی کہ میں ہفتہ وار اُن کے لیے کالم لکھا کروں۔ میں نے یہ فرمائش اس لیے منظور کی کہ ''جنگ'' کے وسیع ذریعہ ابلاغ سے ایسے مسائل پر لوگوں کو متوجہ کیا جا سکتا ہے جو لاپروائی کا شکار ہیں چنانچہ ''ذکر و فکر'' کے عنوان سے میرا یہ کالم کافی عرصے تک ''جنگ'' کے ادارتی صفحے پر شائع ہوتا رہا۔ یہ کتاب انہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قارئین کے لیے مفید اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائیں۔ آمین

محمد تقی عثمانی

۲۷/ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۳۹	ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں (۲)	۲۵۰
۴۰	پڑوسی	۲۵۵
۴۱	تھوڑی دیر کا ساتھی	۲۶۰
۴۲	شادی بیاہ کی رسمیں	۲۶۶
۴۳	سورج گرہن	۲۷۱
۴۴	مہر شرعی کی حقیقت	۲۷۶
۴۵	کچھ جہیز کے بارے میں	۲۸۲
۴۶	شادی کی دعوت اور بارات	۲۸۷
۴۷	نکاح اور ولیمہ ..... چند سوالات کا جواب	۲۹۳
۴۸	خطبۂ نکاح کا پیغام	۲۹۷
۴۹	احسان اور ازدواجی زندگی	۳۰۲
۵۰	خاندانی نظام	۳۰۸
۵۱	نکاح اور برادری	۳۱۵
۵۲	طلاق کا صحیح طریقہ	۳۱۹
۵۳	دُنیا کے اُس پار (۱)	۳۲۵
۵۴	دُنیا کے اُس پار (۲)	۳۳۳
۵۵	دُنیا کے اُس پار (۳)	۳۴۰
۵۶	مفت کا عہدہ	۳۴۷
۵۷	جشن آزادی کے دِن	۳۵۳

☆ ☆ ☆

شروع اللہ کے نام سے

جب مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں ,, جنگ ،، کے لئے باقاعدہ لکھا کروں تو میرے ذہن میں بہت سے معاشرتی مسائل کی ایک فہرست آ گئی جن سے ناواقفیت یا غفلت کی بنا پر ہم نے دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے لئے بے شمار مشکلات پیدا کر رکھی ہیں۔ خیال ہوا کہ ہمارے ملک میں تحریری سطح پر ,, جنگ ،، ہی ایک ایسا اسٹیج ہے جہاں سے کوئی آواز دُور دُور تک پہنچائی جا سکتی ہے اور ان مسائل کی طرف متوجہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے نام پر میں فی الحال انہی معاشرتی مسائل پر لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ لیکن چونکہ ہمیں ہر کام کا آغاز ,, بسم اللہ ،، سے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لئے اس سلسلے کو بھی میں تبرکاً ,, بسم اللہ ،، ہی سے شروع کرتے ہوئے آج کی پہلی صحبت میں کچھ گذارشات ,, بسم اللہ ،، ہی کے بارے میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ,, ہر وہ اہم کام جو اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے، ادھورا ہے،، چنانچہ آپ ﷺ نے ہر اہم کام کو ,, بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ،، سے شروع کرنے کی تاکید فرمائی ہے، یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت، پانی پیتے وقت، سواری پر سوار ہوتے وقت، کوئی خط یا تحریر لکھتے وقت، غرض ہر قابلِ ذکر مشغلے کے شروع میں آپ ﷺ ,, بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ،، پڑھا کرتے تھے۔

بظاہر یہ ایک مختصر سا عمل ہے جسے بعض اوقات ایک رسمی کارروائی سمجھ کر نظر

انداز کر دیا جاتا ہے، لیکن در حقیقت یہ کوئی رسم نہیں، بلکہ اس سے ایک بہت بنیادی فکر کی آبیاری مقصود ہے، یہ ایک ایسی اہم حقیقت کا اعتراف ہے جس کو پیش نظر رکھنے سے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں انسان کا پورا نقطہ نظر اور معاملات طے کرنے کے لئے اسکی پوری Approach ہی بدل جاتی ہے، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس کائنات کا کوئی ذرّہ اللہ تعالی کے حکم اور اسکی مشیّت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، انسان کو اپنی عملی زندگی میں اسباب کو اختیار کرنے کا حکم ضرور دیا گیا ہے، لیکن نہ تو یہ اسباب خود بخود وجود میں آگئے ہیں، اور نہ ان اسباب میں بذاتِ خود کوئی کارنامہ انجام دینے کی طاقت موجود ہے، حقیقت میں ان اسباب کو پیدا کرنے والا اور ان میں تاثیر پیدا کر کے ان کے نتیجے میں واقعات کو وجود میں لانے والا کوئی اور ہے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ ہم جب پانی پینا چاہتے ہیں تو بسا اوقات غفلت اور بے دھیانی کے عالم میں پی کر فارغ ہو جاتے ہیں، ایک ظاہر بین انسان زیادہ سے زیادہ اتنا سوچ لیتا ہے کہ اسے یہ پانی کس کنویں، کس دریا، کس جھیل یا نہر سے حاصل ہوا، لیکن اس کنویں یا دریا اور جھیل تک پانی کیسے پہنچا؟ اور انسان کی پیاس بجھانے کے لئے اللہ تعالی کی قدرتِ کاملہ نے کائنات کی کتنی قوتیں اسکی خدمت میں لگا رکھی ہیں؟ اور اس کے لئے کیسا عجیب و غریب نظام بنایا ہوا ہے؟ اس کا دھیان بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔

اللہ تعالی نے پانی کا عظیم الشان ذخیرہ سمندروں کی شکل میں محفوظ فرمایا ہے، اور اسے سڑنے سے بچانے کے لئے اوّل تو اسے نمکین بنا دیا ہے، اور دوسری طرف اسے ہر دم اس طرح رواں دواں کر دیا ہے کہ اسکی موجیں حرکت اور بیتابی کی علامت بن گئی ہیں، اور باوجودیکہ اس میں روزانہ ہزارہا جانور مرتے ہیں، لیکن یہ پانی کبھی سڑتا نہیں، لیکن انسان کے لئے پانی کے اس عظیم الشان ذخیرے سے براہِ راست فائدہ اٹھانا ممکن نہیں تھا، اس لئے کہ اول تو اس پانی کی کڑواہٹ ایسی ہے کہ اسے انسان پی نہیں سکتا، دوسرے

اس پانی کا حصول صرف آس پاس بسنے والوں کے لئے ہی ممکن ہے، دور رہنے والے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اس کے لئے اللہ تعالی نے ایک طرف سمندر سے مون سون اٹھا کر اس میں ایک ایسا خود کار پلانٹ نصب کر دیا ہے جس کے ذریعے سمندر کے کڑوے پانی کو میٹھا کرنے کا حیرت انگیز نظام کسی انسانی محنت یا مالی خرچ کے بغیر مسلسل جاری ہے، دوسری طرف اس مون سون کو بادلوں کی شکل دے کر ایک مفت ائیر کارگو سروس فراہم کر دی گئی ہے جس کے ذریعے یہ سیّال پانی ہوا میں تیرتا اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل کی مسافت طے کرتا ہے، اور اسکی فضائی پرواز نے دنیا کے ہر خطّے کو سمندر کا پانی میٹھا کر کے سپلائی کرنے کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔

لیکن نہ تو انسان یہ برداشت کر سکتا تھا کہ اس پر ہر وقت بادل چھائے رہیں، اور بارش برستی رہے، اور نہ اس میں یہ طاقت تھی کہ وہ سال بھر یا چھ مہینے کا پانی ایک ساتھ اکٹھا کر کے رکھ سکے، لہذا اللہ تعالی کی قدرت و حکمت نے یہ انتظام فرمایا کہ بادلوں کا یہ پانی پہاڑوں پر برسا کر اس کے منجمد ذخیرے برف کی شکل میں محفوظ فرما دیئے، پانی کا یہ دلفریب کولڈ اسٹوریج پہاڑوں کی چوٹیوں پر دلآویز نظارے تو فراہم کرتا ہی ہے، لیکن اس کا اصل کام ہماری پیاس بجھانے کا انتظام ہے۔

پھر انسان کو یہ تکلیف بھی نہیں دی گئی کہ وہ اس برفستان میں خود جا کر اپنی ضرورت پوری کرے، بلکہ اسے سورج کی گرمی سے پگھلا کر دریا اور پہاڑی نالے بنا دیئے گئے، اور اس کے علاوہ پانی کے سوتوں کے ذریعے زمین کے کونے کونے میں ایسی پائپ لائن بچھا دی گئی ہے کہ انسان جہاں سے زمین کھودے وہیں سے پانی برآمد ہو جاتا ہے۔

سمندر سے پانی اٹھا کر اسے پہاڑوں پر محفوظ کرنے اور پھر زمین دوز پائپ لائن کے ذریعے دنیا کے چپّے چپّے تک اسے پہنچانے کے اس عظیم الشان سلسلے میں کہیں بھی انسانی

عمل یا اسکی فکر و کاوش اور منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں ہے، انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ان بہتے ہوئے دریاؤں یا زمین میں پوشیدہ سوتوں سے اپنی ضرورت کے مطابق پانی حاصل کرلے، اگرچہ یہ کام پانی کی سپلائی کے مذکورہ بالا قدرتی اور آفاقی نظام کے مقابلے میں نہایت محدود اور مختصر کام ہے، لیکن اس محدود سے کام کی انجام دہی میں بھی انسان بڑی مشقت اٹھاتا، بہت روپیہ خرچ کرتا اور کائنات کے دوسرے وسائل سے کام لیتا ہے۔

پانی کا ہر وہ گھونٹ جو ہم ایک لمحہ میں اپنے حلق سے اتار لیتے ہیں، آب رسانی کے اس سارے طویل عمل سے گذر کر ہم تک پہنچتا ہے جس میں سمندر، بادل، پہاڑ، آفتاب، ہوائیں، ندی نالے، زمین اور اس میں پوشیدہ خزانے، اس پر چلتے ہوئے جانور، اور بالآخر انسان اور اس کے بنائے ہوئے آلات، سب اپنا اپنا کردار ادا کر چکے ہوتے ہیں۔

جب آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ پانی پینے سے پہلے "بسم اللہ" کہو، یعنی اللہ کا نام لیکر پینا شروع کرو، تو درحقیقت اس کا مقصد یہی ہے کہ پانی کی اس نعمت کے استعمال سے پہلے اللہ تعالی کے اس احسان عظیم کو یاد کرو جس نے تمہارے ہونٹوں تک پانی کے یہ گھونٹ پہنچانے کے لئے کائنات کی کتنی قوتوں کو تمہاری خدمت میں لگادیا ہے، اس پانی کے حصول کے لئے تم نے چند ظاہری اسباب ضرور اپنے عمل اور اپنی محنت سے اختیار کئے ہیں، لیکن ان ظاہری اسباب کی رسائی ایک خاص حد سے آگے نہیں، اس حد کے پیچھے اللہ تعالی کی ربوبیت کا وہ محیّر العقول نظام کام کر رہا ہے جو انسان کے عمل ہی نہیں، اس کی سوچ اور تصوّر کی پرواز سے بھی ماورا ہے۔

پھر ایک عام آدمی کو اس سے زیادہ کسی بات سے سروکار نہیں ہوتا کہ اسے پیاس لگی تھی جسے اس نے ایک گلاس پانی پی کر تسکین دیدی، لیکن یہ پانی حلق سے اتر کر کہاں جارہا ہے؟ اور اس کے جسم کی کیا کیا خدمات انجام دے رہا ہے؟ اس کی طرف عام طور سے کسی

کا دھیان بھی نہیں جاتا، ذرا غور سے کام لیں تو در حقیقت ہماری جسمانی مشینری کے ایک ایک پرزے کو پانی کی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ مشینری کام نہیں کر سکتی تھی، لیکن چونکہ عام انسان یہ بھی پتہ نہیں لگا سکتا کہ اس کے جسم میں کب پانی کی مطلوبہ مقدار کم ہو گئی ہے، اس لئے قدرتِ خداوندی نے اسے پیاس کی شکل میں ایک عام فہم میٹر عطا کر دیا ہے، جو ہر عالم اور جاھل، شہری اور دیہاتی، یہاں تک کہ ناسمجھ بچّے کو بھی خود بخود یہ بتادیتا ہے کہ اُسے پانی کی ضرورت ہے، وہ اُسے صرف اپنے ہونٹ اور حلق کی ضرورت سمجھتا ہے، اور انہی دو چیزوں کو تر کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ پیاس بجھ گئی، لیکن در حقیقت پانی کا اصل فائدہ اس سے کہیں آگے ہے، وہ صرف ہونٹ اور حلق کی نہیں پورے جسم کی مانگ تھی، اور وہ حلق سے گذر کر جسم کے ہر اس حصے کو سیراب کرتا ہے جسے اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے اسکی ضرورت تھی، اور اس طرح جسم کی اندرونی پائپ لائن کے ذریعے وہ پانی سَر سے لیکر پاؤں تک ضرورت کی تمام جگہوں تک پہنچایا جاتا ہے، پھر جتنے پانی کی جسم کو ضرورت ہوتی ہے، اُتنا جسم میں باقی رہتا ہے، اور باقی حصہّ جسم کی دھلائی کرنے کے بعد اپنے ساتھ مضر اجزا کو بہا کر دوبارہ جسم سے باہر نکل جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ ہارون رشید ایک مرتبہ پانی پینے کے لئے گلاس ہاتھ میں لئے ہوے تھے وہ اس گلاس کو ہونٹوں تک لیجانے لگے تو قریب ہی بیٹھے ہوے بہلول مجذوبؒ نے ان سے کہا کہ امیر المؤمنین! ذرا ایک لمحے کے لئے رک جایئے، ہارون رشید رک گئے تو بہلول نے کہا: ”ذرا بتایئے کہ اگر شدید پیاس کے وقت آپ کو یہ پانی نہ ملے تو آپ اسے حاصل کرنے کے لئے کتنی دولت خرچ کردینگے؟“ ہارون رشید نے کہا کہ ”ساری دولت“، بہلول نے کہا اب پی لیجئے، جب وہ پی کر فارغ ہوے تو بہلول نے پھر پوچھا کہ ”امیر المؤمنین! ذرا یہ بھی بتادیجئے کہ جتنا پانی آپ دن بھر میں پیتے ہیں اگر وہ سارے کا

سارا جسم کے اندر ہی رہ جائے اور باہر نہ نکل سکے تو اُسے باہر نکالنے کیلئے آپ کتنی دولت خرچ کردینگے؟،، ہارون نے پھر کہا کہ ,,ساری دولت،، اس پر بہلول نے کہا کہ ,,آپ کی ساری دولت ایک گلاس پانی کو جسم میں داخل کرنے اور اسے باہر نکالنے کی قیمت بھی نہیں ہے،،۔

کہنے کو یہ ایک لطیفہ ہے لیکن واقعۃً یہ ایک ایسی سامنے کی حقیقت ہے جو بدیہی ہونے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔

اسی طرح روٹی کے اس نوالے کو دیکھ لیجئے جو ہم ایک لمحے میں حلق سے اتار لیتے ہیں، ایک ظاہر بیں نگاہ صرف اس حد تک جاتی ہے کہ ہم نے اپنے کمائے ہوے پیسوں سے بازار سے آٹا خریدا، اور اس سے روٹی تیار کرلی، لیکن بازار تک اُس آٹے کو پہنچانے کے لئے کائنات کی کتنی طاقتیں سرگرم عمل رہیں؟ اس کی طرف عموماً نگاہ نہیں جاتی، انسان کا کام اتنا ہی تو تھا کہ وہ زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دے، لیکن کون ہے جس نے اس چھوٹے سے بیج میں ایسا پروسسنگ پلانٹ لگایا کہ اس میں سے کونپل پھوٹ نکلی؟ کون ہے جس نے مٹی کی دبیز تہوں میں اس کونپل کی پرورش کی اور اُسے یہ قوت عطا کی کہ وہ اپنے منحنی جسم کی لچکدار نوک سے زمین کا پیٹ پھاڑ کر نمودار ہو، اور ایک لہلہاتی ہوئی کھیتی میں تبدیل ہو جائے؟ پھر کون ہے جس نے اس پر چاند سورج کی کرنیں بکھیریں؟ اُسے لہراتی ہوئی ہواؤں کا گہوارہ فراہم کیا؟ اُس پر بادلوں کا شامیانہ تان کر اسکو جھلنے سے بچایا، اور اس پر رحمت کا مینہ برسا کر اسکی نشوونما کی رفتار تیز کردی، یہاں تک کہ ایک ایک کھیت میں سینکڑوں خوشے

اور ایک ایک خوشے میں سینکڑوں دانے وجود میں آ گئے؟ قرآن کریم اسی حقیقت کو یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے:

﴿اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ☆ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾

ذرا بتاؤ تو سہی کہ جو کچھ تم زمین کو گاہ کر اس میں ڈال دیتے ہو؟ کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے؟

(سورۂ واقعہ آیت: ۶۳، ۶۴)

لہذا جب آنحضرت ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ کھانا کھانے سے پہلے ,,بسم اللہ،، کہو تو اس کا مقصد اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اس نوالے کا حصول صرف تمہاری قوتِ بازو کا کرشمہ نہیں، بلکہ یہ اُس دینے والے کی دین ہے جس نے اُسے تم تک پہنچانے کے لئے کائنات کی عظیم طاقتوں کو تمہارے لئے رام کر دیا، لہذا اس نوالے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اُس دینے والے کو فراموش نہ کرو، یوں تو اللہ تعالی کی یہ عطا اسکی ہر مخلوق کے لئے عام ہے، کھانا اور پانی جانوروں کو بھی ملتا ہے، لیکن جس انسان کو اللہ تعالی نے عقل و شعور بخشا ہے، اس میں اور بے شعور جانور میں اتنا فرق تو ہونا چاہئے کہ یہ با شعور مخلوق ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے وقت غفلت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنے محسنِ حقیقی کو یاد کر لیا کرے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

یہ دو تو سادہ سی مثالیں تھیں، لیکن زندگی کے جس کسی کام کو لیجئے، غور کرنے سے ہر جگہ صورتِ حال یہی ملے گی، انسانی محنت اور ظاہری اسباب کا عمل بہت چھوٹے سے دائرے تک محدود ہے، اس محدود دائرے کے پیچھے جھانک کر دیکھئے تو دنیا کا ہر چھوٹے

سے چھوٹا واقعہ ایک ایسے نظامِ ربوبیت کے ساتھ بندھا ہوا ہے جس کی حکمتیں لا محدود ہیں، اور جس میں انسان کی محنت کوشش، وسائل اور منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن عام طور سے انسان کی محدود نگاہ ظاہری اسباب کی تنگنائے سے آگے نہیں بڑھتی، اور وہ شب وروز اسی تنگنائے کے خم وپیچ میں الجھا رہتا ہے، انبیاء کرام (علیہم السلام) اسی لئے دنیا میں تشریف لاتے ہیں کہ وہ انسان کو اس تنگ نظری سے نجات دلا کر اسکی نگاہ کو وسعت اور سوچ کو گہرائی عطا کریں۔

آنحضرت ﷺ نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی تعلیم دے کر زندگی کے ہر شعبے میں انسان کا رشتہ اپنے مالک سے جوڑنے کی کوشش فرمائی ہے، کیونکہ جب انسان اپنے ہر کام کو بالآخر اللہ تعالی کی مشیّت و تخلیق کے تابع قرار دیتا ہے، اور بار بار اس حقیقت کا اعتراف کر کے اپنی عاجزی و درماندگی کا اعلان کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کے دل میں یہ شعور جڑ پکڑ لیتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خالق ومالک بن کر نہیں بلکہ مخلوق اور اپنے مالک کا بندہ بن کر آیا ہے۔ یہ احساسِ بندگی اس کے دل میں تواضع، عاجزی، ہمدردی اور غمگساری پیدا کرتا ہے، اور فرعونیت، تکبّر اور رعونت کے رذیل جذبات سے اسکی حفاظت کرتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں جبر واستبداد اور ظلم وستم کے واقعات اسی وقت وجود میں آتے ہیں جب انسان اپنی حقیقت کو فراموش کر کے اپنے خالق سے رشتہ توڑ لیتا ہے، اور اللہ تعالی کی دی ہوئی نعمتوں کو خالص اپنی قوتِ بازو کا کرشمہ قرار دے کر اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، لیکن جو شخص قدم قدم پر اللہ کا نام لے کر یہ اعتراف کر رہا ہو کہ میرا ہر کام میرے مالک وخالق کا مرہونِ منت ہے اُس کے دل پر غرور و تکبّر کی سیاہی کا کوئی دھبّہ نہیں پڑتا، اور وہ دوسری مخلوقِ خدا کے ساتھ بھی کبھی ظلم وتشدد کا روادار نہیں ہو سکتا۔

"بسم اللہ" یا "شروع اللہ کے نام سے" بظاہر مختصر سے لفظ ہیں، لیکن ان کے پیچھے حقائق و معارف کی ایک کائنات پوشیدہ ہے، اور آنحضرت ﷺ نے ہر کام کے شروع میں یہ الفاظ کہلوا کر انسان کو ایسا انسان بننے کی طرف متوجہ کیا ہے جو فرعون و نمرود نہیں، بلکہ اللہ کا بندہ بن کر دنیا میں امن سے رہنا چاہتا ہو، اور اس طرح انسان کے ہر کام کو عبادت اور بندگی میں تبدیل کیا۔

۱۰/ شعبان ۱۴۱۴ھ

۲۳/ جنوری ۱۹۹۴ء

یہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

مشہور ہے کہ چند نابینا افراد کو زندگی میں پہلی بار ایک ہاتھی سے سابقہ پیش آیا، آنکھوں کی بینائی سے تو وہ سب محروم تھے، اس لئے ہر شخص نے ہاتھوں سے ٹٹول کر اُس کا سراپا معلوم کرنا چاہا، چنانچہ کسی کا ہاتھ اُسکی سونڈ پر پڑ گیا، کسی کا اُس کے ہاتھ پر، کسی کا اس کے کان پر، جب لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ تو پہلے شخص نے کہا کہ وہ مڑی ہوئی ربر کی طرح ہوتا ہے، دوسرے نے کہا نہیں، وہ لمبا لمبا ہوتا ہے، تیسرے نے کہا کہ وہ تو ایک بڑے سے پتے کی طرح ہوتا ہے۔ غرض جس شخص نے ہاتھی کے جس حصے کو چھوا تھا اسی کو مکمل ہاتھی سمجھ کر اسکی کیفیت بیان کردی، اور پورے ہاتھی کی حقیقت کسی کے ہاتھ نہ آئی۔

کچھ عرصے سے ہم اسلام کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کر رہے ہیں جیسا ان نابیناؤں نے ہاتھی کے ساتھ کیا تھا، اسلام ایک مکمل دین ہے جس کی ہدایات وتعلیمات کو چھ بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، سیاست اور اخلاق۔ ان چھ شعبوں میں سے ہر ایک سے متعلق تعلیمات دین کا لازمی حصہ ہیں جسے نہ دین سے الگ کیا جا سکتا ہے، اور نہ صرف اسی کو مکمل دین کہا جا سکتا ہے، لیکن کچھ لوگوں نے دین کو صرف عقائد وعبادات کی حد تک محدود کر کے باقی شعبوں کو نظر انداز کر دیا، کسی نے معاملات سے متعلق اس کے احکام کو دیکھ کر یہ کہدیا کہ اسلام تو درحقیقت ایک فلاحی معیشت کا نظام ہے، کسی نے اس کی سیاسی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو اس نے یہ سمجھ لیا کہ دین کا اصل

مقصد سیاست ہے، اور باقی سارے شعبے اس کے تابع ہیں، یا محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی غلط فہمی یہ ہے کہ دین صرف عقائد و عبادات کا نام ہے، اور زندگی کے دوسرے مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس غلط فہمی کو ہوا دینے میں تین چیزوں نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، ایک تو عالم اسلام پر غیر مسلم طاقتوں کا سیاسی تسلط تھا جس نے دین کا عمل دخل دفتروں، بازاروں اور معاشرے کے اجتماعی معاملات سے نکال کر اُسے صرف مسجدوں، خانقاہوں اور بعض جگہ دینی مدرسوں تک محدود کر دیا، اور جب زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلامی تعلیمات کا چلن نہ رہا تو رفتہ رفتہ یہ ذہن بنتا چلا گیا کہ دین صرف نماز روزے کا نام ہے۔ دوسرا سبب وہ سیکولر ذہنیت ہے جس نے سامراج کے زیر اثر تعلیمی اداروں نے پروان چڑھایا، اِس ذہنیت کے نزدیک دین و مذہب صرف انسان کی انفرادی زندگی کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے، اور اُسے معیشت و سیاست اور معاشرت تک وسعت دینے کا مطلب گھڑی کی سوئی کو پیچھے لے جانے کے مرادف ہے۔ تیسرا سبب خود اپنے اپنے طرزِ عمل سے پیدا کیا، اور وہ یہ کہ دین سے وابستہ بہت سے افراد نے جتنی اہمیت عقائد و عبادات کو دی، اس کے مقابلے میں معاملات، معاشرت اور اخلاق کو دسواں حصہ بھی اہمیت نہیں دی۔

بہر حال! ان تینوں اسباب کے مجموعے سے نتیجہ یہی نکلا کہ معاملات، معاشرت اور اخلاق سے متعلق اسلام کی تعلیمات بہت پیچھے چلی گئیں، اور ان سے ناواقفیت اتنی زیادہ ہو گئی کہ گویا وہ دین کا حصہ ہی نہیں رہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقائد اور عبادات دین کا جزوِ اعظم ہیں، ان کی اہمیت کو کسی بھی طرح کم کرنا دین کا حلیہ بگاڑنے کے مرادف ہے، خود آنحضرت ﷺ نے اسلام کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر قرار دی ہے، ان میں سے ایک کا تعلق عقائد سے، اور چار چیزوں کا تعلق عبادات سے ہے، اور جو لوگ عقائد و عبادات سے صرف نظر کر کے صرف

اخلاق، معاشرت اور معاملات ہی کو سارا دین سمجھتے ہیں وہ دین کو محض ایک مادّہ پرستانہ نظام میں تبدیل کر کے اُس کا وہ سارا حُسن چھین لیتے ہیں جو دوسرے مادّہ پرستانہ نظاموں کے مقابلے میں اس کا اصل طرّہ امتیاز ہے، اور جس کے بغیر اخلاق، معاشرت اور معاملات بھی ایک بے روح جسم اور ایک بے بنیاد عمارت کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔

لیکن یہ بھی اپنی جگہ نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ دین کی تعلیمات عقائد و عبادات کی حد تک محدود نہیں ہیں، اور ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف نماز روزہ ادا کر کے پوری نہیں ہو جاتی، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ,,ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں جن میں اعلیٰ ترین شعبہ توحید کی شہادت ہے، اور ادنیٰ ترین شعبہ راستے سے گندگی دور کرنا ہے،،۔ بلکہ معاملات، معاشرت اور اخلاق کا معاملہ اس لحاظ سے زیادہ سنگین ہے کہ ان کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور یہ اصول مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق توبہ سے معاف کر دیتا ہے، لیکن حقوق العباد صرف توبہ اور استغفار سے معاف نہیں ہوتے، ان کی معافی کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو حق دار کو اس کا حق پہنچایا جائے، یا وہ خوش دلی سے معاف دیدے، لہٰذا دین کے یہ شعبے خصوصی اہتمام کے متقاضی ہیں۔

پھر معاملات، معاشرت اور اخلاق کے ان تین شعبوں میں بھی سب سے زیادہ لا پروائی معاشرت کے شعبے میں برتی جا رہی ہے، معاشرتی برائیوں کا ایک سیلاب ہے جس نے ہمیں لپیٹ میں لیا ہوا ہے، اور اچھے خاصے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ، بلکہ ایسے دین دار حضرات بھی جو دین سے اپنی وابستگی کے لئے مشہور سمجھے جاتے ہیں اس پہلو سے اتنے بے خبر ہیں کہ ان معاشرتی خرابیوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔

قبل اس کے کہ میں ان معاشرتی مسائل کی جزئیات سے بحث کروں، آج کی صحبت میں یہ اصولی اشارہ مناسب ہے کہ اسلام کی ساری معاشرتی تعلیمات کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہے کہ:

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ"

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

اسلام کی ساری معاشرتی تعلیمات اسی بنیادی اصول کے گرد گھومتی ہیں کہ ہر مسلمان اپنے ہر ہر قول و فعل میں اس بات کی احتیاط رکھے کہ اس کی کسی نقل و حرکت یا کسی انداز و ادا سے کسی دوسرے کو کسی بھی قسم کی جسمانی، ذہنی، نفسیاتی یا مالی تکلیف نہ پہنچے۔

اوپر جو حدیث لکھی گئی ہے اس میں دو نکتے قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل تو اس حدیث میں ہاتھ اور زبان کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہاتھ اور زبان کے سوا کسی اور ذریعے سے تکلیف پہنچانا جائز ہے، ظاہر ہے کہ اصل مقصد ہر قسم کی تکلیف پہنچانے سے روکنا ہے، لیکن چونکہ زیادہ تر تکلیفیں ہاتھ اور زبان سے پہنچتی ہیں، اس لئے ان کا بطورِ خاص ذکر کر دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ زبان اور ہاتھ سے دوسرے "مسلمان" محفوظ رہیں۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کو تکلیف پہنچانا جائز ہے۔ چونکہ بات ایک اسلامی معاشرے کی ہو رہی ہے جس میں زیادہ تر واسطہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے، اس لئے "مسلمان" کا ذکر بطورِ خاص کر دیا گیا ہے، ورنہ قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات کی روشنی میں یہ اصول تمام فقہاء کے نزدیک مسلّم ہے کہ جو غیر مسلم افراد کسی اسلامی ملک میں امن کے ساتھ قانون کے مطابق رہتے ہوں، بیشتر معاشرتی احکام میں ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو ملک کے مسلمان باشندوں کو حاصل ہیں، لہٰذا جس طرح کسی مسلمان کو کوئی ناروا تکلیف پہنچانا حرام ہے، اسی طرح مسلمان ملک کے کسی غیر مسلم باشندے کو بھی ناحق تکلیف دینا حرام و ناجائز ہے۔

آنحضرت ﷺ کے دل میں دوسروں کو تکلیف سے بچانے کی کس قدر اہمیت تھی؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ آپ ﷺ ایک مرتبہ جُمعہ کے دن خطبہ دے رہے

تھے، اتنے میں آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک صاحب اگلی صفوں تک پہنچنے کے لئے لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ منظر دیکھ کر خطبہ روک دیا، اور اُن صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ,,بیٹھ جاؤ، تم نے لوگوں کو اذیت پہنچائی ہے،،۔

آنحضرت ﷺ نے خود ہی مسجد کی پہلی صف میں نماز پڑھنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، بلکہ یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ پہلی صف میں کتنا اجر وثواب ہے تو وہ گھٹنوں کے بل آنے سے بھی گریز نہ کریں، لیکن یہ ساری فضیلت اسی وقت تک ہے جب تک پہلی صف میں پہنچنے کے لئے کسی دوسرے کو تکلیف دینی نہ پڑے، لیکن اگر اس سے کسی کو تکلیف پہنچنے لگے تو یہ اصول سامنے رکھنا ضروری ہے کہ پہلی صف تک پہنچنا مستحب ہے، اور دوسروں کو تکلیف سے بچانا واجب ہے، لہذا ایک مستحب کی خاطر کسی واجب کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔

مسجدِ حرام میں طواف کرتے ہوئے حجرِ اسود کو بوسہ دینا بہت اجر وثواب رکھتا ہے، اور احادیث میں اسکی نجانے کتنی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، لیکن ساتھ ہی تاکید یہ ہے کہ اس فضیلت کے حصول کی کوشش اسی صورت میں کرنی چاہئے جب اس سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، چنانچہ دھکا پیل اور دھینگا مُشتی کر کے حجرِ اسود تک پہنچنے کی کوشش کرنا نہ صرف یہ کہ ثواب نہیں ہے بلکہ اس سے الٹا گناہ ہونے کا اندیشہ ہے، اگر کسی شخص کو تمام عمر حجرِ اسود کا بوسہ نہ مل سکے تو انشاءاللہ اس سے یہ باز پرس نہیں ہوگی کہ تم نے حجرِ اسود کا بوسہ کیوں نہیں لیا؟ لیکن اگر بوسے لینے کے لئے کسی کمزور شخص کو دھکا دے کر تکلیف پہنچادی تو یہ ایسا گناہ ہے جس کی معافی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک وہ شخص معاف نہ کردے۔

غرض اسلام نے اپنی تعلیمات میں قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایک

انسان دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے، اسلام کی بیشتر معاشرتی تعلیمات اسی محور کے گرد گھومتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ؎

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
یہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

یہ شعر قلم پر آیا تو ذہن میں ایک عجیب واقعے کی یاد تازہ ہو گئی، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جنکی تفسیر معارف القرآن آج ایک عالم کو سیراب کر رہی ہے) رمضان ۱۳۹۶ھ میں سخت بیمار اور صاحبِ فراش تھے، پورا رمضان بیماریوں کے عالم میں گذرا، رمضان کے آخر عشرے میں ایک روز فرمانے لگے: "میرا حال بھی عجیب ہے، لوگ رمضان میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں، اور اس مقدس مہینے کی برکتوں کے پیشِ نظر خواہش مجھے بھی یہ ہوئی کہ موت تو آنی ہی ہے، اسی مقدس مہینے میں آجائے۔ لیکن میں کیا کروں کہ اس کے لئے دُعا میری زبان پر نہ آسکی۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جب بھی میں یہ دُعا کرنا چاہتا ذہن میں یہ خیال آتا کہ اگر رمضان کے مہینے میں میری موت کا واقعہ پیش آیا تو میرے عزیزوں اور دوستوں کو بہت تکلیف ہو گی۔ صدمے کے علاوہ روزے کے عالم میں تجہیز و تکفین اور تدفین کے انتظام میں معمول سے کہیں زیادہ مشقت بڑھ جائیگی، اور اس بات پر دل آمادہ نہیں ہوتا کہ اپنی خواہش کی خاطر اپنے چاہنے والوں کو تکلیف میں ڈالا جائے"، یہ کہہ کر انہوں نے یہ شعر پڑھا ؎

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
یہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

۱۷/ شعبان ۱۴۱۴ھ
۳۰/ جنوری ۱۹۹۴ء

لاؤڈ اسپیکر کا ظالمانہ استعمال

ظلم صرف یہ ہی نہیں ہے کہ کسی کا مال چھین لیا جائے، یا اسے جسمانی تکلیف پہنچانے کے لئے اس پر ہاتھ اٹھایا جائے، بلکہ عربی زبان میں ,,ظلم،، کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ,,کسی بھی چیز کو بے جگہ استعمال کرنا ظلم ہے،، چونکہ کسی چیز کا بے محل استعمال یقیناً کسی نہ کسی کو تکلیف پہنچانے کا موجب ہوتا ہے، اس لئے ہر ایسا استعمال ,,ظلم،، کی تعریف میں داخل ہے، اور اگر اس سے کسی انسان کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ شرعی اعتبار سے گناہِ کبیرہ بھی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس طرح کے بہت سے گناہِ کبیرہ اس طرح رواج پا گئے ہیں کہ اب عام طور سے اُن کے گناہ ہونے کا احساس بھی باقی نہیں رہا۔

,,ایذا رسانی،، کی ان بیشمار صورتوں میں سے ایک انتہائی تکلیف دہ صورت لاؤڈ اسپیکر کا ظالمانہ استعمال ہے۔ ابھی چند روز پہلے ایک انگریزی روزنامے میں ایک صاحب نے شکایت کی ہے کہ بعض شادی ہالوں میں رات تین بجے تک لاؤڈ اسپیکر پر گانے بجانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور آس پاس کے بسنے والے بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں، اور ایک شادی ہال پر کیا موقوف ہے؟ ہر جگہ دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ جب کوئی شخص کہیں لاؤڈ اسپیکر نصب کرتا ہے تو اُسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اسکی آواز کو صرف ضرورت کی حد تک محدود رکھا جائے، اور آس پاس کے اُن ضعیفوں اور بیماروں پر رحم کیا جائے جو یہ آواز سُننا نہیں چاہتے۔

گانے بجانے کا معاملہ تو الگ رہا، کہ اُسکو بلند آواز سے پھیلانے میں دُہری برائی ہے، اگر کوئی خالص دینی اور مذہبی پروگرام ہو تو اُس میں بھی لوگوں کو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے زبردستی شریک کرنا شرعی اعتبار سے ہرگز جائز نہیں ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں سیاسی اور مذہبی پروگرام منعقد کرنے والے حضرات بھی شریعت کے اس اہم حکم کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ سیاسی اور مذہبی جلسوں کے لاؤڈ اسپیکر بھی دور دور تک مار کرتے ہیں اور اُن کی موجودگی میں کوئی شخص اپنے گھر میں نہ آرام سے سو سکتا ہے، نہ یکسوئی کے ساتھ اپنا کوئی کام کر سکتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان کی آواز دور تک پہنچانا تو برحق ہے، لیکن مسجدوں میں جو وعظ اور تقریریں یا ذکر و تلاوت لاؤڈ اسپیکر پر ہوتی ہیں، اُن کی آواز دور دور تک پہنچانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مسجد میں بہت تھوڑے سے لوگ وعظ یا درس سُننے کے لئے بیٹھے ہیں جنکو آواز پہنچانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے، یا صرف اندرونی ہارن سے بآسانی کام چل سکتا ہے، لیکن بیرونی لاؤڈ اسپیکر پوری قوت سے کُھلا ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں یہ آواز محلّے کے گھر گھر میں اِس طرح پہنچتی ہے کہ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ لاہور گیا، جس مکان میں میرا قیام تھا، اُس کے تین طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین مسجدیں تھیں، جُمعہ کا دن تھا، فجر کی نماز کے فوراً بعد سے تینوں مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر پوری قوت سے کُھل گئے، اور پہلے درس شروع ہوا، پھر بچّوں نے تلاوت شروع کر دی، پھر نظمیں اور نعتیں پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ فجر کے وقت سے جمعہ تک یہ ,,مذہبی پروگرام،، اس طرح بے تکان جاری رہے کہ گھر میں کسی کو کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس گھر میں اُس وقت کوئی بیمار نہیں تھا، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی شخص بیمار ہو تو اُس کو سکون کے ساتھ لِٹانے کا اس ماحول میں کوئی راستہ نہیں۔

بعض مسجدوں کے بارے میں یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ وہاں خالی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر ٹیپ چلادیا جاتا ہے، مسجد میں سُننے والا کوئی نہیں ہوتا، لیکن پورے محلے کو یہ ٹیپ زبردستی سُننا پڑتا ہے۔

دین کی صحیح فہم رکھنے والے اہل علم خواہ کسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں، کبھی یہ کام نہیں کرسکتے، لیکن ایسا اُن مسجدوں میں ہوتا ہے جہاں کا انتظام علم دین سے ناواقف حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ بسااوقات یہ حضرات پوری نیک نیتی سے یہ کام کرتے ہیں، وہ اسے دین کی تبلیغ کا ایک ذریعہ سمجھتے اور اسے دین کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے میں یہ اصول بھی بہت غلط مشہور ہوگیا ہے کہ نیت کی اچھائی سے کوئی غلط کام بھی جائز اور صحیح ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی کام کے درست ہونے کے لئے صرف نیک نیتی ہی کافی نہیں، اس کا طریقہ بھی درست ہونا ضروری ہے۔ اور لاؤڈ اسپیکر کا ایسا ظالمانہ استعمال نہ صرف یہ کہ دعوت و تبلیغ کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے، بلکہ اس کے اُلٹے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

جن حضرات کو اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہو، اُن کی خدمت میں دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ چند نکات ذیل میں پیش کرتا ہوں:

(۱) مشہور محدث حضرت عمر بن شبہؒ نے مدینہ منورہ کی تاریخ پر چار جلدوں میں بڑی مفصّل کتاب لکھی ہے جس کا حوالہ بڑے بڑے علماء و محدثین ہمیشہ دیتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک واقعہ اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک واعظ صاحب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے بالکل سامنے بہت بلند آواز سے وعظ کہا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ وہ زمانہ لاؤڈ اسپیکر کا نہیں تھا، لیکن اُن کی آواز بہت بلند تھی، اور اس سے حضرت عائشہؓ کی یکسوئی میں فرق آتا تھا، یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا، اس لئے حضرت عائشہؓ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ یہ صاحب بلند آواز سے میرے گھر کے سامنے وعظ کہتے رہتے ہیں، جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے، اور مجھے

کسی اور کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ حضرت عمرؓ نے اُن صاحب کو پیغام بھیج کر انہیں وہاں وعظ کہنے سے منع کیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد واعظ صاحب نے دوبارہ وہی سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے خود جاکر اُن صاحب کو پکڑا، اور اُن پر تعزیری سزا جاری کی۔ (اخبار المدینہ لعمر بن شبہ، ج:۱، ص:۱۵)

(۲) بات صرف یہ نہیں تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا اپنی تکلیف کا ازالہ کرنا چاہتی تھیں، بلکہ دراصل وہ اسلامی معاشرت کے اس اصول کو واضح اور نافذ کرنا چاہتی تھیں کہ کسی کو کسی سے کوئی تکلیف نہ پہنچے، نیز یہ بتانا چاہتی تھیں کہ دین کی دعوت و تبلیغ کا پُر وقار طریقہ کیا ہے؟ چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا نے مدینہ منورہ کے ایک واعظ کو وعظ و تبلیغ کے آداب تفصیل کے ساتھ بتائے، اور ان آداب میں یہ بھی فرمایا کہ:

"اپنی آواز کو انہی لوگوں کی حد تک محدود رکھو جو تمہاری مجلس میں بیٹھے ہیں، اور انہیں بھی اسی وقت تک دین کی باتیں سناؤ جب تک ان کے چہرے تمہاری طرف متوجّہ ہوں، جب وہ چہرے پھیر لیں، تو تم بھی رک جاؤ...... اور ایسا کبھی نہ ہونا چاہئے کہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں، اور تم ان کی بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دو، بلکہ ایسے موقعہ پر خاموش رہو، پھر جب وہ تم سے فرمائش کریں تو انہیں دین کی بات سناؤ" (مجمع الزوائد، ج:۱، ص:۱۹۱)

(۳) حضرت عطاء بن ابی رباح ؒ بڑے اونچے درجے کے تابعین میں سے ہیں، علمِ تفسیر و حدیث میں ان کا مقام مسلّم ہے، ان کا مقولہ ہے کہ

"عالم کو چاہئے کہ اسکی آواز اس کی اپنی مجلس سے آگے نہ بڑھے"

(ادب الاملاء والاستملاء للسمعانی، ص:۵)

(۴) یہ سارے آداب در حقیقت خود حضور سرور کونین ﷺ نے اپنے قول و فعل سے تعلیم فرمائے ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس سے گذرے، وہ تہجد کی نماز میں بلند آواز سے تلاوت کررہے تھے، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ وہ بلند آواز سے کیوں تلاوت کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ,, میں سوتے کو جگاتا ہوں، اور شیطان کو بھگاتا ہوں،، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ,, اپنی آواز کو تھوڑا پست کردو،، (مشکوۃ، ج:۱، ص:۱۰۷)

اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جب تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اپنے بستر سے آہستگی کے ساتھ اٹھتے تھے (تاکہ سونے والوں کی نیند خراب نہ ہو)۔

(۵) انہی احادیث و آثار کی روشنی میں تمام فقہاء امتؒ اس بات پر متفق ہیں کہ تہجد کی نماز میں اتنی بلند آواز سے تلاوت کرنا جس سے کسی کی نیند خراب ہو، ہرگز جائز نہیں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر کی چھت پر بلند آواز سے تلاوت کرے جبکہ لوگ سو رہے ہوں تو تلاوت کرنے والا گناہ گار ہے۔

(خلاصۃ الفتاوی، ج:۱، ص:۱۰۳، وشامی، ج:۱، ص:۴۰۳ و ۴۴۴)

ایک مرتبہ ایک صاحب نے یہ سوال ایک استفتاء کی صورت میں مرتب کیا تھا کہ بعض مساجد میں تراویح کی قرأت لاؤڈ اسپیکر پر اتنی بلند آواز سے کی جاتی ہے کہ اس سے محلے کی خواتین کے لئے گھروں میں نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے، نیز جن مریض اور کمزور لوگوں کو علاجاً جلدی سونا ضروری ہو وہ سو نہیں سکتے، اس کے علاوہ باہر کے لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت ادب سے سننے پر قادر نہیں ہوتے۔ اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلاوت کے دوران کوئی سجدے کی آیت آجاتی ہے، سننے والوں پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے، اور یا تو ان کو پتہ ہی نہیں چلتا، یا وہ وضو سے نہیں ہوتے، اس لئے سجدہ نہیں کرسکتے، اور

بعد میں بھول ہو جاتی ہے۔ کیا ان حالات میں تراویح کے دوران بیرونی لاؤڈ اسپیکر زور سے کھولنا شرعاً جائز ہے؟

یہ سوال مختلف علماء کے پاس بھیجا گیا، اور سب نے متفقہ جواب یہی دیا کہ ان حالات میں تراویح کی تلاوت میں بیرونی لاؤڈ اسپیکر بلا ضرورت زور سے کھولنا شرعاً جائز نہیں ہے، یہ فتویٰ ماہنامہ ،،البلاغ،، کی محرم ۱۴۰۷ھ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے، اس پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء متفق ہیں۔

اب رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہونے والا ہے، یہ مہینہ ہم سے شرعی احکام کی سختی کے ساتھ پابندی کا مطالبہ کرتا ہے، یہ عبادتوں کا مہینہ ہے، اور اس میں نماز، تلاوت اور ذکر جتنا بھی ہو سکے، باعثِ فضیلت ہے۔ لیکن ہمیں چاہئے کہ یہ ساری عبادتیں اس طرح انجام دیں کہ اُن سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اور ناجائز طریقوں کی بدولت ان عبادتوں کا ثواب ضائع نہ ہو۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال صرف بوقت ضرورت اور بقدرِ ضرورت کیا جائے، اس سے آگے نہیں۔

مذکورہ بالا گذارشات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شریعت نے دوسروں کو تکلیف سے بچانے کا کتنا اہتمام کیا ہے؟ جب قرآن کریم کی تلاوت اور وعظ و نصیحت جیسے مقدس کاموں کے بارے میں بھی شریعت کی ہدایت یہ ہے کہ ان کی آواز ضرورت کے مقامات سے آگے نہیں بڑھنی چاہئے، تو گانے بجانے اور دوسری لغویات کے بارے میں خود اندازہ کر لیجئے کہ انکو لاؤڈ اسپیکر پر انجام دینے کا کس قدر دہرا وبال ہے؟

۲۴/شعبان ۱۴۱۴ھ
۶/فروری ۱۹۹۴ء

رمضان کیوں آیا ہے؟

اسلام سے باہر نظر دوڑا کر دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ دنیا بھر کے فکری نظام کلیۃً انسان کے دماغ کو مخاطب کرتے ہیں، اور مذہب و تصوف خالصۃً اس کے دل کو۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کی الگ الگ بادشاہت ہے جس پر وہ بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کرتے ہیں، اور یہ دو بادشاہ نہ صرف یہ کہ ایک ,,اقلیم،، میں نہیں سماتے، بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ لیکن اسلام بیک وقت انسان کے دل اور دماغ دونوں سے اس طرح خطاب کرتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی رسّہ کشی پیدا نہیں ہوتی جو انہیں ایک دوسرے کے مدِّ مقابل کھڑا کردے۔ اس کے بجائے ابتداء یہ دونوں اپنی اپنی حدود متعین کر کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور بالآخر ایک دوسرے میں گھل مل کر اس طرح شیر و شکر ہو جاتے ہیں جیسے دو دریاؤں کا سنگھم ایک حد پر جا کر دونوں کو یک جان کر دیتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں دل کو ,,عشق و محبت،، کے ساتھ ,,سوچنا سمجھنا،، بھی آجاتا ہے، اور دماغ میں ,,سوچنے سمجھنے،، کے ساتھ ,,عشق و محبت،، کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس لطیف حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جسکی لطافت بیان سے زیادہ ادراک میں ہے اگر انسان قرآن کریم کی اُن آیات پر غور کرے جن میں ,,سوچنے سمجھنے،، کو دماغ کے بجائے ,,قلوب،، کی صفت قرار دیا گیا ہے تو اس کلامِ الٰہی کے اعجاز کے آگے فصاحت و بلاغت کی پوری کائنات سجدہ ریز نظر آتی ہے، اللہ اکبر!

مختصر یہ کہ اسلام کی تعلیمات عقل اور عشق کا ایک ایسا حسین آمیزہ ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک عنصر کو بھی ختم کر دیا جائے تو اس کا سارا حسن ختم ہو جاتا ہے۔ اگر عقائد وعبادات کا نظام عقل سے بالکلیہ آزاد ہو جائے تو کوئی توہم پرست یا دیو مالائی مذہب وجود میں آجاتا ہے، اور اگر عقل کو وحی پر مبنی عقائد و عبادات سے آزاد کر دیا جائے تو وہ کسی ایسے خشک سیکولر نظریئے کو جنم دیکر رُک جاتی ہے جو مادّے کے اس پار دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں محرومی ہے، کہیں جسم کے جائز تقاضوں سے، کہیں روح کے حقیقی مطالبات سے۔

جب سے سیکولرزم کے مقابلے کی ضرورت کے تحت اسلام کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تعلیمات پر ہمارے عہد کے مفکرین اور اہل قلم نے زیادہ زور دینا شروع کیا ہے، اس وقت سے بعض حضرات نے شعوری یا غیر شعوری طور پر عقائد و عبادات کو پس منظر میں ڈال کر انہیں ثانوی حیثیت دیدی ہے، اور انہیں وہ اہمیت دینا چھوڑ دیا ہے جو فی الواقعہ انہیں حاصل ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ انسان ایک ,,معاشی جانور،،(Economic animal) ہو کر رہ گیا ہے، اور اس کی ساری دوڑ دھوپ اس جسم کو پالنے پوسنے کی حد تک محدود ہے جو ایک نہ ایک دن مٹی میں مل جانے والا ہے۔ اسے روحانی ترقی کے ان مدارج کی کوئی فکر نہیں جو درحقیقت انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، اور جنکی بدولت وہ مٹی میں ملنے کے باوجود بھی زندۂ جاوید رہتا ہے۔

جو لوگ مادی منافع اور نفسانی لذتوں ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں، ذرا ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے، وہ راحت و آرام کے سارے اسباب و وسائل اپنے پاس رکھنے کے باوجود ,,سکونِ قلب،، کی دولت سے کتنے محروم ہیں؟ اس لئے کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش میں جو دنیا بنائی ہے، وہ چاہے دنیا کے سارے خزانے لاکر ان کے قدموں پر ڈھیر کر سکتی ہو، لیکن قلب کو سکون اور روح کو قرار بخشنا اس کے بس کی بات نہیں، یہ خدا

نا آشنا زندگی کا لازمی خاصہ ہے، کہ اس کے شیدائی ایک انجانی سی بے قراری کا شکار رہتے ہیں۔ اس بے قراری کا ایک کرب انگیز پہلو یہ ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بے قرار کیوں ہیں؟ وہ ہمہ وقت اپنے دل میں ایک نا معلوم اضطراب اور پر اسرار کسک محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ اضطراب کیوں ہے؟ کس لئے ہے؟ وہ نہیں جانتے۔

انسان اس کائنات کا خالق و مالک نہیں، وہ کسی کی مخلوق ہے۔ اس کا مقصد زندگی ہی یہ ہے کہ وہ کسی کی بندگی کرے۔ اس لئے اس کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ کسی لافانی ہستی کے آگے سرنگوں ہو، اس کی عظمتوں پر اپنے عجز و نیاز کی پونجی نچھاور کرے، مصائب میں اس کے نام کا سہارا لے، اسے مدد کے لئے پکارے، اور زندگی کے مشکل ترین لمحات میں اسکی توفیق سے رہنمائی حاصل کرے۔ آج کی مادہ پرست زندگی اسے خواہ دنیا کی ساری نعمتیں عطا کر سکتی ہو، لیکن اس کی اس فطری خواہش کی تسکین نہیں کر سکتی۔ انسان کی یہ فطرت بعض اوقات نفسانی خواہشات کے انبار میں دب تو جاتی ہے، لیکن مٹتی نہیں، اور یہی وہ چھپی ہوئی فطری خواہش ہے جو اسے کیف و نشاط کے سارے وسائل مل جانے کے باوجود آرام نہیں لینے دیتی، اور بعض اوقات اسکی زندگی کو اجیرن بنا کر چھوڑتی ہے ؎

یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جارہا ہوں میں

اسلام کی تعلیمات میں ,,عبادات،، کا شعبہ اسی مقصد کے لئے رکھا گیا ہے کہ اگر ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کر لیا جائے تو عبادات کے یہ طریقے انسان کی روح کو حقیقی غذا فراہم کر کے اللہ تعالی کے ساتھ اس کے رشتے کو مضبوط اور مستحکم بناتے ہیں۔ اور جسم و روح کے تقاضوں میں توازن پیدا کر کے انسان کو ایک ایسے نقطہ اعتدال (Equilibrium) تک پہنچاتے ہیں جو در حقیقت سکون و اطمینان کا دوسرا نام ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿اَلا بِذِکْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾

یاد رکھو! اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

رمضان کا مقدس مہینہ ہر سال اس لئے آتا ہے کہ سال کے گیارہ مہینے انسان اپنی مادّی مصروفیات میں اتنا منہمک رہتا ہے کہ وہی مصروفیات اسکی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں، اور اس کے دل پر روحانی اعمال سے غفلت کے پردے پڑنے لگتے ہیں۔ عام دنوں کا حال یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے کی مصروفیات میں خالص عبادتوں کا حصہ عموماً بہت کم ہوتا ہے، اور اس طرح انسان اپنے روحانی سفر میں جسمانی سفر کی بہ نسبت پیچھے رہ جاتا ہے۔ رمضان کا مہینہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس مبارک مہینے میں وہ جسمانی غذا کی مقدار کم کر کے روحانی غذا میں اضافہ کر دے اور اپنے جسمانی سفر کی رفتار ذرا دھیمی کر کے روحانی سفر کی رفتار بڑھا دے، اور ایک مرتبہ پھر دونوں کا توازن درست کر کے اس نقطہ اعتدال پر آجائے جو اس زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور اگر ذرا غور سے دیکھیں تو اسی نقطہ اعتدال پر پہنچنے کی مسرت ہے جس کا جشن "عید الفطر" کی صورت میں مقرر کیا گیا ہے۔

لہذا رمضان المبارک صرف روزے اور تراویح ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا صحیح فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس مہینے میں نفلی عبادات کی طرف بھی خصوصی توجہ دے، اور کسی کی حق تلفی کئے بغیر اگر اپنے اوقات کو مادی مصروفیات سے فارغ کر سکتا ہے، تو انہیں فارغ کر کے زیادہ سے زیادہ نوافل، تلاوت اور ذکر و تسبیح میں صرف کرے۔

"کسی کی حق تلفی کئے بغیر" میں نے اس لئے کہا کہ اگر کوئی شخص کہیں ملازم ہے تو ڈیوٹی کے اوقات میں اپنے فرائض منصبی چھوڑ کر نفلی عبادات میں مشغول ہونا شرعاً جائز نہیں۔ البتہ اگر اس کے پاس اپنے فرائض منصبی سے متعلق کوئی کام نہیں ہے اور وہ خالی بیٹھا ہوا ہے تو بات دوسری ہے۔

لیکن کسی کی حق تلفی کئے بغیر بھی رمضان میں اپنی مادی مصروفیات ہر شخص کچھ نہ

کچھ ضرور کم کر سکتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایسے مشاغل سے فارغ کر سکتا ہے جو یا تو غیر ضروری ہیں، یا انہیں مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جو وقت ملے اسے نفلی عبادتوں، ذکر اور دعا میں صرف کرنا چاہئے۔

اس کے علاوہ جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ رمضان کے دن میں انسان جب روزے کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، یعنی اللہ تعالی کی بندگی کے تقاضے سے وہ چیزیں ترک کر دیتا ہے جو عام حالات میں اس کے لئے حلال تھیں۔ اب یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہو گی کہ انسان روزے کے تقاضے سے حلال کام تو ترک کر دے، لیکن وہ کام بدستور کرتا رہے جو عام حالات میں بھی حرام ہیں۔ لہذا اگر کھانا پینا چھوڑ دیا، مگر جھوٹ، غیبت، دلآزاری، رشوت ستانی وغیرہ جو ہر حالت میں حرام کام تھے، وہ نہ چھوڑے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا روزہ انسان کی روحانی ترقی میں کتنا مددگار ہو سکتا ہے؟

لہذا رمضان المبارک میں سب سے زیادہ اہتمام اس بات کا ہونا چاہئے کہ آنکھ، زبان، کان اور جسم کے تمام اعضاء ہر طرح کے گناہوں سے محفوظ رہیں، اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنایا جائے کہ کوئی قدم اللہ تعالی کی نافرمانی میں نہ اٹھے۔

رمضان کو آنحضرت ﷺ نے ,,ایک دوسرے کی غمخواری کا مہینہ،، قرار دیا ہے۔ اس مہینے میں آپ ﷺ صدقہ و خیرات بھی بہت کثرت سے کیا کرتے تھے، اس لئے رمضان میں ہمیں بھی صدقہ و خیرات، دوسروں کی ہمدردی اور ایک دوسرے کی معاونت کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے۔

یہ صلح و صفائی کا مہینہ ہے، لہذا اس میں جھگڑوں سے اجتناب کا بھی خاص حکم دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ,,اگر کوئی شخص تم سے لڑائی کرنا چاہے تو اس سے کہہ دو کہ میں روزے سے ہوں،،۔

خلاصہ یہ ہے کہ رمضان صرف سحری اور افطاری کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک تربیتی کورس ہے جس سے ہر سال مسلمانوں کو گذارا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق اپنے خالق ومالک کے ساتھ مضبوط ہو، اسے ہر معاملے میں اللہ تعالی سے رجوع کرنے کی عادت پڑے، وہ ریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے اپنے اخلاق رذیلہ کو کچلے، اور اعلی اوصاف واخلاق اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کے اندر نیکیوں کا شوق اور گناہوں سے پرہیز کا جذبہ بیدار ہو، اس کے دل میں خوف خدا اور فکر آخرت کی شمع روشن ہو جو اسے رات کی تاریکی اور جنگل کے ویرانے میں بھی غلط کاریوں سے محفوظ رکھ سکے۔ اسی کا نام "تقوی" ہے، اور قرآن کریم نے اسی کو روزوں کا اصل مقصد قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم میں تقوی پیدا ہو۔

جو شخص "تقوی" کے اس تربیتی کورس سے ٹھیک ٹھیک گذر جائے، اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہ خوشخبری عطا فرمائی ہے کہ "جس شخص کا رمضان سلامتی سے گذر جائے اس کا پورا سال سلامتی سے گذرے گا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان ہمیں سال بھر کی سلامتی سے ہمکنار کرنے کے لئے آیا ہے، بشرطیکہ ہم سلامتی چاہتے ہوں، اور یہ سلامتی حاصل کرنے کے لئے اس ماہِ مقدس کا استقبال اور اکرام واعزاز کرسکیں۔ اللہ تعالی ہمیں اس کی توفیق دے۔ آمین۔

۲/ رمضان ۱۴۱۴ھ
۱۳/ فروری ۱۹۹۴ء

چوری اور سینہ زوری

پچھلے دنوں ایک محفل میں یہ سوال زیرِ گفتگو تھا کہ مجرموں کو سخت اور عبرتناک سزائیں دینا انسانی عظمت کے کس حد تک مطابق ہے؟ بعض مغربی ملکوں میں سزاء موت (Capital Punishment) مکمل طور پر ختم کردی گئی ہے۔ لہذا بعض حضرات کا خیال یہ تھا کہ یہی طریقہ زیادہ مناسب ہے۔ اس پر مجھے چار سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک معتبر اخبار میں باوثوق طریقے پر نہ پڑھا ہوتا تو شاید اس پر یقین کرنا مشکل ہوتا۔

یہ اکتوبر ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ میں اُن دنوں امریکہ اور کینڈا کے دورے پر گیا ہوا تھا۔ اور ٹورنٹو سے نیویارک جارہا تھا، جہاز میں کینڈا کا مشہور ہفت روزہ اخبار "National Enquirer" ہاتھ میں آگیا جسکی پیشانی پر یہ جملہ درج ہوتا ہے کہ "یہ شمالی امریکہ کا سب سے زیادہ چھپنے والا ہفت روزہ ہے"۔ یہ اس اخبار کی ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت تھی، اور اس کے صفحہ نمبر ۵۰ پر ایک خبر شہ سرخیوں اور تصویروں کے ساتھ شائع کی گئی تھی، خبر کا خلاصہ یہ تھا کہ کینڈا کے علاقے برٹش کولمبیا میں ایک وحشتناک مجرم کلفرڈ اولسن (Clifford Olson) کو قتل، زنابالجبر اور غیر فطری عمل کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ یہ شخص نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو روزگار دلانے کے بہانے اپنے ساتھ لے جاتا، ان کو نشہ آور گولیاں کھلاتا، ان کے ساتھ زبردستی جنسی عمل کرتا،

اور بالآخر انہیں قتل کر کے ان کی لاشیں دور دراز کے مقامات پر دفن کر دیتا تھا۔ گرفتاری کے بعد اس شخص نے یہ اعتراف کیا کہ اس نے گیارہ نو عمر بچوں اور بچیوں کے ساتھ زیادتی کر کے انہیں قتل کیا ہے، اور انکی لاشیں مختلف مقامات پر چھپادی ہیں۔ اور قتل بھی اس بربریت کے ساتھ کہ جب ایک بچے کی لاش بر آمد ہوئی تو اس کے سر میں لوہے کی ایک میخ ٹھکی ہوئی پائی گئی۔

جب یہ اقبالی مجرم گرفتار ہوا تو پولیس نے اُس سے مطالبہ کیا کہ جن گیارہ بچوں کو اس نے بربریت کا نشانہ بنایا ہے، ان کی لاشوں کی نشان دہی کرے، اس ستم ظریف نے اس مطالبے کا جو جواب دیا، شاید اُس سے پہلے وہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا ہو۔ اس نے کہا کہ ,,مجھے وہ سارے مقامات یاد ہیں جہاں میں نے ان بچوں کی لاشیں دفن کی ہیں، لیکن میں ان مقامات کا پتہ مفت نہیں بتا سکتا۔ میری شرط یہ ہے کہ آپ مجھے فی لاش دس ہزار ڈالر معاوضہ ادا کریں،،۔

ایک مجرم کی طرف سے یہ ریکارڈ مطالبہ تو جیسا کچھ بھی تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ پولیس نے بھی اُس کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اخبار کا کہنا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں تھا جس کی بنا پر اسے لاشیں بر آمد کرنے پر مجبور کیا جا سکے، اس لئے پولیس کو اس کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے، البتہ پولیس نے ملزم کی خوشامد در آمد کے بعد زیادہ سے زیادہ جو ,,رعایت،، اس مجرم سے حاصل کی وہ یہ تھی کہ ,,اگر دس لاشوں کی بر آمدگی کا معاوضہ یعنی ایک لاکھ ڈالر پولیس مجھے ادا کرے تو گیارھویں بچے کی لاش میں رعایۃً مفت بر آمد کر دونگا،،۔

پولیس نے اس ,,رعایت،، سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اولسن کو ایک لاکھ ڈالر معاوضہ ادا کیا، اس کے بعد اس نے کینڈا کے مختلف شہروں سے گیارہ بچوں کی لاشیں پولیس کے حوالے کیں۔ ان گیارہ بچوں کی تصویریں بھی اخبار نے شائع کی تھیں، اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بچے بارہ سے اٹھارہ سال تک کی عمر کے ہونگے۔

اس ,, تفتیش،، ,,اعتراف،، اور ایک لاکھ ڈالر کے نفع بخش سودے کے بعد مجرم پر مقدمہ چلایا گیا۔ چونکہ کینڈا میں سزائے موت ,,وحشیانہ،، قرار دیکر ختم کر دی گئی ہے، اس لئے عدالت کفرڈ اولسن کو جو زیادہ سے زیادہ سزا دے سکی وہ عمر قید کی سزا تھی۔ البتہ عدالت نے جرم کی سنگینی کا اعتراف کرتے ہوے یہ ,,سفارش،، ضرور کر دی کہ اس مجرم کو کبھی پیرول پر رہا نہیں کیا جا سکے گا۔ اخبار نے ,,سفارش،، کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ شاید عدالت کو ایسا ,, حکم،، دینے کا اختیار نہیں تھا، وہ صرف ,,سفارش،، ہی کر سکتی تھی۔

ان گیارہ بچوں کے ستم رسیدہ ماں باپ کو جب یہ پتہ چلا کہ جس درندے نے ان کے کمسن بچوں کی عزت لوٹ کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا، اسے ایک لاکھ ڈالر کا معاوضہ ادا کیا گیا ہے، تو قدرتی طور پر ان میں اضطراب اور اشتعال کی لہر دوڑ گئی، اور انہوں نے اولسن پر ایک ہرجانے کا مقدمہ دائر کیا، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ کینڈا کے ٹیکس دھندگان کے جو ایک لاکھ ڈالر اس درندہ صفت مجرم کی جیب میں گئے ہیں، کم از کم وہ اس سے واپس لے کر مرنے والے بچوں کے ورثاء کو دلوائے جائیں۔ لیکن ان کو اس مقدمے میں شکست ہو گئی، اپیل کورٹ نے بھی ان کا مقدمہ خارج کر دیا، اور سپریم کورٹ نے یہ کیس سننے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف مجرم اولسن نے ہائی کورٹ میں ایک درخواست دی ہے جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اسے جیل میں بہتر رہائشی سہولیات (Better prison accom-modation) فراہم کی جائیں، ہائی کورٹ نے یہ درخواست سماعت کے لئے منظور کر لی۔

جن لوگوں کے بچے اس بربریت کا نشانہ بنے، انہوں نے اس صورتِ حال کے نتیجے میں ایک انجمن بنائی جس کا نام ,,نشانہ ہائے تشدد،، (Victims of Violence)

ہے، اس انجمن نے پارلیمنٹ کے ارکان سے مطالبہ کیا ہے کہ کینڈا میں سزائے موت کا قانون واپس لایا جائے۔ اس انجمن کے ایک ترجمان نے اخبار کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ:

,, ہم نے ہار نہیں مانی ہے۔ ہم نے ایک گروپ بنایا ہے، اور ہم نے کینڈا کی پارلیمنٹ کے ارکان سے مطالبہ کیا ہے کہ کینڈا میں سزائے موت کو واپس لایا جائے۔ اولسن جیسے جنسی درندوں کو سیدھے جہنم میں بھیجنا چاہئے جہاں کے وہ واقعۃً مستحق ہیں۔,,

اس واقعہ پر کسی لمبے چوڑے تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب کبھی انسان مسئلے کے صرف کسی ایک پہلو پر زور دیکر یک رخے پن کا مظاہرہ کریگا، اس قسم کے ستم ظریفانہ لطیفے وجود میں آتے رہیں گے۔ انسان کی عظمت (Dignity) اپنی جگہ، لیکن جس شخص نے اپنی انسانی عظمت کا لبادہ خود ہی نوچ کر پھینک دیا ہو، اس کے گلے سڑے وجود کو کب تک معاشرے میں شیطنت کا کوڑھ پھیلانے کی اجازت دی جائیگی؟ اور سینکڑوں حقیقی انسانی عظمتوں کو کب تک اس کی متعفن خواہشات کی بھینٹ چڑھایا جائے گا؟

رحمدلی بہت اچھی صفت ہے، لیکن ہر صفت کے اظہار کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے، اور اگر اس صفت کو بے موقع استعمال کیا جائے تو اسکا نتیجہ کسی نہ کسی پر ظلم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ سانپوں اور بچھوؤں پر رحم کرنے کا مطلب ان معصوم جانوں پر ظلم ہے جنہیں وہ ڈس چکے ہوں، یا ڈسنے والے ہوں، اور ان موذی افراد کے ساتھ سختی کا مطلب ان بے گناہوں کی انسانی عظمت کا تحفظ ہے جو ان کے ظلم کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کلفرڈ اولسن کا مذکورہ بالا واقعہ پڑھئے، اور قرآن کریم کے اس بلیغ ارشاد پر غور فرمائیے کہ:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الأَلْبَابِ﴾

اور اے عقل والو! تمہارے لئے قصاص (کے قانون) میں

زندگی کا سامان ہے۔

یہ درست ہے کہ تنہا سزائیں معاشرے کو جرم سے پاک کرنے کے لئے کافی نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ جرائم کے انسداد کا پہلا قدم تعلیم و تربیت اور خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی آبیاری ہے، لیکن یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ بہت سے افراد کے لئے تعلیم و تربیت سے لیکر وعظ و نصیحت تک کوئی چیز کارگر نہیں ہوتی۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے عربی زبان کے مشہور شاعر متنبّی نے کہا تھا کہ ؎

والسيف أبلغ وعّاظ على أمم

بہت سے لوگوں کے لئے سب سے فصیح و بلیغ واعظ تلوار ہوتی ہے۔

۹/ رمضان ۱۴۱۴ھ

۲۰/ فروری ۱۹۹۴ء

نو مسلموں کے مسائل

جو لوگ اپنا آبائی دین چھوڑ کر دل سے اسلام قبول کرتے ہیں، وہ اس لحاظ سے انتہائی قابلِ قدر ہیں کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے سابقہ تعلقات کی قربانی پیش کرتے ہیں۔ بچپن سے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تصورات کو یکلخت چھوڑ بیٹھنا آسان کام نہیں ہوتا، اچھے اچھے حوصلہ مند لوگوں کے لئے یہ جرأت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کو اسلام لانے کے صلے میں جسمانی اور مالی اذیتوں کا شکار بننا پڑتا ہے، لہٰذا ایسے لوگ امتِ مسلمہ کی طرف سے خصوصی توجہّ کے خصوصی مستحق ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ ایسے حضرات مسلمانوں کی برادری میں پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کریں، بلکہ انہیں ایسا محبت آمیز اور ایسا پر خلوص استقبال میسّر آئے کہ وہ اسی ماحول کو اپنا حقیقی ماحول محسوس کریں۔

لیکن افسوس ہے کہ ہم ابھی تک اپنے نو مسلم بھائیوں کو ایسا دلکش ماحول مہیا نہیں کر سکے۔ اس کی ایک وجہ بیشک یہ بھی ہے کہ دھوکہ بازی اور فریب کاری کا ایسا بازار گرم ہے کہ سچ اور جھوٹ کا امتیاز کرنا مشکل ہے۔ عام مسلمانوں میں اب بھی اپنے نو مسلم بھائیوں کے لئے بڑی والہانہ ہمدردی پائی جاتی ہے جس کے مظاہرے بکثرت نظر آتے رہتے ہیں لیکن بہت سے لوگ "نو مسلموں" کا روپ اسلئے دھارنے لگے ہیں کہ اس کے ذریعے سادہ لوح مسلمانوں سے مالی فوائد حاصل کر سکیں۔ اس قسم کے واقعات کی کثرت نے لوگوں کو نہ صرف محتاط بنا دیا، بلکہ فریب کاری کے خوف سے صحیح اور واقعی نو

مسلموں کے ساتھ بھی بعض اوقات وہ رویہّ اختیار نہیں کیا جاسکا جسکے وہ مستحق تھے۔

اس صورتِ حال کے نتیجے میں بعض ایسے نو مسلم حضرات جو واقعۃً اسلام کے محاسن سے متاثر ہو کر اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہوئے ہیں، کس قسم کے مسائل سے دوچار ہو جاتے ہیں؟ اور ان کے دل میں کس قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں؟ اس کا اندازہ ایک نو مسلم بھائی کے خط سے ہو گا جو مجھے حال ہی میں موصول ہوا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ہم سب کی نظر سے گذرے، اس لئے یہاں میں اسے نقل کر رہا ہوں:

,,بحیثیت نو مسلم آپ کی خدمت میں پہلی بار خط لکھنے کی ہمت کی ہے۔ محترم! میں ایک عیسائی گھرانے سے تعلق رکھنے والا شادی شدہ نوجوان ہوں۔ میری بیوی اور بچے مسلمان ہیں۔ میں نے مدرسہ عربیہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ میری والدہ اور چھوٹا بھائی ابھی تک اپنے عیسائی مذہب ہی پر ہیں۔ میں مسلمان کیوں ہوا؟ اور کس بات نے مجھے متاثر کیا؟ ان تمام باتوں کی تفصیل جناب کی خدمت میں پھر کسی موقعہ پر لکھوں گا۔ اس وقت میں جس اہم بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ ہے ,,نو مسلم حضرات کے مسائل،،۔ محترم جناب! جب اخبارات میں یا رسالوں کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں غیر مسلم نے اسلام کی کسی بات سے متاثر ہو کر یا کسی اور وجہ سے اسلام قبول کیا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور پھر اس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اسے اللہ تعالی کی پہچان ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ دین تو تمام عالم کے لئے

آخری قانون کی حیثیت سے اللہ تعالی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر بھیجا ہے، مگر یہ ساری خوشی اس وقت کافور ہو جاتی ہے جب یہی نو مسلم شخص اپنے خاندان والوں کی لات جوتیاں کھانے کے بعد ہم مسلمانوں کے پاس سہارے کے لئے آتا ہے۔ اور پھر ہم سہارا ہوتے ہوے اسے سہارا نہیں دیتے۔

اس واسطے اس معاشرے میں یہ نو مسلم حضرات جب دیکھتے ہیں کہ انکو کوئی صاحبِ حیثیت، کوئی دینی ادارہ، کوئی مدرسہ سپورٹ نہیں کر رہا ہے، تو پھر یہ نو مسلم حضرات اپنی ,,سند اسلام،، مسجدوں میں دکھا دکھا کر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، اس قسم کے واقعات میں نے (میرا اللہ جانتا ہے) بہت دیکھے ہیں، ایک صاحب نئے نئے مسلمان ہوے تھے اور ان کا چھوٹا بھائی جو ان کے ساتھ رہتا تھا وہ بھی مسلمان ہو گیا تھا، یہ صاحب ضلع سانگھڑ سے کراچی آئے تھے، اپنے چھوٹے بھائی کے علاج کے سلسلے میں اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے آئے تھے کیونکہ وہاں پر تمام خاندان والے ان کے خلاف ہو چکے تھے، اس لئے کہ یہ اپنا مذہب (ہندو) چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے۔ جب یہاں کراچی پہنچ کر انھوں نے یہاں کے لوگوں کو حالات بتائے تو سوائے چند روپوں کی مدد کے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا جبکہ جو مالی مدد پانچ دس روپے کی شکل میں کی گئی تھی وہ بھی ناکافی تھی۔ جبکہ وہاں اس علاقہ کے لوگ اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک واقعہ ہے۔ اس قسم کے اور بہت سے واقعات سے یہ معاشرہ بھرا پڑا ہے۔

بد قسمتی سے ہمارے اس وطن پاکستان میں آج تک جہاں اور بہت سی اہم باتوں کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی وہاں اس بات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی کہ جو غیر مسلم حضرات دینِ اسلام قبول کرتے ہیں، ان کے لئے کوئی ادارہ یا تنظیم قائم کی جائے تاکہ انکی آئندہ مشکلات میں یہ ادارہ یا تنظیم مدد کر سکے۔

ابھی حال ہی میں جمعہ ۲۹/ اکتوبر کے جنگ اخبار کے فرنٹ پیج پر ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ برونئی کے سلطان حسن البلقیہ نے قبرص میں دولت مشترکہ کانفرس کے دوران جس ہوٹل میں قیام کیا تھا وہاں سے واپس جاتے ہوے انہوں نے ہوٹل کے عملے کے لئے ایک لاکھ ستر ہزار ڈالر کی ٹپ چھوڑی جو ہوٹل کے عملے میں تقسیم کی جائے گی۔

اسی طرح عرب شہزادوں کی خبریں بھی آئے دن اخبارات کی زینت بنتی ہیں، مثلاً یہ کہ عرب کے کسی شہزادہ نے امریکہ کے کسی ہوٹل میں لاکھوں ڈالر جوئے میں ہارے، کبھی کوئی شہزادہ ویٹرس کو ۲۵ ہزار ڈالر کی ٹپ دے گیا۔

اسی طرح ہمارے وطن پاکستان میں بھی امیر ترین لوگوں کے بھی دولت اڑانے کے مختلف مشاغل ہیں۔ مگر کسی غریب کو دینے کے لئے ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی، اگر کوئی غریب ان کی کار کے دروازے پر آکر اپنی ضرورت بیان کرے تو یہ اپنے کار کے شیشے اوپر کر لیتے ہیں تاکہ اس غریب کی آواز ان کے نرم کانوں میں نہ پڑے۔

اگر کوئی غریب ان کے محل نما بنگلے پر اپنی ضرورت کے تحت آجائے تو چوکیدار سے کہا جاتا ہے کہ اسے یہاں سے چلتا کرو۔

ہاں البتہ دکھاوے کی خاطر یہ سب کچھ کر سکتے ہیں، غریب کی مدد بھی (جو کہ ناکافی ہوتی ہے) بیوہ عورتوں کی مدد بھی کی جاتی ہے، وہ بھی اس لئے کہ اخبار میں ان کی تصویر چھپ سکے۔

خیر ان حضرات کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ بھئی یہ تو دنیادار ہیں، نماز روزے کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔

مگر اس دنیا میں اللہ تعالی نے ایسے لوگوں کو بھی پیدا فرمایا ہے جن کو اللہ تعالی نے دین میں بھی خوب سمجھ بوجھ دی ہے، اور دنیا کی نعمتوں سے بھی خوب نوازا ہے، اب اگر کوئی ان دین داروں کے پاس جاتا ہے کہ میں ایک مستحق آدمی ہوں، یا نو مسلم ہوں اور معاشی اور معاشرتی طور پر پریشان ہوں، پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دین دار لوگوں کے پاس ٹائم نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے ہر کام کے لئے ٹائم مقرر کیا ہوا ہے چاہے بندہ کتنی ہی پریشانی اور عجلت میں ہی کیوں نہ آئے، یہ اپنے ٹائم کے بہت ہی پابند رہتے ہیں، ٹائم کی پابندی بڑی ہی اچھی بات ہے اس بات سے انکار نہیں، مگر ہر حال میں ایک جیسا برتاؤ ٹھیک نہیں ہوا کرتا۔

آج سے ایک صدی پہلے کے بزرگوں کے حالات جب پڑھتا ہوں اور آج کے بزرگوں کو دیکھتا ہوں تو بہت بڑا فرق نظر آتا ہے، یہاں ایک بات اور عرض کردوں وہ یہ کہ جب کوئی کسی کا ہوتا ہے تو پھر محبت کے عالم میں وہ اس چاہنے والے سے بہت سی اُمیدیں وابستہ

کر لیتا ہے، کچھ اسی طرح کا خیال ایک نو مسلم آدمی کے ذہن میں بھی بس جاتا ہے جب میں ۱۹۸۶ء میں مسلمان ہوا تھا تو رشتے داروں کی طرف سے خوب باتیں سننے کو ملیں اور گھر سے بھی، مگر میرے دل میں ایک جذبہ تھا، وہ یہ کہ اب یہ لوگ میرے رشتہ دار نہیں بلکہ یہ تمام مسلمان بھائی میرے رشتے دار ہیں، مگر جب میں مدد کے لئے ان کی طرف گیا تو...... خیر میں تو اللہ تعالی سے یہی دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ دین اسلام پر صحیح طور پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے، اور تمام مشکلات کو حل فرمادے، آمین ثم آمین۔

میں یہاں اورنگی ٹاؤن غازی آباد کرسچن کالونی میں رہتا ہوں یہاں کے تمام عیسائی حضرات مجھ سے انتہائی درجے کی جلن، بغض اور حسد رکھتے ہیں، میری والدہ اور میرے بھائی کو میرے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں، کبھی اذان کے وقت زور زور سے گانے بجائیں گے، کبھی اسلام کے بارے میں بحث کرنے لگیں گے، بحث تو اب اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ان عیسائی حضرات نے میرے ساتھ کرنا چھوڑ دی ہے، وہ اس لئے کہ جب سے میں نے ,,بائیبل سے قرآن تک،، کتاب کا مطالعہ کیا ہے اب ان کی ہمت نہیں ہوتی کہ اسلام کے بارے میں مجھ سے کوئی بات کریں۔

میری والدہ اور میرے بھائی کے لئے دعا فرمادیجئے تاکہ اللہ تعالی انکو بھی دینِ اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

نیز یہ کہ عرصہ چار پانچ ماہ سے میرا چھوٹا بھائی اسلم سنٹرل جیل کراچی میں جھوٹے مقدمے میں بند ہے، یہ تمام کاروائی بھی یہاں

کے عیسائی حضرات اور پولیس نے ملکر کی ہے، اس کے لئے بھی دعا فرمادیں کہ اللہ تعالی جلد از جلد میرے بھائی کو رہائی نصیب فرمائے، نو مسلموں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے میری اس گذارش کو آپ اپنے الفاظ میں دوسروں تک پہنچادیں، یہ میری آپ سے گذارش بھی ہے اور تمنا بھی، امید کرتا ہوں کہ آپ میرے اس خط کا جواب اپنا قیمتی وقت نکال کر ضرور دیں گے۔

والسلام

خالد محمود

کرسچین کالونی اورنگی ٹاؤن

جن مسائل کی طرف مکتوب نگار نے توجہ دلائی ہے وہ ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہیں، واقعہ یہی ہے کہ ان مسائل کا بہترین حل یہی ہے کہ ایک انجمن یا جماعت خاص طور پر نو مسلموں کی فلاح و بہبود کے مقصد سے قائم ہو، یہی انجمن سچ، جھوٹ اور حقیقت و فریب کی تحقیق بھی کرسکتی ہے، اور پھر جن نو مسلم بھائیوں کے بارے میں حقیقی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ مسائل سے دوچار ہیں ان سے تعاون کے بہتر ذرائع بھی اختیار کرسکتی ہے، خدا کرے کہ اداروں، انجمنوں اور جماعتوں کی بہتات کے اس دور میں کچھ مخلص مسلمان اس کام کے لئے بھی آگے بڑھیں، اور اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے کوئی ادارہ، انجمن یا جماعت قائم کریں۔

۱۶/ رمضان ۱۴۱۴ھ

۲۷/ فروری ۱۹۹۴ء

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پچھلے دنوں برطانیہ کی برسر اقتدار ٹوری پارٹی کے رکن پارلیمنٹ اسٹیفن ملی گان (Stephen Miligan) کی پراسرار موت عالمی اخبارات ورسائل میں موضوعِ گفتگو بنی رہی، امریکی رسالے ,,ٹائم،، (۲۱ر فروری) کے مطابق ۴۷ سالہ اسٹیفن ملی گان کی حیثیت برطانیہ کی پارلیمانی سیاست میں ایک ابھرتے ہوئے ستارے کی سی تھی، لیکن پچھلے دنوں وہ اپنے باورچی خانے میں اچانک مردہ پائے گئے، اور مردہ بھی اس پراسرار حالت میں کہ ان کے جسم پر کپڑے نام کی اگر کوئی چیز تھی تو وہ صرف ان کی ٹانگوں میں زنانہ ساق پوش (Stockings) اور گارٹر بلیٹ تھی، جسم پر کسی زخم یا تشدد کا کوئی نام ونشان نہیں تھا، نہ اس بات کی کوئی علامت تھی کہ انہوں نے خودکشی کی ہے۔

ماہرین نے ان کی موت کے اسباب کا کھوج لگایا تو پتہ چلا کہ نہ انہیں کسی نے قتل کیا ہے، اور نہ انہوں نے جان بوجھ کر خودکشی کی ہے، بلکہ وہ خود اپنی حد سے بڑھی ہوئی لذت پسندی کا شکار ہوئے ہیں، ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ خود لذتی (Solo Sex) کے ایک ایسے عمل میں مشغول تھے جس میں زیادہ سے زیادہ لذت کے حصول کی خاطر دماغ کو آکسیجن کی سپلائی کم ہو جاتی ہے، انہوں نے یہ عمل اس طرح جاری رکھا کہ دماغ آکسیجن سے بالکلیہ محروم ہو گیا، اور اس کے نتیجہ میں ان کی موت واقع ہو گئی۔

مغربی ممالک میں اس قسم کی جنسی جنونیت کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے

ہیں،،ٹائم،، کے حالیہ شمارے (۲۸ر فروری) میں بھی اس واقعے کا حوالہ دیتے ہوے کہا گیا ہے کہ پچھلے چند ہفتوں میں ٹوری پارٹی کے چھ ارکانِ پارلیمنٹ کے جنسی اسکینڈل منظرِ عام پر آئے ہیں جنکی انتہاء اسٹیفن ملی گان کی موت پر ہوئی ہے۔

اس واقعے میں،اور اس جیسے سینکڑوں دوسرے واقعات میں جو مغربی ممالک میں روز مرّہ کا معمول بن چکے ہیں، عبرت کا پہلو یہ ہے کہ یہ سب کچھ کسی ایسے معاشرے میں نہیں ہو رہا جو جنسی لذت کے حصول کے لئے قید وبند کا شکار ہو،اور اس مقصد کے لئے معمول کے راستوں سے محروم اور مایوس ہونے کے بعد غیر معمولی راستوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہو، بلکہ یہ سب کچھ اس ماحول میں ہو رہا ہے جسے دنیا بھر میں اباحیت پسند معاشرہ (Permissive Society) کہا جاتا ہے،جہاں فرد کی آزادی کو اتنا وسیع مفہوم دیا گیا ہے کہ مذہب واخلاق کی تمام قدریں اس پر قربان کر دی گئی ہیں، جہاں نفسانی خواہشات کی تکمیل پر سب سے کم پابندیاں ہیں،جہاں جنسی لذتوں کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں،اور ان کے ارد گرد مذہب واخلاق کا کوئی قابلِ ذکر پہرہ نہیں ہے۔

لیکن لذّت اندوزی کی اس کھلی چھوٹ کے باوجود لوگ ہیں کہ انہیں اب بھی قناعت اور قرار حاصل نہیں، وہ اب بھی معمول کی حدیں پھلانگنے کی فکر میں ہیں،اور جنسی جرائم کی تعداد ان ممالک میں دنیا بھر سے زیادہ ہے۔

اس صورتِ حال کی وجہ در حقیقت یہ ہے کہ جنسی جذبہ جب اعتدال سے آگے بڑھتا ہے تو اسے کسی حد پر روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ مغربی دنیا کے حالات اس کے گواہ ہیں کہ جنسی لذت کا شوق فطرتِ سلیمہ کی سرحد پار کرنے کے بعد ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسان کو اس بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد لطف ولذت کے کسی درجے پر صبر نہیں آتا۔ وہ انسانیت وشرافت کی ایک ایک قدر کو بھنبھوڑ ڈالتا ہے، پھر بھی اسے قناعت نصیب نہیں ہوتی،اور اس کی مثال استسقاء کے اس مریض

کی سی ہوتی ہے جو آس پاس کے سارے گھڑے خالی کرنے کے بعد بھی پیاسا کا پیاسا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

اسی مغربی دنیا میں جہاں لذت پرستی کے نت نئے واقعات روزانہ رونما ہوتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کی بھی بہت بھاری تعداد ہے جو اس صورتِ حال پر نہایت پریشان ہے، وہ سوچتی ہے کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی کی خواہشات پر بھی کوئی روک ضرور ہونی چاہئے جو اسے معقولیت کی حدود میں رکھ سکے، لیکن "معقولیت کی حدود" کیا ہیں؟ اور ان کے تحفظ کے لئے کس قسم کی "روک" کار آمد ہو سکتی ہے؟ ان سوالات کا کوئی جچا تلا جواب ان کے پاس نہیں ہے، اور مابعد الطبیعت (Metaphysics) سے کلی طور پر منہ موڑ لینے کے بعد ان کے پاس کوئی ایسا پیمانہ بھی نہیں ہے جو جائز اور ناجائز اور خیر اور شر کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچ سکے، انہوں نے یہ خطِ امتیاز کھینچنے کے لئے نری عقل کو استعمال کرنا چاہا، لیکن انسانیت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وحیِ الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہونے کے بعد انسانی عقل عموماً اپنی نفسانی خواہشات کی غلام بن جاتی ہے، چنانچہ وحی کے نور سے محروم یہ عقل دھیرے دھیرے انسان کو خواہشات کی اس بھول بھلیاں تک لے آئی جہاں اس کے پاس بھٹکنے اور بھٹکتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

چاہے کوئی شخص یہ بات مانے یا اسے نہ مان کر اپنا ہی نقصان کرے، حقیقت تو یہی ہے کہ دنیا کی اس محدود زندگی میں "لذّتِ کامل" کا حصول ہی ناممکن ہے، یہاں ہر خوشی کے ساتھ غم، ہر راحت کے ساتھ تکلیف اور ہر لذّت کے ساتھ کدورت کا کانٹا لگا ہوا ہے، اربوں انسانوں کی اس بھری پُری دنیا میں کوئی نہیں ہے جسے "لذّتِ کامل" کی وہ معراج حاصل ہو گئی ہو جس کے بعد اس کے دل میں مزید کی خواہش نہ ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص یہاں لذّت و راحت کے ایسے منتہائے کمال (Climax) کا طالب ہو جس کے بعد لذت و راحت کا کوئی اور درجہ باقی نہ ہو تو وہ ایک ناممکن شے کی تلاش میں اپنی جان دے

سکتا ہے، مگر اپنا گوہر مقصود حاصل نہیں کر سکتا۔

لہذا انسان کے لئے اپنی نفسانی خواہشات کو کسی حد پر روک کر کسی جگہ ٹھہرنا ضروری ہے۔ اسی ٹھہرنے کا نام ,,قناعت،، ہے۔ اور اللہ تعالی حق شناس نگاہ عطا کرے تو یہ ,,قناعت،، ہی وہ اعلی ترین لذّت ہے جو اس دنیا میں رہ کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ قصیدۂ بردہ کے مشہور صوفی شاعر علامہ بوصیری نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ ؎

النفس كالطفل إن تهمله شبّ على

حب الرضاع وإن تفطمه ينفطم

انسانی نفس کی مثال دودھ پیتے بچے کی سی ہے، اگر تم اسے بے روک ٹوک چھوڑے رکھو تو وہ بوڑھا ہو جائیگا، مگر شیر خواری کی محبت اسکے دل سے نہیں نکلے گی، لیکن اگر تم اس سے دودھ چھڑوانا چاہو گے تو وہ چھوڑ بھی دیگا۔

سوال اب صرف یہ ہے کہ وہ کونسی حد ہے جس پر انسانی نفس کو روکا جائے؟ اور اس سوال کا صحیح جواب وحی الہی سے رہنمائی حاصل کئے بغیر ممکن نہیں، اگر اس بات پر ایمان ہے کہ انسان اور اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کسی نے پیدا کی ہے، تو اس ایمان کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ اس سوال کا جواب اسی پیدا کرنے والے سے معلوم کیا جائے، یہ عجیب بات ہے کہ آج بھی ہر امریکی ڈالر پر یہ جملہ چھپا ہوا ہے کہ "In God we trust" (یعنی ہم خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں) لیکن اس فقرے سے باہر نہ صرف یہ کہ اس ,,خدا،، پر بھروسے کا کوئی مظاہرہ کہیں نظر نہیں آتا، بلکہ زندگی کے ہر اہم مسئلے میں اُس کو کلی طور پر خارج از بحث قرار دینے کو وقت کا فیشن بنالیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی تم اس خدا پر بھروسہ کرتے ہو، تو کیا اس نے یہ کائنات پیدا کر کے انسان کو خواہشات کے گھپ اندھیرے میں چھوڑ دیا ہے؟ کیا اس نے تمہیں اس گھپ اندھیرے میں راستہ

تلاش کرنے کے لئے کوئی روشنی فراہم نہیں کی؟ اگر اس نے واقعی تمہیں اس طرح بے یارومددگار چھوڑدیا ہے تو کیا وہ واقعۃً بھروسے کے لائق ہے؟اور اگر یہ بھروسہ رکھتے ہو کہ اس نے کوئی روشنی تمہارے لئے ضرور بھیجی ہوگی، تو اس روشنی کو تلاش کرنا یقیناً چاند اور مریخ پر کمندیں ڈالنے سے زیادہ ضروری ہے، کیونکہ اس روشنی کے بغیر تمہاری زندگی کا سفر ٹھیک نہیں ہو سکتا،شاعر مشرقؒ نے برسوں پہلے کہدیا تھا ۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا

پھر اس قسم کے واقعات میں ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ آج مغرب جس مقام پر کھڑا ہے اور جہاں سے واپسی کی سوچ کے باوجود واپس نہیں ہو پارہا، وہاں وہ ایک دم سے راتوں رات نہیں پہنچ گیا تھا، بلکہ اسے یہاں تک پہنچنے میں ایک طویل عرصہ لگا ہے، ابتدا میں وہاں بھی شرم وحیا، عفت وعصمت اور پاک دامنی کی وہی اہمیت تھی جو مشرق، اور بالخصوص مسلم معاشروں میں پائی جاتی ہے، لیکن گوناگوں اسباب کے تحت وہاں لبرلزم کا جو سیلاب اٹھا، اس نے جس طرح بہت سی توہم پرستیوں کے خلاف کامیاب لڑائی لڑی، وہاں وہ آزادی کے جوش میں بہت سی ایسی قدروں کو بھی بہالے گیا جو معاشرے کے اخلاقی استحکام کے لئے ناگزیر تھیں۔ شروع میں بظاہر کچھ بے ضرر سی تبدیلیاں لائی گئیں جن کے دوررس اثرات اس وقت محسوس نہ ہو سکے، لیکن جب اخلاقی رکاوٹوں کا بند ایک

مرتبہ ٹوٹا، تو پھر وہ ٹوٹتا ہی چلا گیا، اور اسے کسی حد پر روکنا ممکن نہیں رہا۔

آج ہمارے معاشرے میں بھی لبرلزم کے نام پر تیزی سے ایسی تبدیلیاں لانے کی کوششیں جاری ہیں جن کا رُخ وہی ہے جو مغرب کے لبرلزم نے اختیار کیا تھا، بعض اوقات ان تبدیلیوں کو معمولی اور بے ضرر قرار دینے کے لئے بڑے دلائل دیئے جاتے ہیں، بالخصوص عورت کے معاشرتی کردار کے حوالے سے جو فکر اس وقت ہمارے پڑھے لکھے حلقوں میں عام ہو رہی ہے، اسکی سمت ٹھیک وہی ہے جس سے مغرب نے اپنی بے راہروی کے سفر کا آغاز کیا تھا، جب دو مختلف سمتوں میں سفر کرنے والی ریل کی پٹڑیاں ایک دوسری سے الگ ہوتی ہیں تو دونوں کے درمیان چند انچ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہوتا، لیکن جب کوئی شخص اس فاصلے کو معمولی سمجھ کر بدلی ہوئی پٹڑی پر سفر جاری رکھے تو بہت تھوڑے سے عرصے میں دونوں پٹڑیوں کے درمیان سینکڑوں میل کا فرق پڑ جاتا ہے، اور وہ اپنی صراطِ مستقیم سے کہیں دور جا نکلتا ہے۔

لہذا ہم اس وقت ایک انتہائی نازک دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ذرا سی غفلت اور بے پروائی ہمیں اپنی منزلِ مقصود سے بہت دور لے جا سکتی ہے۔ ایسے مواقع پر معاشرے کے اخلاقی ڈھانچے اور ملت کی مسلّمہ قدروں میں کسی بھی تبدیلی کو معمولی سمجھ کر اسے لا پروائی کی نذر کرنا اجتماعی خودکشی کے مرادف ہو سکتا ہے۔ لہذا اس سلسلے میں ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہئے۔

کوئی شک نہیں کہ زندگی ہر دم رواں پیہم دواں ہے، اس میں بھی شک نہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں بہت سی تبدیلیاں زندہ رہنے کے لئے ناگزیر بھی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اپنی زندگی کے تمام اصولوں کو اس خراد پر گھس دیا جائے، ہمیں ,,خذ ما صفا ودع ما کدر،، (صاف چیز کو لے لو، اور مکدّر کو چھوڑ دو) کے اصول پر انتہائی احتیاط اور باریک بینی سے عمل کرنا ہے، اور اس کے لئے ہمارے پاس قرآن وسنّت کی

روشنی موجود ہے، جس کے ذریعے ہم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم زندگی کے ہر مسئلے کا حل دوسروں کے نقوشِ قدم میں تلاش کرنے کی عادت چھوڑیں، اور اپنی گدڑی میں چھپے ہوئے اس لعل سے آگاہ ہونے کی کوشش کریں جو آج بھی ہمارے لئے بہترین سرمایۂ ہدایت ہے۔

۲۳/ رمضان ۱۴۱۴ھ
۶/ مارچ ۱۹۹۴ء

عید مبارک

ہر قوم وملت میں سال کے کچھ دن جشنِ مسرت منانے کے لئے مقرر کیے جاتے ہیں جنہیں عرفِ عام میں تہوار کہا جاتا ہے، تہوار منانے کے لئے ہر قوم کا مزاج ومزاق جدا ہو سکتا ہے، لیکن ان سب کی قدرِ مشترک ,,خوشی منانا،، ہے۔

چونکہ انسان کی طبیعت ہے کہ وہ معمولات کی یکسانی سے کبھی کبھی گھبرا اٹھتا ہے، اس لئے وہ ایسے شب وروز کا خواہش مند ہوتا ہے جن میں وہ اپنے روزمرہ کے معمولات سے ذرا ہٹ کر اپنے ذہن ودل کو فارغ کرے، اور کچھ وقت بے فکری کے ساتھ ہنس بول کر گذارے۔ انسان کی یہی طبیعت تہواروں کو جنم دیتی ہے جو بالآخر کسی قوم کا اجتماعی شعار بن جاتے ہیں۔

جب آنحضرت ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ نیروز اور مہرجان کے نام سے دو خوشی کے تہوار مناتے ہیں، صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا ہم ان تہواروں میں شرکت کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ,,اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان کے بدلے ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں، ایک عید الفطر کا دن، دوسرا عید الاضحیٰ کا،،۔

چنانچہ امتِ مسلمہ کے لئے سال میں یہ دو دن خوشی منانے کے لئے مقرر کر دیے گئے جن میں ایک طرف انسانی نفسیات کے مذکورہ بالا تقاضے کی رعایت بھی ہے، اور ساتھ ساتھ ان دنوں کے تعین اور ان کو منانے کے انداز میں بہت سے عملی سبق بھی۔

کوئی تہوار مقرر کرنے کے لئے عام طور سے اکثر قومیں کسی ایسے دن کا انتخاب کرتی ہیں جس میں ان کی تاریخ کا کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہو۔ مثلاً عیسائیوں کی کرسمس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے (اگرچہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی یقینی تاریخ کسی کو معلوم نہیں ہے) یہودیوں کی عید فسح اس دن کی یادگار سمجھی جاتی ہے جس میں بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات ملی۔ اسی طرح ہندوؤں کے بہت سے تہوار بھی ان کے کسی خاص واقعے کی یادگار کے طور پر منائے جاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں ایسے دنوں کی کوئی کمی نہیں تھی، جن کی خوشی ہر سال اجتماعی طور پر منائی جاسکے، دنیا ہی کا نہیں، اس پوری کائنات کا سعید ترین دن وہ تھا جس میں سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے، یا وہ دن تھا جس میں آپ ﷺ کو نبوت کا عظیم منصب عطا فرمایا گیا، اور دنیا کے لئے آخری پیغامِ ہدایت قرآن کریم کی شکل میں نازل ہونا شروع ہوا۔ اس دن کی عظمت بھی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، جس میں آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کو اپنا مستقر بنا کر پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح اس دن کی شان وشوکت کا کیا ٹھکانا جس میں آپ ﷺ کے تین سو تیرہ نہتے جاں نثاروں نے بدر کے میدان میں باطل کے مسلح لشکر کو شکستِ فاش دی، اور جسے خود قرآن کریم نے ,,یوم الفرقان،، (یعنی حق وباطل کے درمیان امتیاز کا دن) قرار دیا۔ اس دن بھی مسلمانوں کی فرحت ومسرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور کعبے کی چھت سے پہلی بار حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان گونجی۔ غرض آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ایسے جگمگاتے ہوے دن بیشمار ہیں جنہیں مسلمانوں کے لئے جشن مسرت کی بنیاد بنایا جاسکتا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضور سرور دوعالم ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر دن عظیم تھا جس میں مسلمانوں کو کوئی نہ کوئی دینی یا

دنیوی دولت نصیب ہوئی۔

لیکن اسلام کی یہ شان نرالی ہے کہ پوری امت کے لئے سالانہ عید مقرر کرنے کے لئے ان میں سے کسی دن کا انتخاب نہیں کیا گیا، اور دینی طور پر مسلمانوں کے لئے لازمی سالانہ عید مقرر کرنے کے لئے یکم شوال اور ۱۰ ذی الحجہ کی تاریخیں منتخب کی گئیں جن سے بظاہر تاریخ کا کوئی امتیازی واقعہ وابستہ نہیں تھا، بلکہ یہ دو دن ایسے مواقع پر مقرر کئے گئے جن پر پوری امت ایک ایسی اجتماعی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتی ہے جو سال میں ایک بار ہی انجام دی جاتی ہے، عید الفطر اس وقت منائی جاتی ہے جب مسلمان رمضان المبارک میں نہ صرف فرض روزوں کی تکمیل کرتے ہیں، بلکہ اس مقدس مہینے کے ایک تربیتی دور سے گذر کر اپنی روحانیت کو جلا بخشتے ہیں۔ اور عید الاضحیٰ اس وقت منائی جاتی ہے جب ایک دوسری سالانہ عبادت یعنی حج کی تکمیل ہوتی ہے، اور لاکھوں مسلمان عرفات کے میدان میں اپنے پروردگار سے مغفرت کی دعائیں کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کر چکے ہوتے ہیں، اور جو لوگ براہِ راست حج میں شریک نہیں ہو سکے، وہ قربانی کی عبادت انجام دیتے ہیں۔

اس طرح اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے سالانہ عید منانے کے لئے کسی ایسے دن کا انتخاب نہیں کیا جو ماضی کے کسی یادگار واقعے سے وابستہ ہو۔ اس کے بجائے مسلمانوں کی عید ایسے واقعات سے وابستہ کی گئی ہے جو مسلمانوں کے حال سے متعلق ہیں، اور جنکی ہر سال تجدید ہوتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ پچھلی تاریخ میں جو کوئی یادگار یا مقدس واقعہ پیش آیا، وہ ماضی کا ایک حصہ بن گیا، اس کو یاد رکھنا اس لحاظ سے بلاشبہ مفید اور ضروری ہے کہ اسے اپنے حال اور مستقبل کی تعمیر کے لئے نمونہ اور اپنی قوتِ جہد و عمل کے لئے مہمیز بنایا جائے، لیکن ہر وقت ماضی میں گم رہ کر حال اور مستقبل سے بے فکر ہو جانا بعض اوقات قوموں کو اپنے کرنے کے کاموں سے غافل بھی بنا دیتا ہے، اور انہیں یہ طعنہ سننا پڑتا ہے کہ ؂

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو!

لہذا عیدین کو کسی ماضی کے واقعے سے وابستہ نہ کرکے ہمیں سبق یہ دیا گیا ہے کہ تمہیں اصل خوشی منانے کا حق ان کاموں پر پہنچتا ہے جو خود تم نے حال میں انجام دیئے ہوں، محض ان کارناموں پر نہیں جو تمہارے آباءواجداد کر گذرے تھے۔

لہذا عید کا ہر دن ہم سب سے یہ سوچنے کا مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے حال اور اپنے اعمال کے پیش نظر کیا واقعی ہمیں خوشی منانے کا حق پہنچتا ہے؟ عید الفطر در حقیقت رمضان کے تربیتی کورس میں کامیابی کا ایک انعام ہے، اسی لئے حدیث میں اسکو ,,یوم الجائزۃ،، یعنی انعام کا دن قرار دیا گیا ہے، لہذا یہ دن ہم سے یہ جائزہ لینے کا تقاضا کرتا ہے کہ کیا ہم نے اعمال واخلاق کے اس تربیتی کورس میں واقعی کامیابی حاصل کی ہے؟ کیا واقعی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق میں کچھ اضافہ ہوا ہے؟ کیا ہم نے بندوں کے حقوق کو پہچاننا شروع کردیا ہے؟ کیا ہمارے دل میں امانت، دیانت، ضبطِ نفس اور جہد و عمل کے جذبات پیدا ہوئے ہیں؟ کیا ہم نے چارسو پھیلی ہوئی معاشرتی برائیوں کو مٹانے اور ان سے خود اجتناب کرنے کا کوئی عہد تازہ کیا ہے؟ کیا ہمارے سینے میں ملک و ملت کی فلاح و بہبود کا کوئی ولولہ پیدا ہوا ہے؟ کیا ہم نے آپس کے جھگڑوں کو مٹا کر اس طرح متحد ہونے کا کوئی ارادہ کیا ہے جس طرح ہم عیدگاہ میں یکجان نظر آتے ہیں؟ اگر اپنے گریبان میں منہ ڈالنے اور انصاف کے ساتھ اپنا جائزہ لینے کے بعد کسی کو ان سوالات کا، یا کم از کم ان میں سے کچھ سوالات کا جواب اثبات میں ملتا ہے تو اسے واقعی عید مبارک ہو۔

۳۰/ رمضان ۱۴۱۴ھ
۱۳/ مارچ ۱۹۹۴ء

اپنی خبر لیجئے

,,زمانہ بڑا خراب ہے،، ,,امانت اور دیانت لوگوں کے دل سے اٹھ چکی ہے،، ,,رشوت کا بازار گرم ہے،، ,,دفتروں میں پیسے یا سفارش کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا،، ,,ہر شخص زیادہ سے زیادہ بٹورنے کی فکر میں لگا ہوا ہے،، ,,شرافت اور اخلاق کا جنازہ نکل گیا ہے،، ,,بے دینی کا سیلاب چاروں طرف امڈا ہوا ہے،، ,,لوگ خدا اور آخرت سے غافل ہو بیٹھے ہیں،،۔

اس قسم کے جملے ہیں جو ہم دن رات کسی نہ کسی اسلوب سے کہتے یا سنتے رہتے ہیں، ہماری کوئی محفل شاید ہی حالات کی خرابی کے اس شکوے سے خالی ہوتی ہو، اور یہ شکوہ کچھ غلط بھی نہیں، واقعۃً زندگی کے جس شعبے کی طرف نظر ڈالئے، ایک نمایاں انحطاط دکھائی دیتا ہے، اور معاشرتی خرابیاں ہمیں گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔

دوسری طرف اصلاح معاشرہ کی کوششوں کا جائزہ لیجئے، تو بظاہر ان میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ نہ جانے کتنے ادارے، کتنی جماعتیں، کتنی انجمنیں اسی معاشرے کی اصلاح کے لئے قائم ہیں، اور اپنے اپنے دائرے میں اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کر رہی ہیں، شاید ملک کا کوئی قابلِ ذکر حصہ اس قسم کی کوششوں سے خالی نہ ہو، اور ان میں سے بعض کوششوں کا محدود سا اثر کہیں کہیں نظر بھی آ جاتا ہے، لیکن اگر بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو دیکھا جائے تو بظاہر یہ ساری کوششیں رائیگاں محسوس ہوتی ہیں، اور

معاشرے کی مجموعی فضا پر نہ صرف یہ کہ ان کا کوئی نمایاں اثر ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ افق پر امید کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آتی۔

اس صورتِ حال کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں، اور یہ اسباب اب اتنے الجھ گئے ہیں کہ اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا پکڑنا بھی آسان نہیں رہا، لیکن اس وقت میں صرف ایک اہم سبب کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف بسااوقات ہمارا دھیان نہیں جاتا۔

وہ سبب یہ ہے کہ ہمارا اجتماعی مزاج کچھ ایسا بن گیا ہے کہ ہمیں دوسروں پر تنقید کرنے، ان کے عیوب تلاش کرنے اور ان کی برائیوں پر تبصرہ کرنے میں جو لطف آتا ہے وہ کسی حقیقی اصلاحی عمل میں نہیں آتا۔ حالات کی خرابی کا شکوہ ہمارے لئے وقت گذاری کا ایک مشغلہ ہے جس کے نت نئے اسلوب ہم ایجاد کرتے رہتے ہیں، لیکن ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے کوئی بامعنی قدم اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے، اور اگر اصلاحِ احوال کے لئے کوئی جھنڈا بلند کرتے بھی ہیں تو ہماری خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اصلاح کے عمل کا آغاز کسی دوسرے سے ہو۔ ہماری اصلاحی جدوجہد اس ذہنی مفروضے کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے کہ ہمارے سوا ساری دنیا کے لوگ خراب ہوگئے ہیں، اور ان کے اعمال واخلاق کو درست کرنے کی ذمّہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے، یہ سب کچھ سوچتے اور کرتے ہوئے یہ خیال بہت کم لوگوں کو آتا ہے کہ کچھ خرابیاں خود ہمارے اندر بھی ہوسکتی ہیں، اور ہمیں سب سے پہلے ان کی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے، چنانچہ جو اصلاحی تحریک اپنے آپ سے بے خبر ہوکر صرف دوسروں کو اپنا ہدف بناتی ہے، اس میں دوسروں کے لئے کوئی کشش اور تاثیر نہیں ہوتی، اور وہ محض ایک رسمی کارروائی ہوکر رہ جاتی ہے۔

معاشرے کے حالات اور لوگوں کے طرزِ عمل پر تنقید کا سب سے خطرناک اور نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو خود اپنی غلط کاری کے لئے وجہ جواز بنالیا جاتا ہے، چنانچہ یہ فقرہ بکثرت سننے میں آتا رہتا ہے کہ "یہ کام

ٹھیک تو نہیں ہے، لیکن زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے کرنا ہی پڑتا ہے،، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے زمانے اور زمانے کی ساری برائیوں کا تذکرہ تو اس انداز سے کرتے ہیں جیسے ہم ان تمام برائیوں سے معصوم اور محفوظ ہیں، لیکن اس تذکرے کے بعد جب عملی زندگی میں پہنچتے ہیں تو ان کاموں کا بے تکان ارتکاب کرتے جاتے ہیں، جنکی برائی بیان کرتے ہوئے ہم نے اپنا سارا زورِ بیان خرچ کیا تھا۔

اگر ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ہولناک آگ بھڑک رہی ہو، اور ہم یقین سے جانتے ہوں کہ اگر اسکی روک تھام نہ کی گئی تو یہ پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی تو کیا پھر بھی ہمارا طرزِ عمل یہ ہوگا کہ ہم اطمینان سے بیٹھکر اظہار افسوس کرتے رہیں، اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش نہ کریں؟ ایسے موقع پر بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی آگ کی تفصیلات کو نمک مرچ لگا کر بیان کرنے سے پہلے اسے بجھانے کے لئے فائر بریگیڈ کو فون کرے گا، اور خود بھی اسے بجھانے کا جو طریقہ ممکن ہو اختیار کریگا، اور اگر آگ بجھتی نظر نہ آئے تو کم از کم خود تو وہاں سے بھاگ ہی کھڑا ہوگا، لیکن یہ کام کوئی بدترین دیوانہ ہی کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے وہ آگ کا قصہ لوگوں کو سنا کر خود اسی آگ میں چھلانگ لگا دے۔

لیکن معاشرتی برائیوں کی جس آگ کا تذکرہ ہم دن رات کرتے ہیں عجیب بات ہے کہ اسکے بارے میں ہمارا طرزِ عمل یہی ہے کہ یہ تذکرہ کرنے کے بعد ہم خود بھی اسی میں کود جاتے ہیں، ہم دن رات، شوت خوروں کو صلواتیں سناتے ہیں لیکن اگر کبھی وقت پڑ جائے تو خود رشوت لینے یا دینے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جھوٹ، خیانت اور حرام خوری کی مذمت ہمارے وردِ زبان رہتی ہے، لیکن اگر کبھی داؤں چل جائے تو خود ان برائیوں سے نہیں چوکتے، اور اگر کبھی اس پر اعتراض ہو تو ٹکسالی جواب یہ ہے کہ سارا معاشرہ جس ڈھپ پر چل رہا ہے ہم اس سے کٹ کر کس طرح رہ سکتے ہیں؟ کیا اس طرزِ عمل کی مثال

بالکل ایسی نہیں ہے کہ کوئی شخص بھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھکر خود اس میں چھلانگ لگادے؟

جب معاشرے میں برائیوں اور گمراہیوں کا چلن عام ہو جائے تو ایسے موقع کے لئے قرآن کریم نے ایک بڑی اصولی ہدایت عطا فرمائی ہے جس سے غفلت کے نتیجے میں ہم موجودہ حالات سے دوچار ہیں، وہ ہدایت قرآن کریم ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ﴾

اے ایمان والو! خود اپنی خبر لو، اگر تم ہدایت کے راستے پر ہو تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں بتائیگا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔

(سورۃ المائدۃ آیت: ۱۰۵)

اس آیتِ کریمہ نے یہ زرّیں حقیقت ارشاد فرمائی ہے کہ دوسروں کی بد عملی تمہاری بد عملی کے لئے وجہِ جواز نہیں بن سکتی، نہ صرف اس کا تذکرہ کردینے سے کوئی مقصد حاصل ہو سکتا ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی خبر لو، اور کم از کم اپنی ذات کی حد تک بداعمالیوں سے پرہیز کرو، اور اپنا سارا زور خود اپنے آپ کو درست کرنے میں خرچ کردو۔ جن برائیوں سے فوراً بچ سکتے ہو ان سے فوراً بچ جاؤ۔ جن سے بچنے کے لئے کسی کوشش اور محنت کی ضرورت ہے، ان کے لئے کوشش شروع کردو، اگر کوئی دوسرا شخص رشوت لے رہا ہے تو کم از کم خود رشوت کے گناہ سے بچ جاؤ، اگر کوئی دوسرا خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے تو کم از کم خود خیانت سے اجتناب کرو، اگر کوئی دوسرا جھوٹ بول رہا ہے تو کم از کم تم سچائی کو اپنا شعار بنالو، اگر کوئی دوسرا حرام خوری میں مبتلا ہے تو کم از کم تم یہ طے کرلو کہ حرام کا کوئی لقمہ میرے پیٹ میں نہیں جائیگا۔

یہی ہدایت ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ میں دی ہے:

,,إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ وَدَعْ عَنْكَ أَمْرَ الْعَامَّةِ،،

جب تم دیکھو کہ لوگ جذبۂ بخل کی اطاعت کر رہے ہیں، اور خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، دنیا کو ہر معاملے میں ترجیح دی جارہی ہے اور ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہے تو ایسے میں خاص طور پر اپنی اصلاح کی فکر کرو، اور عام لوگوں کے معاملے کو چھوڑ دو۔

(سنن ترمذی، کتاب التفسیر، حدیث: ۲۹۸۴، سنن ابی داؤد ۴۳۷۸، سنن ابن ماجہ، ۴۰۰۴)

مطلب یہ ہے کہ ایسے موقع پر عام لوگوں کی برائی کرتے رہنا مسئلے کا کوئی حل نہیں، مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرے، اور اپنے آپ کو ان پھیلی ہوئی برائیوں سے بچانے کے لئے اپنی ساری توانائیاں صرف کردے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

,,مَنْ قَالَ: هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ،،

جو شخص یہ کہتا پھرے کہ لوگ برباد ہو گئے تو درحقیقت اُن سب سے زیادہ برباد خود وہ شخص ہے۔

(صحیح مسلم ,,کتاب البر والصله والاداب،، حدیث: ۴۷۵۵ میں یہ الفاظ ہیں: ,,إذا قال الرجل هلك الناس فهو أهلكهم،،۔ یہی الفاظ سننِ ابی داؤد حدیث: ۴۳۳۱ میں ہیں)

یعنی جو شخص ہر وقت دوسروں کی برائیوں کا راگ الاپتا رہتا ہو، اور خود اپنے عیوب کی پروانہ کرے، وہ سب سے زیادہ تباہ حال ہے، اس کے بجائے اگر وہ اپنی اصلاح کی فکر کرلے، اور اپنے طرز عمل کا جائزہ لیکر اپنی برائیاں دور کرلے تو کم از کم معاشرے سے

ایک فرد کی برائی ختم ہو جائیگی، اور تجربہ یہ ہے کہ معاشرے میں ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے، اور ایک فرد کی اصلاح کسی دوسرے کی اصلاح کا بھی ذریعہ بن جاتی ہے، معاشرہ درحقیقت افراد ہی کے مجموعے سے عبارت ہے، اور اگر افراد میں اپنی اصلاح کی فکر عام ہو جائے تو دھیرے دھیرے پورا معاشرہ بھی سنور سکتا ہے۔

لہذا مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم معاشرے اور اسکی برائیوں کو ہر وقت کوستے ہی رہیں، اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، بلکہ بسا اوقات لوگوں میں مایوسی پھیلتی ہے، اور بد عملی کو فروغ ملتا ہے، اس کے بجائے مسئلے کا حل قرآن و سنت کے مذکورہ بالا ارشادات کی روشنی میں یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے حالات کا جائزہ لے اور اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کی عادت ڈال کر یہ دیکھے کہ اس کے ذمے اللہ اور اس کے بندوں کے کیا کیا حقوق و فرائض ہیں؟ اور کیا وہ واقعۃً ان حقوق و فرائض کو ٹھیک ادا کر رہا ہے؟ معاشرے کی جن برائیوں کا شکوہ اس کی زبان پر ہے، ان میں سے کن کن برائیوں میں وہ خود حصہ دار ہے؟

چونکہ ہم نے کبھی اس نقطہ نظر سے اپنا جائزہ لینے کی کوشش ہی نہیں کی، اس لئے یہ اجمالی بہانہ ہم دن رات پیش کرتے رہتے ہیں کہ چارسو پھیلی ہوئی بدعنوانیوں میں ایک اکیلا شخص کیا کر سکتا ہے؟ حالانکہ اگر انصاف کے ساتھ اس طرح جائزہ لیکر دیکھیں تو پتہ چلے کہ ان گئے گذرے حالات میں بھی ایک اکیلا شخص بہت کچھ کر سکتا ہے، جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ ہماری بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں ایسی ہیں جن کا ہم فوری طور پر تدارک کر سکتے ہیں، اور کوئی نہیں ہے جو اس تدارک کے راستے میں رکاوٹ بن سکے۔

اور بہت سی غلطیاں ایسی ہیں جنکا اگر فوری تدارک ممکن نہیں ہے تو کم از کم ان کی مقدار اور سنگینی میں فوری طور سے کمی کی جاسکتی ہے، اور بہت سی ایسی بھی ہیں جن کی تلافی اور تدارک میں کچھ دشواریاں ہیں، لیکن وہ دشواریاں ایسی نہیں ہیں جو حل نہ ہو سکیں، ان

دشواریوں کودور کرنے کی راہیں سوچی جاسکتی ہیں، آخراسی گئے گذرے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو برائیوں کی اس بھڑکی ہوئی آگ میں بھی اپنا دامن بچا کر زندگی گذار رہے ہیں، ایسے لوگ اپنی پاکباز زندگی کی وجہ سے مرنہیں گئے، وہ بھی اسی معاشرے میں زندہ ہیں، بلکہ اگر حقیقت شناس نگاہ ہوتو بہت اچھی طرح زندہ ہیں۔

لیکن ان ساری باتوں کا احساس اسی وقت جاگ سکتا ہے جب دل میں اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو جائے، اوراس فکر کے نتیجے میں اپنا جائزہ لینے کی عادت پڑ جائے، جس دن ضمیر کی یہ طاقت بیدار ہوگئی اوراسکی آواز سننے کے لئے قلب وذہن کے دریچے کھل گئے اس دن صحیح معنی میں اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ معاشرے کی خرابی کا جو ہوا ہم نے اپنے سروں پر مسلط کر رکھا تھا، اور جس نے ہمیں اپنی صحت کی ہر تدبیر سے روکا ہوا تھا، وہ کتنا بے حقیقت اور کتنا بے وزن تھا؟ بیمار کا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اسے اپنی بیماری کا احساس ہو، اوراس بات کا یقین اس کے دل میں پیدا ہو کہ اسکی بیماری ناقابلِ علاج نہیں ہے، اورآج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اس احساس اوراس یقین سے مسلّح ہوکر اپنی بیماری کا علاج تلاش کرنے کی فکر کریں۔

۷/شوال ۱۴۱۴ھ

۲۰/مارچ ۱۹۹۴ء

اپریل فُول

مغرب کی بے سوچے سمجھے تقلید کے شوق نے ہمارے معاشرے میں جن رسموں کو رواج دیا، انہی میں سے ایک رسم ,,اپریل فُول،، منانے کی رسم بھی ہے، اس رسم کے تحت یکم اپریل کی تاریخ میں جھوٹ بول کر کسی کو دھوکہ دینا، اور دھوکہ دیکر اسے بے وقوف بنانا نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسے ایک کمال قرار دیا جاتا ہے، جو شخص جتنی صفائی اور چابکدستی سے دوسرے کو جتنا بڑا دھوکہ دے، اُتنا ہی اُسے قابلِ تعریف اور یکم اپریل کی تاریخ سے صحیح فائدہ اٹھانے والا سمجھا جاتا ہے۔

یہ مذاق جسے درحقیقت ,,بدمذاقی،، کہنا چاہئے، نہ جانے کتنے افراد کو بلاوجہ جانی اور مالی نقصان پہنچا چکا ہے، بلکہ اس کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں کی جانیں چلی گئی ہیں، کہ انہیں کسی ایسے صدمے کی جھوٹی خبر سنادی گئی جسے سننے کی وہ تاب نہ لاسکے، اور زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

یہ رسم جس کی بنیاد جھوٹ، دھوکے اور کسی بے گناہ کو بلاوجہ بیوقوف بنانے پر ہے، اخلاقی اعتبار سے تو جیسی کچھ ہے، ظاہر ہی ہے، لیکن اسکا تاریخی پہلو بھی ان لوگوں کے لئے انتہائی شرمناک ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تقدس پر کسی بھی اعتبار سے ایمان رکھتے ہیں۔

اس رسم کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس بارے میں مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں،

بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ فرانس میں سترھویں صدی سے پہلے سال کا آغاز جنوری کے بجائے اپریل سے ہوا کرتا تھا، اس مہینے کو رومی لوگ اپنی دیوی وینس (Venus) کی طرف منسوب کر کے مقدس سمجھا کرتے تھے، وینس کا ترجمہ یونانی زبان میں -Aphro dite کیا جاتا تھا، اور شاید اسی یونانی نام سے مشتق کر کے مہینے کا نام اپریل رکھ دیا گیا۔

(برٹانیکا پندرھواں اڈیشن ص: ۲۹۲، ج: ۸)

لہذا بعض مصنفین کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ یکم اپریل سال کی پہلی تاریخ ہوتی تھی، اور اسکے ساتھ ایک بت پرستانہ تقدس بھی وابستہ تھا، اس لئے اس دن کو لوگ جشنِ مسرّت منایا کرتے تھے، اور اسی جشنِ مسرّت کا ایک حصہ ہنسی مذاق بھی تھا جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے اپریل فُول کی شکل اختیار کر گیا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جشنِ مسرت کے دن لوگ ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی نے تحفے کے نام پر کوئی مذاق کیا جو بالآخر دوسرے لوگوں میں بھی رواج پکڑ گیا۔

برٹانیکا میں اس رسم کی ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ۲۱ر مارچ سے موسم میں تبدیلیاں آنی شروع ہوتی ہیں، ان تبدیلیوں کو بعض لوگوں نے اس طرح تعبیر کیا کہ (معاذاللہ) قدرت ہمارے ساتھ مذاق کر کے ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے، لہذا لوگوں نے بھی اس زمانے میں ایک دوسرے کو بے وقوف بنانا شروع کر دیا۔

(برٹانیکا، ص: ۴۹۶، ج: ۱)

یہ بات اب بھی مبہم ہی ہے کہ قدرت کے اس نام نہاد "مذاق" کے نتیجے میں یہ رسم چلانے سے "قدرت" کی پیروی مقصود تھی، یا اس سے انتقام لینا منظور تھا؟

ایک تیسری وجہ انیسویں صدی عیسوی کی معروف انسائیکلو پیڈیا "لاروس" نے بیان کی ہے، اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی بیان کردہ روایات کے مطابق یکم اپریل وہ تاریخ ہے جس میں رومیوں اور یہودیوں کی

طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمسخر اور استہزاء کا نشانہ بنایا گیا، موجودہ نام نہاد انجیلوں میں اس واقعے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، لُوقا کی انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

,,اور جو آدمی اسے (یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کو) گرفتار کئے ہوئے تھے اس کو ٹھٹھے میں اڑاتے اور مارتے تھے، اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس کے منہ پر طمانچے مارتے تھے، اور اس سے یہ کہکر پوچھتے تھے کہ نبوّت (یعنی الہام) سے بتا کہ کس نے تجھکو مارا؟ اور طعنے مار مار کر بہت سی اور باتیں اس کے خلاف کہیں،،

(لُوقا ۲۲: ٦۳ تا ٦۵)

انجیلوں میں ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو یہودی سرداروں اور فقیہوں کی عدالتِ عالیہ میں پیش کیا گیا، پھر وہ انہیں پیلاطس کی عدالت میں لے گئے کہ ان کا فیصلہ وہاں ہوگا، پھر پیلاطس نے انہیں ہیروڈیس کی عدالت میں بھیج دیا، اور بالآخر ہیروڈیس نے دوبارہ فیصلے کے لئے ان کو پیلاطس ہی کی عدالت میں بھیجا۔

لاروس کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک عدالت سے دوسری عدالت میں بھیجنے کا مقصد بھی ان کے ساتھ مذاق کرنا، اور انہیں تکلیف پہنچانا تھا۔ اور چونکہ یہ واقعہ یکم اپریل کو پیش آیا تھا، اس لئے اپریل فُول کی رسم در حقیقت اسی شرمناک واقعے کی یادگار ہے۔

اپریل فُول منانے کے نتیجے میں جس شخص کو بے وقوف بنایا جاتا ہے، اسے فرانسیسی زبان میں Poisson d'avril کہا جاتا ہے جسکا انگریزی ترجمہ April Fish ہے، یعنی اپریل کی مچھلی (برٹانیکا، ص: ۴۹٦، ج: ۱)۔ گویا جس شخص کو بے وقوف بنایا گیا ہے وہ پہلی مچھلی ہے جو اپریل کے آغاز میں شکار کی گئی۔ لیکن لاروس نے اپنے مذکورہ بالا موقف کی تائید میں کہا ہے کہ Poisson کا لفظ جسکا ترجمہ ,,مچھلی،، کیا گیا ہے، در حقیقت اسی سے ملتے جلتے ایک اور فرانسیسی لفظ Posion کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی

,,تکلیف پہنچانے،، اور ,,عذاب دینے،، کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ رسم درحقیقت اس عذاب اور اذیّت کی یاد دلانے کے لئے مقرر کی گئی ہے جو عیسائی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہنچائی گئی تھی۔

ایک اور فرانسیسی مصنف کا کہنا ہے کہ دراصل Poisson کا لفظ اپنی اصل شکل ہی پر ہے، لیکن یہ لفظ پانچ الفاظ کے ابتدائی حروف کو ملا کر ترتیب دیا گیا ہے، جن کے معنی فرانسیسی زبان میں بالترتیب عیسیٰ، مسیح، اللہ، بیٹا اور فدیہ ہوتے ہیں۔[1] گویا اس مصنف کے نزدیک بھی اپریل فُول کی اصل یہی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑانے اور انہیں تکلیف پہنچانے کی یادگار ہے۔

اگر یہ بات درست ہے (لاروس وغیرہ نے اسے بڑے وثوق کے ساتھ درست قرار دیا ہے اور اسکے شواہد پیش کئے ہیں) تو غالب گمان یہی ہے کہ یہ رسم یہودیوں نے جاری کی ہوگی، اور اسکا منشا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تضحیک ہوگی، لیکن یہ بات حیرتناک ہے کہ جو رسم یہودیوں نے (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہنسی اڑانے کے لئے جاری کی، اسے عیسائیوں نے کسی طرح ٹھنڈے پیٹوں نہ صرف قبول کرلیا، بلکہ خود بھی اسے منانے اور رواج دینے میں شریک ہوگئے، اسکی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عیسائی صاحبان اس رسم کی اصلیت سے واقف ہی نہ ہوں، اور انہوں نے بے سوچے سمجھے اس پر عمل شروع کردیا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عیسائیوں کا مزاج و مذاق اس معاملے میں عجیب وغریب ہے، جس صلیب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے خیال میں سولی دی گئی بظاہر قاعدے سے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ ان کی نگاہ میں قابلِ نفرت ہوتی کہ اس کے ذریعے حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسی اذیت دی گئی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی حضرات نے اسے مقدس قرار دینا شروع کردیا، اور آج وہ عیسائی مذہب میں تقدس کی

---

[1] اس تفصیل کے لیے دیکھئے فرید وجدی کی عربی انسائیکلوپیڈیا، دائرۃ معارف القرآن ص: ۲۱ و ۲۲، ج ۱

سب سے بڑی علامت سمجھی جاتی ہے۔

لیکن مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ خواہ اپریل فول کی رسم وینس نامی دیوی کی طرف منسوب ہو، یا اسے (معاذ اللہ) قدرت کے مذاق کا ردِ عمل کہا جائے، یا حضرت مسیح علیہ السلام کے مذاق اڑانے کی یادگار، ہر صورت میں اس رسم کا رشتہ کسی نہ کسی توہم پرستی یا کسی گستاخانہ نظریے یا واقعے سے جڑا ہوا ہے، اور مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ رسم مندرجہ ذیل بدترین گناہوں کا مجموعہ ہے:

(۱) جھوٹ بولنا۔

(۲) دھوکہ دینا۔

(۳) دوسرے کو اذیت پہنچانا۔

(۴) ایک ایسے واقعے کی یاد منانا جس کی اصل یا تو بت پرستی ہے، یا توہم پرستی، یا پھر ایک پیغمبر کے ساتھ گستاخانہ مذاق۔

اب مسلمانوں کو خود فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا یہ رسم اس لائق ہے کہ اسے مسلمان معاشروں میں اپنا کر اسے فروغ دیا جائے؟

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے ماحول میں اپریل فُول منانے کا رواج بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن اب بھی ہر سال کچھ نہ کچھ خبریں سننے میں آہی جاتی ہیں کہ بعض لوگوں نے اپریل فُول منایا، جو لوگ بے سوچے سمجھے اس رسم میں شریک ہوتے ہیں، وہ اگر سنجیدگی سے اس رسم کی حقیقت، اصلیت اور اسکے نتائج پر غور کرینگے تو انشاء اللہ اس سے پرہیز کی اہمیت تک ضرور پہنچ کر رہیں گے۔

۱۴/ شوال ۱۴۱۴ھ

۲۷/ مارچ ۱۹۹۴ء

رزق کا صحیح استعمال

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو اپنے ملنے والوں میں حضرت میاں صاحبؒ کے نام سے معروف تھے) دارالعلوم دیوبند کے ان اساتذہ میں سے تھے جو شہرت اور نام ونمود سے ہمیشہ کوسوں دور رہے، عمر بھر اسلامی علوم کی تدریس کی خدمت انجام دی، اور ہزارہا طلبہ کو اپنے علم وفضل سے سیراب کیا، آج برصغیر ہندو پاک کے نامور علماء دیوبند میں شاید کوئی نہ ہو جو ان کا بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگرد نہ ہو، انہوں نے متعدد چھوٹی بڑی تصانیف بھی چھوڑی ہیں، موضوعات بھی اچھوتے اور زبان بھی اتنی شگفتہ کہ آج سے سو سال پہلے کی تحریروں میں ایسی شگفتگی کم ملتی ہے۔

علم وفضل کے مقامِ بلند کے باوجود سادگی، تواضع اور مسکنت کا عالم یہ تھا کہ دیکھنے والا ان کے سراپا میں اس مقام بلند کا اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا، وہ دیوبند (ضلع سہارنپور) کے ایک چھوٹے سے محلے میں مقیم تھے، اور کچّے مکان میں رہتے تھے۔ ہر سال جب برسات کا موسم آتا تو یہ کچّا مکان جگہ جگہ سے گرجاتا، اور برسات گذرنے کے بعد کافی وقت اور پیسہ اسکی مرمت پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحبؒ کے خاص شاگرد تھے، لیکن خصوصی تعلق کی بنا پر حضرتؒ نے انہیں اپنے آپ سے بہت بے تکلف بھی بنایا ہوا تھا، ایک دن انہوں نے حضرت میاں صاحبؒ سے کہا کہ

آپ کو ہر سال اپنے مکان کی مرمّت کرانی پڑتی ہے، جس میں پریشانی بھی ہوتی ہے، وقت بھی لگتا ہے، اور خرچ بھی خاصا ہو جاتا ہے، اگر آپ ایک مرتبہ مکان کو پکّا بنوالیں تو اس روز روز کی پریشانی سے نجات مل جائے۔

حضرت میاں صاحبؒ کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی، انہوں نے والد صاحبؒ کی یہ تجویز سنکر شروع میں بڑی تعریف و توصیف اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ,,واہ مفتی صاحب واہ! آپ نے کیسی عقل کی بات کہی، ہم نے ساری عمر گذار دی، بوڑھے ہو گئے، اور ابتک ہماری عقل میں یہ بات نہیں آئی،،۔

والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت میاں صاحبؒ نے یہ بات اتنی مرتبہ فرمائی کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا، لیکن بالآخر میں نے عرض کیا کہ ,,حضرت! میرا مقصد تو وہ حکمت معلوم کرنا تھا جس کی وجہ سے آپ نے مالی استطاعت کے باوجود ابتک مکان کو پکّا نہیں بنوایا، اب مجھے مزید شرمندہ کرنے کے بجائے حقیقی وجہ بیان فرمادیجئے،،۔

حضرت میاں صاحبؒ شروع میں طرح دیتے رہے، لیکن جب والد صاحبؒ نے زیادہ اصرار کیا تو والد صاحبؒ کا ہاتھ پکڑ کر مکان کے دروازے تک لے آئے، اور فرمایا: ,,دیکھو! اس گلی کے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھو، گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک کیا کوئی مکان تمہیں پکّا نظر آتا ہے؟،، والد صاحبؒ نے فرمایا نہیں، اس پر میاں صاحبؒ نے فرمایا کہ بتاؤ، جب میرے سارے پڑوسیوں کے مکان کچّے ہیں، تو پوری گلی میں تنہا میں اپنا مکان پکّا بنا کر کیا اچھا لگونگا؟، اور اتنی استطاعت مجھ میں نہیں ہے کہ میں اپنے سارے پڑوسیوں کے مکانات پکّے بنوا سکوں، اس لئے میں اپنا مکان بھی پکّا نہیں بنواتا کہ اپنے پڑوسیوں کے مقابلے میں اپنی کوئی امتیازی شان بنانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

یہ تھے حضرت میاں صاحبؒ، ان کا یہ واقعہ تو میں نے ان کے مزاج و مذاق کا تھوڑا سا تعارف کرانے کے لئے بیان کر دیا جس سے ان کی اس عظمتِ کردار کا تھوڑا سا اندازہ

لگایا جا سکتا ہے جو مادہ پرستی کے اس دور میں انسانی تصور سے بھی ماورا معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل میں ان کا ایک اور واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

ایک مرتبہ میرے والدِ ماجدؒ ان کے گھر ملاقات کے لئے گئے ہوئے تھے، کھانے کا وقت آگیا تو بیٹھک میں دستر خوان بچھا کر کھانا کھایا گیا، کھانے سے فارغ ہونے پر والد صاحبؒ دستر خوان سمیٹنے لگے، تاکہ اسے کہیں جھٹک آئیں، حضرت میاں صاحبؒ نے پوچھا: ,,یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟،، والد صاحبؒ نے عرض کیا کہ ,,حضرت دستر خوان سمیٹ رہا ہوں، تاکہ اسے کسی مناسب جگہ پر جھٹک دوں،، میاں صاحبؒ بولے ,,کیا آپ کو دستر خوان سمیٹنا آتا ہے؟،، والد صاحبؒ نے کہا کہ ''کیا دستر خوان سمیٹنا بھی کوئی فن ہے جسے سیکھنے کی ضرورت ہو؟''، میاں صاحبؒ نے جواب دیا: ,,جی ہاں، یہ بھی ایک فن ہے، اور اسی لئے میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ کام آتا ہے یا نہیں؟،،۔ والد صاحبؒ نے درخواست کی کہ ,,حضرت! پھر تو یہ فن ہمیں بھی سکھا دیجئے،، میاں صاحبؒ نے فرمایا کہ آیئے! میں آپ کو یہ فن سکھاؤں۔

یہ کہہ کر انہوں نے دستر خوان پر بچی ہوئی بوٹیاں الگ کیں، ہڈیوں کو الگ جمع کیا، روٹی کے جو بڑے ٹکڑے بچ گئے تھے، انہیں الگ رکھا، پھر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو برادے کی سی شکل میں پڑے رہ گئے تھے، انہیں چن چن کر الگ اکٹھا کر لیا، پھر فرمایا کہ ''میں نے ان میں سے ہر چیز کی الگ جگہ مقرر کی ہوئی ہے، یہ بوٹیاں میں فلاں جگہ اٹھا کر رکھتا ہوں، وہاں روزانہ ایک بلی آتی ہے، اور یہ بوٹیاں کھا لیتی ہے، ان ہڈیوں کی الگ جگہ مقرر ہے، کتے کو وہ جگہ معلوم ہے، اور وہ وہاں سے آکر یہ ہڈیاں اٹھا لیتا ہے، اور روٹی کے یہ بڑے ٹکڑے میں فلاں جگہ رکھتا ہوں، وہاں پرندے آتے ہیں، اور یہ ٹکڑے ان کے کام آجاتے ہیں، اور یہ جو روٹی کے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں، یہ میں چیونٹیوں کے کسی بل کے پاس رکھ دیتا ہوں، اور یہ انکی غذا بن جاتی ہے''

پھر فرمایا کہ: "یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کا رزق ہیں، ان کا کوئی حصہ اپنے امکان کی حد تک ضائع نہیں ہونا چاہئے"

یہ تھا ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا وہ مزاج و مذاق جو قرآن و سنت کے دلکش رنگ میں ڈھلا ہوا تھا، چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے حساب رزق عطا فرمایا ہوا ہے، اس لئے اس کے چھوٹے چھوٹے اور تھوڑے تھوڑے حصوں کی ہمیں نہ صرف یہ کہ قدر نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات ہم اسکی بے حرمتی تک پر آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن اگر کسی وقت خدانخواستہ اسی رزق کی قلت پیدا ہو جائے تو پتہ چلے کہ ایک ایک ذرّے کی کیا قدر و قیمت ہے؟

کہنے کو سبھی یہ کہتے ہیں کہ رزق کو ضائع نہیں کرنا چاہئے، اسکی قدر کرنی چاہئے، لیکن ہماری آج کی زندگی میں یہ بات محض ایک نظریہ ہو کر رہ گئی ہے جس کا عمل کی دنیا میں کوئی نشان نظر نہیں آتا، ہمارے گھروں میں دعوتوں کے مواقع پر اور ہوٹلوں میں جتنا رزق روزانہ ضائع ہوتا ہے، اگر اس کا مجموعی اندازہ لگایا جائے تو یقیناً وہ سینکڑوں خاندانوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ جس ماحول میں نہ جانے کتنے گھرانے معمولی غذا کو ترس رہے ہوتے ہیں وہاں منوں کے حساب سے اعلیٰ ترین غذائیں کوڑے کرکٹ میں پڑی نظر آتی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار ایک سرکاری عشائیے میں شریک ہوا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈرائیورں کے لئے کھانے کا انتظام ہوگا یا نہیں؟، چنانچہ میں نے بربنائے احتیاط اپنے ڈرائیور کو کھانے کے پیسے دیکر یہ کہدیا تھا کہ اگر یہاں کھانے کا انتظام نہ ہو تو وہ کسی ہوٹل میں کھانا کھالے۔ جب میں اندر پہنچا تو میری میز پر ایک اعلیٰ سرکاری افسر میرے ہمنشین تھے، اور وہ ملک کے غریبوں کی حالتِ زار پر بڑا پردرد لیکچر دے رہے تھے، اس لیکچر میں عوام کی غربت و افلاس پر رنج و غم کا اظہار بھی تھا، اپنے معاشی نظام کی برائیاں بھی تھیں، سوشلسٹ ممالک کی تعریف بھی تھی، اور اپنے ملک

کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، اور سوشلزم کے مخالف عناصر پر تنقید بھی تھی، جب ان کی گفتگو کا یہ موضوع ختم ہو گیا، اور کھانا شروع ہونے پر مختلف باتیں شروع ہو گئیں تو میں نے انہی صاحب سے عرض کیا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ڈرائیوروں کے لئے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے" کہنے لگے ,, جی ہاں! اس سطح کی دعوتوں میں عموماً یہ انتظام نہیں ہوتا،، میں نے عرض کیا کہ "مجھے تو یہ بات بہت بری لگتی ہے کہ ہم یہاں کھانا کھا رہے ہوں، اور ہمارے ڈرائیور باہر بھوکے کھڑے ہوں"۔ اس پر انہوں نے خاصی بے پروائی سے جواب دیا کہ: "جی ہاں! یہ بات ہے تو تکلیف دہ، مگر اتنے سارے ڈرائیوروں کا انتظام بھی تو مشکل ہے، اور یہ لوگ اس بات کے عادی ہیں، وہ بعد میں گھر جا کر کھانا کھا لیتے ہیں"۔

اسی دعوت کے انتظام پر میں پلیٹوں اور ڈونگوں میں بچے ہوئے کھانے کا اندازہ لگایا تو میرا اغالب گمان یہ تھا کہ اس میں تھوڑا سا اضافہ کر کے وہ کھانا تمام ڈرائیوروں کے لئے کافی ہو سکتا تھا، کھانے کے بعد عشائیہ میں تقریروں کا بھی سلسلہ تھا، اور وہ اتنا دراز ہوا کہ ہم گیارہ بجے کے بعد وہاں سے روانہ ہو سکے، راستے میں میں نے اپنے ڈرائیور سے پوچھا کہ تمہارے کھانے کا کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ میں نے اور میرے بعض ساتھیوں نے ایک قریب کے ہوٹل سے کھانا کھا لیا تھا، پھر وہ خود ہی کہنے لگا کہ البتہ بعض ڈرائیوروں کے پاس کھانے کے پیسے بھی نہیں تھے، وہ ابھی تک بھوکے ہیں، مثال کے طور پر اس نے کئی ڈرائیوروں کا ذکر کیا اور کہنے لگا کہ "وہ اب اپنے صاحب کو گھر پہنچا کر بس میں اپنے گھر جائیں گے، اور بارہ ایک بجے پہنچ کر کھانا کھائیں گے"

ایک طرف تو اپنے متعلقین اور ملازمین کے ساتھ (جو در حقیقت گھر ہی کے ایک فرد بن جاتے ہیں) ہماری بے حسی کا عالم یہ ہے، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری اور اضاعت کا حال یہ ہے کہ سیروں کے حساب سے کھانا ہم اپنی پلیٹوں میں اس

طرح بچادیتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے کے لئے قابلِ استعمال نہیں رہتا، اور کوڑے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے، بالخصوص ایسی بوفے دعوتوں میں جہاں کھانا ایک میز سے اٹھا کر خود لے جانا پڑتا ہے، عموماً لوگ ایک ہی دفعہ میں زیادہ سے زیادہ کھانا اٹھا کر محض اس لئے لیجاتے ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت دوبارہ کھانا لانا نہ پڑے، لیکن اس ذرا سی زحمت سے بچنے کے لئے کھانے کی ایک بڑی مقدار بالکل ضائع ہو جاتی ہے۔

ایک طرف حضرت میاں صاحبؒ کے مذکورہ بالا واقعے کا تصور کیجئے کہ انہیں انسانوں سے گذر کر کتے بلّیوں اور پرندوں اور چیونٹیوں کی بھی فکر ہے، اور دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ منوں اور سیروں کے حساب سے کھانا ضائع کر دینا گوارا ہے، مگر ڈرائیوروں اور ملازمین کے لئے کھانے کا انتظام کرنا گوارا نہیں ہے

بہ بیں تفاوت رہ، از کجاست تا بہ کجا؟

کیا ہم تھوڑی سی احتیاط اور دھیان کو کام میں لاکر رزق کی اس بے حرمتی اور اضاعت سے بچنے کا اہتمام نہیں کر سکتے؟ اگر ہم ایسا کرلیں تو کیا بعید ہے کہ اس ذرا سی توجہ کی بدولت مخلوقِ خدا کے کچھ افراد کی بھوک مٹ جائے؟ اور ہم ایک سنگین اجتماعی گناہ سے بچ جائیں۔

۲۱/ شوال ۱۴۱۴ھ
۳/ اپریل ۱۹۹۴ء

اندھیر ہورہا ہے بجلی کی روشنی میں

ہمارے معاشرے میں کھانے پینے کی اشیاء کو جس بے دردی سے ضائع کیا جاتا ہے، وہ رزق کی بے حرمتی کے علاوہ بھوکوں کے منہ سے نوالہ چھیننے کے مترادف ہے۔

رزقِ خداوندی کے بارے میں ہماری یہ لاپروائی صرف کھانے پینے کے اشیاء کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ دوسری اشیاءِ ضرورت کو ضائع کرنا بھی ہمارا ایک اجتماعی روگ بن چکا ہے، اور اسکی وجہ سے بھی ہم طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے وضو کرتے وقت پانی احتیاط کے ساتھ خرچ کرنے کی اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ ایک حدیث[1] میں آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ:

"پانی کو فضول خرچ کرنے سے بچو، خواہ تم کسی بہتے ہوئے دریا کے پاس کھڑے ہو"

ظاہر ہے کہ جو شخص کسی بہتے ہوئے دریا سے وضو کر رہا ہو، اسے پانی کی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اسے بھی پانی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے کی تاکید فرمائی، اس لئے کہ اوّل تو جب ایک شخص کو پانی فضول بہانے کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ پانی کی کمی کے مواقع پر بھی اس فضول خرچی سے باز نہیں رہ سکتا، دوسرے جب کسی قوم کا مزاج یہ بن

---

[1] عن عبدالله بن عمرو ان رسول الله ﷺ مر بسعدٍ و هو يتوضا فقال :ماهذا السرف؟ فقال: افي الوضوء اسراف؟ قال:نعم، و ان كنت على نهر جار. (سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة و سننها، رقم: ٤١٩)

جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بے دریغ بلا ضرورت استعمال کرے تو ایسی قوم کیلئے بہتے ہوئے دریا بھی کافی نہیں ہو سکتے۔

ہمارے ملک کو اللہ تعالیٰ نے جو قدرتی وسائل عطا فرمائے ہیں وہ دنیا کے دوسرے بہت سے ملکوں کے مقابلے میں قابلِ رشک ہیں، لیکن ہم نے اپنی لاپروائی، فضول خرچی، خودغرضی اور بددیانتی کی وجہ سے انہیں اپنے لئے اس طرح ناکافی بنایا ہوا ہے کہ دوسروں کے سامنے ہماری بھیک کا پیالہ ہر وقت پھیلا رہتا ہے۔

آج ہمارا ملک بجلی کی قلت کی وجہ سے شدید مسائل سے دوچار ہے، ملک کا بیشتر حصہ لوڈ شیڈنگ کی زد میں ہے، روزانہ کئی کئی گھنٹے بجلی غائب رہتی ہے، اور اسکی وجہ سے لوگ سخت مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ پنجاب کے متعلقہ حکّام نے اعلان کیا ہے کہ اس سال گرمی کے موسم میں پچھلے تمام سالوں سے زیادہ لوڈ شیڈنگ کرنی پڑیگی، اور جوں جوں گرمی میں اضافہ ہوگا، اسی نسبت سے لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بھی بڑھتا چلا جائیگا۔

ہمارے ملک میں پڑنے والی شدید گرمی کے عالم میں بجلی کا میسر نہ ہونا گرمی کی تکلیف کو دس گنا بڑھا دینے کے مترادف ہے، لیکن بات صرف اس تکلیف کی نہیں، بعض مرتبہ بجلی بعض انسانوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتی ہے، نہ جانے کتنے مریض ہیں جو بجلی کی نایابی کی وجہ سے مناسب علاج کی سہولت سے محروم رہتے ہیں، اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے اسی وجہ سے جان دیدیتے ہیں۔

ایک طرف بجلی کی قلت کا تو یہ عالم ہے، اور دوسری طرف جب کہیں بجلی میسر ہو، تو وہاں اس کے بے محابا اور بے دریغ استعمال کا حال یہ ہے کہ اس میں کہیں کمی نظر نہیں آتی، خالی کمروں میں بلب روشن ہیں، پنکھے چل رہے ہیں، اور بسا اوقات ائیر کنڈیشنر بھی پوری قوت کے ساتھ برسرکار ہیں، دن کے وقت بلا ضرورت پردے ڈال کر سورج کی روشنی کو داخلے سے روک دیا گیا ہے، اور بجلی کی روشنی میں کام ہو رہا ہے، معمولی معمولی بات پر گھروں اور دیواروں

پر چراغاں کا شوق پورا کیا جارہا ہے، جہاں لوگ بجلی کو ترس ترس کرمر رہے ہیں، وہاں رات کے وقت ہاکی اور فٹ بال کھیلنے کیلئے میدانوں میں انتہائی طاقت کی سرچ لائٹیں روشن ہیں، اور بعض میدان تو کھیل کے بغیر بھی انکی روشنی سے بقعۂ نور بنے ہوے ہیں، اور سڑکوں پر روشن اشتہارات (نیون سائنز) روشنی کی کسی حد کے پابند نہیں ہیں۔

بالخصوص جن مقامات پر بجلی کا بل خرچ کرنے والے کو خود ادا نہیں کرنا پڑتا، وہاں تو بجلی کا استعمال اتنی بے دردی سے ہوتا ہے کہ الامان! سرکاری دفتروں میں دن کے وقت بسااوقات بالکل بلاضرورت لائٹیں روشن ہوتی ہیں، اور پنکھے اور ائیر کنڈیشنر اس طرح چل رہے ہوتے ہیں کہ ان کا خرچ بہت آسانی سے کم کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ بعض سرکاری ملازمین اور بہت سے نجی کمپنیوں کے ملازمین کو گھروں پر بھی بجلی کے مفت استعمال کی سہولت حاصل ہوتی ہے، وہاں تو ,,مالِ مفت، دلِ بے رحم،، کی مثال پوری آب وتاب کے ساتھ صادق آتی ہے۔

چند سال پہلے مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا، چین اس وقت دنیا کی ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے، اور رفتہ رفتہ اقتصادی ترقی میں بھی وہ عالمی برادری میں اپنا نمایاں مقام بنارہی ہے، لیکن بیجنگ ائیر پورٹ سے شہر کی طرف جاتے ہوے سڑکوں پر روشنی کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوئی، شروع میں خیال ہوا کہ یہ بیرونِ شہر کا علاقہ ہے، اس لئے معمولی روشنی پر اکتفا کیا گیا ہے، لیکن جب گاڑی شہر میں داخل ہوئی تو وہاں کا منظر بھی کچھ مختلف نظر نہ آیا، سوچا کہ یہ بھی شہر کا کوئی پسماندہ علاقہ ہوگا، لیکن جب ہم شہر کے اس حصے میں پہنچے جسے بیجنگ کا دل کہنا چاہئے تو بھی روشنیوں کا معیار دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، حدتو یہ ہے کہ چانگ ین اسٹریٹ جو دنیا کی سب سے کشادہ شاہراہ سمجھی جاتی ہے، اسکے دونوں طرف بھی بہت معمولی لائٹیں لگی ہوئی تھیں، اس کے بعد میں ایک ہفتے سے زیادہ چین میں رہا، اور اسکے مختلف صوبوں اور شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ صورتِ حال یہی نظر آئی، اشتہارات اور نیون سائن تو خیر سرمایہ دار ملکوں کی خصوصیت ہیں کسی اشتراکی ملک میں ان کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، لیکن پورے ملک

میں مجھے کوئی بھی آرائشی روشنی دکھائی نہیں دی۔

ہم چونکہ کراچی کی جگمگ کرتی ہوئی روشنیوں کے عادی تھے، اس لئے رات کے وقت پورا ملک اندھیرا اندھیرا معلوم ہوتا تھا، ہم نے اپنے میز بانوں سے اپنے اس تأثر کا ذکر کیا تو انہوں نے بڑا معقول جواب دیا، ان کہنا تھا کہ ہمارا ملک بہت بڑا ہے، اور آبادی کے لحاظ سے ہمارے یہاں بجلی کی قلت ہے، لہذا ہم اسی قدر بجلی استعمال کرتے ہیں جتنی ہمارے ضروری کاموں کے لئے ناگزیر ہے، جب تک ہمارے ملک میں بجلی کی پیداوار وافر مقدار تک نہ پہنچ جائے، ہم آرائشی روشنیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

یہ جواب ایک ایسے ملک کے باشندوں کا تھا جو ہم سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے، اور جس کے پاس سرکارِ دو عالم ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی بھی موجود نہیں ہے کہ:

"پانی کو فضول خرچ کرنے سے بچو، چاہے تم کسی بہتے ہوئے دریا کے پاس کھڑے ہو"۔

لیکن اس ارشادِ نبوی ﷺ کی روشنی سے مالا مال ہونے کے باوجود ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں لوڈ شیڈنگ بھی گوارا ہے، اپنے دیہات کو بجلی سے بالکلیہ محروم رکھنا بھی منظور ہے، سسکتے ہوئے مریضوں کو مناسب تشخیص اور علاج کے لئے ترسانا بھی قبول ہے، لیکن نہ ہم چراغاں اور دوسری آرائشی روشنیوں سے دستبردار ہو سکتے ہیں، اور نہ بجلی کے عام استعمال میں کفایت اور بچت کا لحاظ رکھ سکتے ہیں۔

ہماری خود غرضی اور قدرتی وسائل کے ساتھ بے رحمی تو اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ میں نے کئی گھروں میں یہ دیکھا کہ باورچی خانے میں گیس کے چولھے چوبیس گھنٹے مسلسل جلتے رہتے ہیں، اور ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہیں ہوتے، شروع میں میں نے اسے گھر والوں کی بے پروائی پر محمول کیا، لیکن جب ذرا اہمیت کے ساتھ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ چولھے اس لئے بند نہیں کئے

جاتے کہ انہیں دوبارہ روشن کرنے کیلئے ماچس کی ایک تیلی خرچ نہ کرنی پڑے، چونکہ گیس کا بل ہر چولھے پر یکساں آتا تھا، خواہ گیس کم خرچ ہوئی ہو یا زیادہ، اسلئے اس کے مسلسل استعمال سے چولھے کے مالک کا ایک پیسہ بھی زیادہ خرچ نہیں ہوتا تھا، لیکن اگر چولھے کو بند کر کے ضرورت کے وقت دوبارہ جلایا جائے تو اس پر ماچس کی ایک تیلی خرچ ہو جاتی تھی۔

جب میں نے پہلی بار چولھوں کے مسلسل جلنے کی یہ وجہ سنی تو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا، لیکن جب کئی گھرانوں میں یہ منظر آنکھوں سے دیکھا، اور بعض حضرات نے بے جھجک اس صورتِ حال کی یہ وجہ بیان بھی کی تو اندازہ ہوا کہ ہماری خودغرضی کتنی پستی تک پہنچ چکی ہے، اور اپنی ماچس کی ایک تیلی بچانے کے لئے پوری قوم کی دولت کو کس طرح لٹایا جا رہا ہے۔

جن حضرات کو کسی وجہ سے بجلی، گیس یا دوسرے وسائل مفت میسر آتے ہیں، اور ان کے فضول استعمال سے ان کی جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا، وہ صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ فوری طور پر ان کا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا، لیکن اتنی گہرائی میں جانے کی فرصت کسے ہے کہ آخر وہ اسی ملک کے باشندے ہیں جس میں وسائل کی قلت کا رونا رویا جا رہا ہے، اور بالآخر اس فضول خرچی کا نقصان دوسروں کے ساتھ انہیں بھی اٹھانا پڑیگا۔

بجلی اور گیس کا ذکر تو مثال کے طور پر آ گیا، ورنہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کے ساتھ ہماری ناقدری، بے دردی اور خودغرضی کا یہی عالم ہے، پیداوار میں اضافے کی کوششیں اپنی جگہ ہیں، اور یہ کوششیں ضرور جاری رہنی چاہییں، لیکن ان کوششوں کی صحیح منصوبہ بندی حکومت کا کام ہے، اور اگر اسے سیاسی جھمیلوں سے فرصت ملے تو وہی یہ کام ٹھیک ٹھیک انجام دے سکتی ہے، یہ کام ایک ایک شخص کی انفرادی طاقت سے باہر ہے، لیکن ہر شخص کے اپنے بس میں یہ ضرور ہے کہ وہ حاصل شدہ وسائل کو ٹھیک ٹھیک خرچ کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے خرچ پر قابو پا کر قومی دولت کے ضیاع سے پرہیز کرے۔

بجلی ہی کے معاملے کو لے لیجئے، میرے بس میں براہِ راست یہ نہیں ہے کہ میں ملک میں

بجلی کی پیداوار میں اضافہ کردوں، لیکن یہ ضرور میرے بس میں ہے کہ جہاں ایک بلب سے کام چل سکتا ہے، وہاں میں دو بلب نہ جلاؤں، جہاں سورج کی روشنی میسر ہو وہاں کوئی بلب روشن نہ کروں، جہاں ایک پنکھا کارآمد ہوسکتا ہے وہاں دو پنکھے نہ چلاؤں، جہاں ائیر کنڈیشنر کے بغیر گذارا ہوسکتا ہے، وہاں ائیر کنڈیشنر استعمال نہ کروں، جس کسی کمرے میں بلاوجہ روشنی، پنکھا یا بجلی کا کوئی اور آلہ چلتا ہوا دیکھوں، اسے بند کردوں، جہاں چند روشنیوں سے ضرورت پوری ہوجاتی ہو، وہاں دیواروں اور گھروں پر چراغاں نہ کروں، کیا بعید ہے کہ اس طرح جس بجلی کا خرچ میں بچا رہا ہوں، وہ کسی ضرورت مند کے کام آجائے، اس سے کسی مریض کو راحت مل جائے، یا کسی غریب کے ظلمت کدے میں اجالا ہوجائے۔

اگر ہم میں سے ہر فرد اپنے دائرے میں آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرلے کہ ,,بہتے ہوئے دریا کے پاس بھی پانی کے فضول خرچ سے بچو،، تو نہ جانے کتنے انسانوں کے دکھ دور ہوجائیں!

۲۸/شوال ۱۴۱۴ھ
۱۰/اپریل ۱۹۹۴ء

معاملات کی صفائی اور تنازعات

ہمارے معاشرے میں آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کا جو سیلاب اُمڈا ہوا ہے، اس کا تھوڑا سا اندازہ عدالت میں دائر ہونے والے مقدمات سے ضرور ہو سکتا ہے، لیکن یہ اندازہ یقیناً ناکافی اور حقیقت سے بہت کم ہوگا، کیونکہ بیشمار تنازعات وہ ہیں جن کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ عدالت سے رجوع کرنے میں وقت اور پیسے کا جو بے تحاشا صرفہ ہوتا ہے، اسکی وجہ سے بہت سے لوگ عدالت سے رجوع نہیں کر پاتے، اس کے بجائے فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط کی حد تک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور اس طرح عداوت کی آگ بھڑکتے بھڑکتے کئی کئی پشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ان تنازعات کی تہ میں اگر دیکھا جائے تو وہی زر اور زمین کے معروف اسباب کارفرما نظر آتے ہیں، روپیہ پیسہ اور زمین جائیداد کا جھگڑا بڑے بڑے پرانے تعلقات کو دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کر ڈالتا ہے، اور اسکی وجہ سے بڑی بڑی مثالی دوستیاں آن کی آن میں دشمنیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اِس صورتِ حال کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ایک بہت بڑا سبب ,,معاملات،، کو صاف نہ رکھنا ہے، ہمارے دین کی ایک انتہائی زرّیں تعلیم یہ ہے کہ

,,آپس میں رہو بھائیوں کی طرح، لیکن لین دین کے معاملات

اجنبیوں کی طرح کرو،،

مطلب یہ ہے کہ روزمرّہ کی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ ایسا کرو جیسے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ کرنا چاہئے، اس میں ایثار، مروت، رواداری، تحمّل اور اپنائیت کا مظاہرہ کرو، لیکن جب روپے پیسے کے لین دین، جائیداد کے معاملات اور شرکت وحصہ داری کا مسئلہ آجائے تو بہتر تعلقات کی حالت میں بھی انہیں اس طرح انجام دو جیسے دو اجنبی شخص انہیں انجام دیتے ہیں، یعنی معاملے کی ہر بات صاف ہونی چاہئے، نہ کوئی بات ابہام میں رہے، اور نہ معاملے کی حقیقت میں کوئی اشتباہ باقی رہے۔

اگر محبت، اتفاق اور خوشگوار تعلقات کی حالت میں دین کی اس گراں قدر تعلیم پر عمل کر لیا جائے تو بعد میں پیدا ہونے والے بہت سے فتنوں اور جھگڑوں کا سدِّباب ہو جاتا ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں اس اہم اصول کو جس طرح نظر انداز کیا جارہا ہے، اسکے چند مظاہر یہ ہیں:

(۱) بسا اوقات ایک کاروبار میں کئی بھائی یا باپ بیٹے مشترک طور پر ایک ساتھ کام کرتے ہیں، اور کسی حساب وکتاب کے بغیر سب لوگ مشترک کاروبار سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں، نہ یہ بات طے ہوتی ہے کہ کاروبار میں کس کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ کاروبار میں تنخواہ پر کام کررہے ہیں؟ یا کاروبار کے حصہ دار ہیں؟ تنخواہ ہے تو کتنی؟ اور حصہ ہے تو کس قدر؟ بس ہر شخص اپنی خواہش یا ضرورت کے مطابق کاروبار کی آمدنی استعمال کرتا رہتا ہے، اور اگر کبھی کوئی شخص یہ تجویز پیش کرے کہ کاروبار میں حصے یا تنخواہ وغیرہ متعین کرلینی چاہئے تو اسے محبت اور اتفاق کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار کا انجام اکثر وبیشتر یہ ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں ایک دوسرے کے خلاف رنجشیں پرورش پاتی رہتی ہیں، بالخصوص جب

حصہ داروں کے یہاں شادیاں ہو جاتی ہیں تو ہر شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرے نے کاروبار سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، اور مجھ پر ظلم ہوا ہے، اگرچہ ظاہری سطح پر باہم رو رعایت کا وہی انداز باقی نظر آتا ہے، لیکن اندر ہی اندر رنجشوں کا لاوا پکتا رہتا ہے، اور بالآخر جب یہ رنجشیں بدگمانیوں کے ساتھ مل کر پہاڑ بن جاتی ہیں تو یہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے، اور محبت واتفاق کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، زبانی تو تکار سے لیکر لڑائی جھگڑے اور مقدمہ بازی تک کسی کام سے دریغ نہیں ہوتا، بھائی بھائی کی بول چال بند ہو جاتی ہے، ایک بھائی دوسرے کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں رہتا، جس کے قابو میں کاروبار کا جتنا حصہ آتا ہے، وہ اس پر قابض ہو کر عدل وانصاف کا بے دریغ خون کرتا ہے، اور پھر اپنی نجی مجلسوں میں ایک دوسرے کے خلاف بد زبانی اور بدگمانی کا وہ طوفان کھڑا کرتا ہے کہ الاماں!۔

پھر چونکہ سالہا سال تک مشترک کاروبار کا نہ کوئی اصول طے شدہ تھا، نہ کوئی حساب وکتاب رکھا گیا، اس لئے اگر اختلافات پیش آنے کی صورت میں افہام وتفہیم سے کام لینے کی کوشش کی بھی جاتی ہے، تو معاملات کی ڈور الجھ کر اتنی پیچیدہ ہو چکی ہوتی ہے کہ منصفانہ تصفیہ کیلئے اسکا سرا پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے، ہر شخص واقعات کو اپنے مفاد کی عینک سے دیکھتا ہے، اور مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا وضع کرنا بھی سخت مشکل ہو جاتا ہے، جو تمام متعلقہ فریقوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔

یہ سارا فساد اکثر وبیشتر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار کے آغاز میں، یا اس میں مختلف افراد کی شمولیت کے وقت معاملے کو معاملے کی طرح طے نہیں کیا جاتا، اگر شروع ہی سے یہ بات واضح ہو کہ کس شخص کی کیا حیثیت ہے؟ اور کس کے کیا حقوق وفرائض ہیں؟ اور یہ ساری باتیں تحریری شکل میں محفوظ ہوں تو بہت سے جھگڑوں اور بعد میں پیدا ہونے والے پیچیدگیوں کا شروع ہی میں سدِّباب ہو جائے۔

قرآن کریم میں جو آیت سب سے طویل آیت ہے، اس میں اللہ تعالی نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب تم کوئی ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، جب معمولی رقم ادھار دینے پر یہ تاکید ہے تو کاروبار کے پیچیدہ معاملات کو تحریر میں لانے کی اہمیت کتنی زیادہ ہو گی؟

یہ حکم اسی لئے دیا گیا ہے تاکہ بعد میں تنازعات اور اختلافات پیدا نہ ہوں، اور اگر ہوں تو انہیں حق وانصاف کے مطابق نمٹانا آسان ہو۔

لہذا اگر کسی کاروبار میں ایک سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں تو پہلے ہی قدم پر ان میں سے ہر شخص کی حیثیت کا تعین ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر باپ کے کاروبار میں کوئی بیٹا شامل ہوا ہے تو اس کے بارے میں بھی پہلے ہی دن سے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ وہ تنخواہ پر کام کریگا؟ یا کاروبار میں باقاعدہ حصہ دار ہو گا؟ یا محض اپنے باپ کی مدد کریگا؟ پہلی صورت میں اسکی تنخواہ متعین ہونی چاہئے، اور یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ وہ کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہے، اور دوسری صورت میں اگر اسے کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار بنانا ہے تو شرعاً اسکی پہلی شرط تو یہ ہے کہ اسکی طرف سے کاروبار میں کچھ سرمایہ ضرور شامل ہونا چاہئے (جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باپ اسے کچھ نقد رقم ہبہ کر دے، اور وہ اس رقم سے کاروبار کا ایک متعین فی صد حصہ خرید لے) دوسرے یہ بات تحریری طور پر ایک معاہدۂ شرکت کی شکل میں محفوظ کر لینی چاہئے، اور اس معاہدے میں یہ بھی صراحت ہونی ضروری ہے کہ نفع میں کتنا فی صد حصہ کس کا ہو گا؟ تاکہ بعد میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

اگر کسی ایک حصہ دار کو کاروبار میں کام زیادہ کرنا پڑتا ہو تو یہ بات بھی طے ہونی چاہئے کہ آیا وہ یہ زیادہ کام رضاکارانہ طور پر کریگا، یا اس زیادہ کام کا کوئی معاوضہ اسے دیا جائیگا، اگر کوئی معاوضہ دیا جائیگا تو وہ نفع کے فیصد حصے میں اضافہ کر کے دیا جائیگا، یا متعین

تنخواہ کی صورت میں؟ غرض ہر فریق کے حقوق و فرائض اتنے واضح ہونے ضروری ہیں کہ ان میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

اگر بالفرض کسی کاروبار میں اب تک ان باتوں پر عمل نہیں کیا گیا، تو جتنی جلد ہو سکے ان امور کو طے کر لینا ضروری ہے، اور اس معاملے میں کسی شرم، مروت اور طعن و تشنیع کو آڑے نہ آنے دینا چاہئے۔ معاملات کی اس صفائی کو محبت واخوت اور اتحاد واتفاق کے خلاف سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے۔ بلکہ در حقیقت محبت اور اتفاق کی پائیداری ان امور پر منحصر ہے، ورنہ آگے چل کر یہ سطحی محبت دلوں میں عداوت کو جنم دے سکتی ہے، اور اسی لئے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ "رہو بھائیوں کی طرح، لیکن معاملات اجنبیوں کی طرح کرو"۔

(۲) اسی طرح ہمارے معاشرے میں، بالخصوص متوسط آمدنی والے طبقے میں، اپنے ملکیتی مکان کا حصول ایک بڑا مسئلہ ہے، اور عموماً کسی مکان کی تعمیر یا اسکی خریداری خاندان کے کئی افراد مل کر کرتے ہیں، اگر باپ نے کوئی مکان بنانا شروع کیا ہے تو بیٹے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں اپنی رقمیں لگاتے ہیں، لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ یہ رقمیں کچھ سوچے سمجھے بغیر، اور بسا اوقات کوئی حساب رکھے بغیر لگادی جاتی ہیں، یعنی یہ بات طے نہیں ہوتی کہ بیٹا جو رقم مکان کی تعمیر کے لئے دے رہا ہے، آیا یہ باپ کی خدمت میں ہدیہ ہے؟ یا قرض ہے؟ یا وہ مکان کی ملکیت میں حصہ دار بننے کے لئے یہ رقم خرچ کر رہا ہے؟ پہلی صورت میں نہ وہ مکان کی ملکیت کا حصہ دار ہوگا، نہ باپ سے یہ رقم کسی وقت واپس لینے کا حق دار ہوگا، دوسری صورت میں مکان تو تنہا باپ کی ملکیت ہوگا، لیکن دی ہوئی رقم اسکے ذمے قرض سمجھی جائیگی، تیسری صورت میں اپنی لگائی ہوئی رقم کے بقدر وہ مکان کی ملکیت میں بھی شریک ہوگا، اور مکان کی قیمت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسکے حصے کی مالیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض ہر صورت کے تقاضے اور نتائج مختلف ہیں، لیکن چونکہ رقم

لگاتے وقت ان تینوں میں سے کوئی صورت طے نہیں ہوتے، نہ رقموں کا پورا حساب رکھا جاتا ہے، اس لئے آگے چل کر جب مکان کی قیمت بڑھتی ہے تو آپس میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اور خاص طور پر باپ کے انتقال کے بعد جب ترکے کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے، تو یہ اختلافات ایک لا ینحل مسئلے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، ان کی وجہ سے بھائیوں میں چھوٹ چھٹاؤ کی نوبت آجاتی ہے، اور لڑائی جھگڑوں سے خاندان کا خاندان متاثر ہوتا ہے۔

اگر اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے تعمیر کے شروع ہی میں یہ ساری باتیں طے کرلی جائیں اور انہیں تحریری طور پر قلمبند کرلیا جائے تو اس خاندانی فساد کا راستہ بند ہو جائے۔

(۳) جب خاندان کے کسی بڑے کا انتقال ہوتا ہے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جلد از جلد اس کا ترکہ اس کے شرعی وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں شریعت کے اس حکم سے شدید غفلت برتی جاتی ہے، بعض اوقات تو جس کے جو ہاتھ لگتا ہے، لے اڑتا ہے، اور حلال وحرام ہی کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پیش نظر بددیانتی نہیں ہوتی، لیکن ناواقفیت یا لاپروائی کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور اگر مرحوم نے کوئی کاروبار چھوڑا ہے تو اس پر وہی بیٹا کام کرتا رہتا ہے جو مرحوم کی زندگی میں کرتا تھا۔ لیکن یہ طے نہیں کیا جاتا کہ اب کاروبار کی ملکیت کس تناسب سے ہوگی؟ شرعی ورثاء کے حصوں کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟ کام کرنے والے کو اس کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ادا کیا جائیگا؟ ترکے میں کونسی چیز کس کے حصے میں آئیگی؟ بلکہ اگر کوئی شخص ترکے کی تقسیم کی طرف توجہ دلائے بھی، تو اسکی تجویز کو ایک معیوب تجویز سمجھا جاتا ہے، کہ ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ لوگوں کو بٹوارے کی فکر پڑ گئی ہے۔

حالانکہ یہ بٹوارہ شریعت کا حکم بھی ہے، معاملات کی صفائی کا تقاضا بھی، اور اسے نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ گذرنے کے بعد ورثاء کو اپنے اپنے حقوق کا خیال آتا ہے، رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، ترکے کی اشیاء کی قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے، اور چونکہ کوئی بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی، اس لئے اب معاملات الجھ جاتے ہیں، ان کے مناسب تصفیہ میں سخت مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، اور ان سب باتوں کا نتیجہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اگر شریعت کے حکم کے مطابق وقت پر ترکے کی تقسیم عمل میں آجائے اور باہمی رضامندی اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ تمام ضروری باتیں طے پا جائیں تو آئندہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے، اور باہمی محبت و اخوت کو فروغ ملتا ہے۔

یہ تو میں نے صرف تین سادہ سی مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ اگر معاشرے میں پھیلے ہوئے جھگڑوں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو نظر آئیگا کہ معاملات کو صاف نہ رکھنا ہمارے معاشرے کا ایک ایسا روگ بن چکا ہے جس نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ معاملہ، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، صاف ستھرا ہونا چاہئے، اس کی شرائط واضح اور غیر مبہم ہونی چاہئیں، اور اس سلسلے میں کوئی شرم و حیا اور لحاظ و مروت آڑے نہیں آنی چاہئے، جب ایک مرتبہ معاملے کی شرائط اس طرح طے پا جائیں تو اس کے بعد باہمی برتاؤ میں جو شخص جس سے جتنا حسنِ سلوک کر سکے، بہتر ہی بہتر ہے، اور یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ ,,رہو بھائیوں کی طرح، اور معاملات اجنبوں کی طرح کرو،،۔

۱۳/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ

۲۵/ اپریل ۱۹۹۴ء

حقوق وفرائض

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ ہمارے ماضی قریب کی ان شخصیتوں میں سے تھے جنکی مثالیں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں، ان کا اردو ترجمۂ قرآن اور تفسیر مشہور ومعروف ہے، اس کے علاوہ آزادئ ہند کے سلسلے میں ان کی تحریک ریشمی رومال، اور تحریک خلافت میں ان کی سرگرم خدمات ہماری تاریخ کا روشن باب ہیں، وہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے، اور پھر تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں عمر بھر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ,,شیخ الحدیث،، کے منصب پر فائز ہوے، اور ماضی قریب کے بیشمار مشاہیر نے ان کی شاگردی کا اعزاز حاصل کیا۔

جب وہ دارالعلوم دیوبند میں ,,شیخ الحدیث،، کے طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے محسوس کیا کہ اُن کی تنخواہ اُن کے منصب، اُن کے علم وفضل اور انکی خدمات کے لحاظ سے بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، ان کا کوئی اور ذریعۂ آمدنی بھی نہیں ہے، اور ضروریات بڑھتی جارہی ہیں، چنانچہ مجلسِ شوریٰ نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ مولاناؒ کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے، اور اس مضمون کا ایک حکم نامہ مجلس شوریٰ کی طرف سے جاری کردیا گیا۔

جو صاحب مولانا کے پاس مجلس شوری کے فیصلے کی خبر لیکر گئے، انہیں یقیناً یہ امید ہوگی کہ مولانا یہ خبر سن کر خوش ہونگے، لیکن معاملہ برعکس ہوا، مولانا یہ خبر سنکر پریشان

ہوگئے، اور فوراً مجلسِ شوریٰ کے ارکان کے نام ایک درخواست لکھی جس کا مضمون یہ تھا کہ:

"میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ دارالعلوم کی طرف سے میری تنخواہ میں اضافہ کیا جارہا ہے، یہ اطلاع میرے لئے سخت تشویش کا موجب ہے، اس لئے کہ میری عمر کی زیادتی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اب دارالعلوم میں میرے ذمے پڑھانے کے گھنٹے کم رکھے گئے ہیں، جبکہ اس سے پہلے میرے ذمے زیادہ گھنٹے ہوا کرتے تھے۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مجلسِ شوریٰ میری تنخواہ کم کرنے پر غور کرتی، چہ جائیکہ میری تنخواہ میں اضافے پر سوچا جائے۔ لہذا میری درخواست ہے کہ میری تنخواہ بڑھانے کا فیصلہ واپس لیا جائے، اور اوقات کے لحاظ سے تنخواہ کم کرنے پر غور کیا جائے"

آج ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں، اس میں اگر کوئی ملازم اس مضمون کی درخواست اپنی انتظامیہ کے نام تحریر کرے تو اغلب گمان یہی ہوگا کہ اس درخواست کے ذریعہ ملازم نے اپنی انتظامیہ پر بھرپور طنز کیا ہے، وہ اپنی تنخواہ میں اضافے کی مقدار سے نہ صرف یہ کہ مطمئن نہیں ہے، بلکہ اسے انتظامیہ پر یہ سنگین اعتراض ہے کہ اس نے یہ معمولی اضافہ کرکے اسکی توہین کی ہے، لہذا اس نے جلے کٹے لہجے میں یہ طنز آمیز خط تحریر کیا ہے۔

لیکن حضرت شیخ الہندؒ نے جو درخواست لکھی تھی اس میں دُور دُور طنز کا کوئی شائبہ نہیں تھا، وہ واقعۃً یہ سمجھتے تھے کہ تنخواہ میں جو اضافہ ہوگا، شاید وہ ان کے کام کے لحاظ سے دیانۃً درست نہ ہو۔ اس لئے کہ اس ماحول میں ایسے حضرات کی اچھی خاصی تعداد تھی جو اپنے تدریسی اوقات کے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتے تھے کہ یہ ان کا بکا ہوا وقت ہے، جو

کسی اور کام میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں ہر استاد کا معمول تھا کہ اگر اسے مدرسے کے اوقات میں اپنا کوئی ضروری ذاتی کام پیش آجاتا، یا ملازمت کے اوقات میں ان کے پاس کوئی ذاتی مہمان ملنے کے لئے آجاتا تو وہ گھڑی دیکھ کر اپنے پاس نوٹ کر لیا کرتے تھے، کہ اتنا وقت اپنے ذاتی کام میں صرف ہوا، اور مہینے کے ختم پر ان اوقات کا مجموعہ بنا کر انتظامیہ کو از خود درخواست پیش کرتے تھے کہ اس ماہ ہماری تنخواہ سے اتنے روپے کاٹ لئے جائیں، کیونکہ اِتنا وقت ہم نے دوسرے کام میں خرچ کیا ہے۔

یہ ہے اس فرض شناس معاشرے کی ایک ہلکی سی تصویر جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں ہر طرف "حقوق" حاصل کرنے کی صدائیں گونج رہی ہیں، اسی مقصد کے تحت بیشمار ادارے، انجمنیں اور جماعتیں قائم ہیں، اور ہر شخص اپنے حقوق کے نام پر زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کرنے کی فکر میں منہمک ہے، لیکن اس پہلو کی طرف توجہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے کہ حقوق (Rights) ہمیشہ فرائض (Obligations) سے وابستہ ہوتے ہیں، بلکہ درحقیقت انہی سے پیدا ہوتے ہیں، اور جو شخص اپنے فرائض کماحقہٗ ادا نہ کرے، اسکے لئے اپنے متعلقہ حقوق کے مطالبے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کا مزاج یہ ہے کہ وہ نہ صرف ہر فرد کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتی ہیں بلکہ دل میں اصل فکر ہی یہ پیدا کرتی ہیں کہ کہیں مجھ سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی؟ اس لئے کہ ہو سکتا ہے میں اپنی ترکیبوں سے اس کوتاہی کو دنیا میں چھپالوں، اور اسکے دنیوی نتائج سے محفوظ ہو جاؤں، لیکن ظاہر ہے کہ کوئی کوتاہی، خواہ وہ کتنی معمولی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتا۔

جب یہ فکر کسی شخص میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا اصل مسئلہ حقوق کے حصول کے بجائے فرائض کی ادائیگی بن جاتا ہے، پھر وہ اپنے جائز حقوق بھی پھونک پھونک کر وصول کرتا ہے کہ کہیں وصول شدہ حق کا وزن ادا کردہ فریضے سے زیادہ نہ ہو جائے، یہی فکر تھی جس نے شیخ الہندؒ کو وہ درخواست دینے پر مجبور کیا۔

اگر یہ فکر معاشرے میں عام ہو جائے تو سب کے حقوق خود بخود ادا ہونے شروع ہو جائیں۔ اور حق تلفیوں کی شرح گھٹتی چلی جائے، اس لئے کہ ایک شخص کا فریضہ دوسرے کا حق ہے، اور جب پہلا شخص اپنا فریضہ ادا کریگا تو دوسرے کا حق خود بخود ادا ہو جائیگا، شوہر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کے حقوق ادا ہونگے، بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کے حقوق ادا ہونگے، افسر اپنے فرائض بجالائے تو ماتحت کو اسکے حقوق ملیں گے، اور ماتحت اپنے فرائض بجالائے تو افسر کو اس کے حقوق ملیں گے۔ غرض دو طرفہ تعلقات کی خوشگواری کا اصل راز یہی ہے کہ ہر فریق اپنی ذمہ داری محسوس کر کے اس سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برآ ہو، تو دونوں میں سے کسی کو حق تلفی کی کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔

لیکن یہ فکر معاشرے میں اس وقت تک عام نہیں ہو سکتی جب تک اس میں فکرِ آخرت کی آبیاری نہ کی جائے، آج ہم عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے کا زبان سے خواہ کتنا اعلان کرتے ہوں، لیکن ہماری عملی زندگی میں اس عقیدے کا کوئی پر تو عموماً نظر نہیں آتا۔ ہماری ساری دوڑ دھوپ کا محور یہ ہے کہ روپے پیسے اور مال واسباب کی گنتی میں اضافہ کس طرح ہو؟ یہی بات زندگی کا اصل مقصد بن چکی ہے، اور یہی ہماری ساری معاشی سرگرمیوں کا آخری مطمح نظر ہے۔

چنانچہ اگر ہم کہیں ملازمت کر رہے ہیں تو ہماری سوچ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں اضافہ کس طرح کیا جائے؟ اور ملازم کو حاصل ہونے والی دوسری

سہولتیں زیادہ سے زیادہ کس طرح حاصل کی جاسکتی ہیں؟ اس کے لئے ہم انفرادی درخواستوں سے لیکر اجتماعی سوداکاری تک، اور چاپلوسی سے لیکر دھونس دھاندلی تک، ہر حربہ استعمال کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن ہم میں یہ فکر رکھنے والے بہت کم ہیں (گو بحمد للہ نایاب نہیں) کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ ہماری کارکردگی کے لحاظ سے حلال بھی ہے کہ نہیں؟ جب اپنے لئے کچھ وصول کرنے کا وقت آئے تو ہمیں یہ حدیثِ نبوی خوب یاد ہوتی ہے کہ "مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو"، لیکن یہ دیکھنے کی ضرورت ہم میں سے بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں، کہ پسینہ واقعی نکلا بھی ہے کہ نہیں؟

اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقوق کے معاملے میں تو بہت حساس ہیں، لیکن فرائض کے معاملے میں حساس نہیں، اور جب کسی بھی فریق کو اپنے فرائض کی فکر نہ ہو تو اسکا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ سب کے حقوق پامال ہوتے ہیں، معاشرے میں جھگڑوں، تنازعات اور مطالبوں کی چیخ پکار کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا، لوگوں کی زبانیں کھل جاتی ہیں، اور کان بند ہو جاتے ہیں، اور جب ضمیر کو موت کی نیند سلانے کے بعد کوئی کسی کی نہیں سنتا تو لوگ آخری چارۂ کار اسی کو سمجھتے ہیں کہ جس کے جو چیز ہاتھ لگ جائے، لے بھاگے، چنانچہ نوبت چھینا جھپٹی اور لوٹ کھسوٹ تک پہنچ کر رہتی ہے۔

اپنے گردو پیش میں نظر دوڑا کر دیکھیں تو یہی منظر دکھائی دیتا ہے اس سے پریشان ہر شخص ہے، لیکن افراتفری کے اس عالم میں یہ سوچنے سمجھنے کی فرصت بہت کم لوگوں کو ہے کہ یہ صورتِ حال اس وقت تک تبدیل نہیں ہوگی جب تک ہم میں سے ہر شخص فرائض کے احساس کو مقدم نہ رکھے، یا کم از کم فرائض کو اتنی اہمیت تو دے جتنی اپنے حقوق کو دیتا ہے۔

اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کا ایک اور ارشادِ گرامی ہمارے لئے بہترین رہنمائی

فراہم کرتا ہے، بشرطیکہ ہم اس پر عمل کے لئے تیار ہوں، ارشاد ہے:

"اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور اپنے بھائی کے لئے بھی اس بات کو برا سمجھو جسے اپنے لئے برا سمجھتے ہو۔"

اس حدیثِ مبارک نے ہمیں یہ سنہرا اصول بتایا ہے کہ جب بھی کسی دوسرے شخص سے کوئی معاملہ کرنے کی نوبت آئے تو پہلے اپنے آپ کو اس دوسرے شخص کی جگہ کھڑا کر کے دیکھ لو کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے معاملے کی توقع کرتا؟ کونسی بات میرے لئے ناگواری کا موجب ہوتی؟ اور کس بات سے مجھے اطمینان ہوتا؟ بس اب دوسرے شخص کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو اس وقت تمہارے لئے موجب اطمینان ہو سکتا تھا، اور ہر اس بات سے پرہیز کرو جو تمہیں ناگوار ہو سکتی تھی۔

اگر ایک افسر اپنے ماتحت کے ساتھ اپنا رویہ متعین کرتے وقت یہ معیار اپنا لے کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے رویے کو انصاف کے مطابق سمجھتا؟ تو اس کے ماتحت کو کبھی اس سے کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح اگر ماتحت اپنے کام کی نوعیت اور مقدار متعین کرتے وقت اس بات کو فیصلہ کن قرار دے کہ اگر میں اپنے افسر کی جگہ ہوتا تو میں انصاف کے ساتھ کتنے اور کیسے کام کی توقع کرتا؟ تو افسر کو اپنے ماتحت سے کوئی جائز شکایت نہیں ہو سکتی۔

یہ اصول صرف ماتحت اور افسر ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ دنیا کے ہر تعلق میں اتنا ہی مفید اور کارآمد ہے باپ بیٹے، بہن بھائی، میاں بیوی، ساس بہو، دوست احباب، عزیز رشتہ دار، تاجر اور خریدار، حکومت اور عوام، غرض ہر قسم کے باہمی رشتوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے زندگی گذارنے کے لئے دُہرے معیار اپنائے ہوئے ہیں۔ اپنے لئے ہم کسی اور معیار کی توقع رکھتے ہیں، اور اسی کی بنیاد پر دوسروں سے مطالبے کرتے ہیں، اور دوسروں کے لئے ہم نے کوئی اور معیار بنا رکھا ہے، اور ان کے ساتھ معاملہ اسی معیار کے مطابق کرتے ہیں، اگر ہمارے لینے اور دینے کے پیمانے الگ الگ نہ ہوں، بلکہ دونوں

صورتوں میں ہماری سوچ ایک جیسی ہو، تو حق تلفیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہذا ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دلوں میں فرائض کا احساس کس طرح پیدا کیا جائے؟ یہ درست ہے کہ کوئی ایک شخص تن تنہا معاشرے کے مزاج کو ایک دم نہیں بدل سکتا، لیکن وہ خود اپنے مزاج کو ضرور تبدیل کرسکتا ہے، اور اپنے حلقۂ اثر میں اس مزاج کو فروغ دینے کی ممکنہ تدابیر بھی اختیار کرسکتا ہے، کم از کم اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں میں فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے، اور اگر وہ ایسا کرے تو کم از کم ایک گھرانے کو بھٹکنے سے بچا کر سیدھے راستے پر لانے کا کارنامہ اس کے نامۂ اعمال کو جگمگانے کے لئے کافی ہوسکتا ہے، پھر تجربہ یہ ہے کہ نیک نیتی سے انجام دیا ہوا یہ کارنامہ دوسروں پر بھی اپنے اثرات لازماً چھوڑتا ہے، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو اسی طرح رفتہ رفتہ فرد سے گھرانہ، گھرانے سے خاندان، خاندان سے برادری، اور برادری سے پوری قوم تعمیر و ترقی کی راہ پر لگ جاتی ہے، قومیں ہمیشہ اسی طرح بنی ہیں، اور آج بھی ان کے بننے کا یہی طریقہ ہے:

میں تو تنہا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ کچھ ملتے گئے، اور کارواں بنتا گیا

۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
یکم مئی ۱۹۹۴ء

دوہرے پیمانے

قرآنِ کریم نے ناپ تول میں کمی کرنے کو جرمِ عظیم قرار دیکر جس طرح صحیح صحیح ناپنے اور تولنے کا حکم دیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ حکم ایک جگہ بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ اسے بار بار مختلف انداز اور اسلوب سے انتہائی تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل آیاتِ کریمہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

,,اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو،،

(سورۂ انعام:۱۵۲)

,,پس پورا پورا ناپو اور تولو، اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو،،

(سورۂ الاعراف:۸۵)

,,اور ناپ تول میں کمی نہ کرو،، (سورۂ ہود:۸۴)

,,اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا رکھو،،

(سورۂ ھود:۸۵)

,,جب کوئی چیز ناپ کر دو تو پورا پورا ناپو، اور ٹھیک ترازو سے تولو،، (سورۂ بنی اسرائیل:۳۵)

,,پورا پورا ناپو، اور (دوسروں) کو نقصان پہنچانے والے نہ بنو، اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو،،

(سورۂ الشعراء:۱۸۱)

,,اور اللہ نے آسمان کو بلند کیا، اور ترازو بنائی، تا کہ تم تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو، اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو، اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں،، (سورۂ الرحمٰن: ۷)

قرآنِ کریم نے جس صراحت اور جس تاکید کے ساتھ بار بار ناپ تول میں انصاف سے کام لینے پر زور دیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناپ تول میں بے انصافی قرآن کریم کے نزدیک ان بنیادی بیماریوں میں سے ہے جو معاشرتی خرابیوں کی جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور جنہیں مٹانے کے لئے انبیاء کرام (علیہم السلام) دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ناپ تول میں کمی کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو شخص ترازو سے تول کر یا پیمانے سے ناپ کر کوئی چیز بیچ رہا ہو وہ ڈنڈی مار کر سودا کم دے؟ یقیناً ناپ تول میں کمی کرنے کا براہ راست مفہوم یہی ہے لیکن جس اسلوب و انداز سے قرآنِ کریم نے اس برائی کا ذکر فرمایا ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ برائی صرف اسی ایک صورت میں منحصر نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر وہ اقدام شامل ہے جس کے ذریعے کوئی شخص دوسرے کا کسی بھی قسم کا حق پامال کرے، یا انصاف کے مطابق اس کا حق پورا پورا نہ دے۔

دراصل قرآنِ کریم نے ,,ترازو،، کا لفظ عدل و انصاف اور ایفائے حقوق کی ایک علامت (Symbol) کے طور پر استعمال فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۂ شوریٰ اور سورۂ حدید میں ,,ترازو،، کو ,, آسمانی کتاب،، کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے، سورۂ شوریٰ میں ہے:

,,اللہ وہ ہے جس نے حق پر مشتمل کتاب اتاری، اور ترازو (نازل کی)،،

(سورۂ الشوریٰ: ۱۷)

اور سورۂ حدید میں اسی بات کو مزید واضح کر کے فرمایا گیا:

,,اور ہم نے ان (پیغمبروں) کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تا کہ

لوگ انصاف قائم کریں،،   (سورۂ الحدید:۲۵)

اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی پیغمبر اپنے ہاتھ میں وہ ترازو لیکر نہیں آئے جس سے سودا تولا جاتا ہے لہذا یہاں ,,ترازو،، کا واضح مطلب ,,عدل وانصاف،، اور ,,اداء حقوق،، کی معنوی ترازو ہے۔اور ,,کتاب،، کے ساتھ ملاکر,,ترازو،، کاذکر کرکے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر آسمانی کتاب نظریاتی ہدایت فراہم کرتی ہے تو پیغمبر کا قول وفعل لوگوں کے سامنے وہ بچا تُلا پیمانہ پیش کرتا ہے جو حق اور ناحق کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے،اور جس کی روشنی میں حقوق کی رتی رتی کاحساب رکھا جاسکتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناپ تول میں کمی کالفظ ایک بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے،جب بھی کوئی شخص دوسرے کا کوئی حق ٹھیک ادانہ کرے تو وہ,,ناپ تول،، میں کمی کا مرتکب ہے،اور اسکا یہ فعل اُتنا ہی قابلِ نفرت وملامت ہے جتنا سودا بیچتے وقت ڈنڈی مارنے کا عمل،جسے ہر شخص ذلالت اور کمینگی کی علامت سمجھتا ہے،لہذا,,ناپ تول،، کے سلسلے میں قرآنِ کریم کے جوارشادات اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جس کے ذمے دوسرے کا کوئی حق ہو، شوہر کیلئے ان ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ,,بیوی کا حق پورا پورا ادا کرو،،اور بیوی کے لئے ان کا مطلب یہ ہے کہ,,شوہر کا حق پورا پورا ادا کرو،، حکومت کے لئے ان کا مطلب یہ ہے کہ,,عوام کا حق پورا پورا دو،،اور عوام کے لئے ان کا تقاضا یہ ہے کہ,,حکومت کا حق پورا پورا ادا کرو،، ملازم کے لئے ان ارشادات میں یہ ہدایت ہے کہ,,انتظامیہ کی طرف سے جو فرائض تمہارے سپرد کئے گئے ہیں اور جن کے معاوضے میں تمہیں تنخواہ یا اجرت دی جارہی ہے، وہ ٹھیک ٹھیک دیانت داری کے ساتھ بجا لاؤ،، اور انتظامیہ کے لئے ان ارشادات میں یہ تاکید ہے کہ,,ملازم کے وہ تمام حقوق اسے پورے پورے پہنچاؤ جن کے معاوضے میں تم اسکی محنت سے استفادہ کررہے ہو، غرض دنیا میں دوطرفہ تعلقات کا کوئی

شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے ان آیاتِ کریمہ میں جامع رہنمائی موجود نہ ہو۔

پھر قرآنِ کریم ہی نے مزید آگے بڑھ کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ,,ناپ تول میں کمی،، کی بدترین شکل یہ ہے کہ انسان اپنے اور دوسرے کے لئے الگ الگ پیمانے بنالے، یعنی جب کسی کو دینے کا وقت آئے تو ناپ تول میں ڈنڈی مار جائے، لیکن جب خود اپنا حق وصول کرنے کا وقت آئے تو ایک رتی چھوڑنے کو تیار نہ ہو، ایسے لوگوں کے لئے قرآنِ کریم نے انتہائی مؤثر انداز میں یہ وعید بیان فرمائی ہے کہ:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ اَلاَ يَظُنُّ اُولٰئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾

براہو ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں، اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کو ذرا خیال نہیں کہ وہ ایک زبردست دن میں اٹھائے جائینگے اُس دن جب تمام انسان رب العالمین کے حضور کھڑے ہونگے؟ (سورۃ التطفیف: ۱۔۳)

یہاں پھر اگرچہ لفظ ,,ناپ تول،، میں کمی کا استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

,,پورا تولنا اور کم تولنا ہر کام میں ہو سکتا ہے،،۔

لہذا اس آیت میں اصولی مذمت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جنہوں نے زندگی کے معاملات میں دوھرے پیمانے بنا رکھے ہیں، جن کے لینے کا پیمانہ کچھ اور ہے اور دینے کا کچھ اور، جو اپنا مفاد حاصل کرنے میں بڑے تیز طرار اور دوسرے کا حق دینے میں بڑے بخیل اور

خسیس ہیں،اور جودن رات عدل وانصاف کا خون کر کے اپنی دولت کی گنتی میں اضافہ کرتے ہیں، لیکن اس بات کی ذرا پروانہیں کرتے کہ اللہ تعالی کے سامنے پیشی کے وقت دولت کا یہ ظاہری اضافہ ان کے لئے کس ذلت ورسوائی اور کس عذاب کا سبب بنیگا؟

مقامِ حسرت ہے کہ آج ہم نے حقوق وفرائض کی ناپ تول میں اللہ کی اتاری ہوئی ترازو کے بجائے زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں ان خودساختہ ,,دوھرے پیمانوں،، کواختیار کیا ہوا ہے،اوراپنے آپ کوقرآنِ کریم کی اس سنگین وعید کا مستحق بنا رکھا ہے۔

اگر ایک آجر اپنے مزدور سے اس کی آزاد مرضی کے بغیر مقررہ وقت سے زیادہ کام لیتا ہے،اوراس اضافی محنت کا اسے الگ معاوضہ دینے کوتیارنہیں ہوتا تو وہ اپنے اس ,,دوھرے پیمانے،، کی وجہ سے قرآنِ کریم کی اس وعید میں داخل ہے،اوراس طرح اس نے مزدور سے زائد خدمت لیکر جوفائدہ حاصل کیا ہے،وہ اس کے لئے حرام ہے۔

اسی طرح اگرایک مزدور یا ملازم اپنی ڈیوٹی کے مقررہ اوقات میں اپنے فرائض انجام دینے کے بجائے کام چوری کا مظاہر کرتا ہے، یا اس وقت میں کوئی ذاتی کام انجام دیتا ہے، لیکن تنخواہ پوری وصول کرتا ہے تو وہ بھی اس قرآنی وعید کا مصداق ہے، اوراسکی تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہے، جو ذاتی کام میں خرچ کئے ہوے وقت کے مقابل ہو، یہاں تک کہ ایک ملازم کے لئے اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں، جبکہ اسکے پاس اپنی ڈیوٹی سے متعلق کرنے کا کام موجود ہو،کوئی نفلی عبادت، مثلاً نفلی نماز، یا تلاوت وغیرہ بھی جائزنہیں،اس کے ذمے اس وقت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی تندہی اوردیانت داری سے ادا کرے۔

یہ بات قلم پر آئی تو یہ بھی ذکر کردینا مناسب ہے کہ اس معاملے میں بھی ہمارے یہاں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، بعض ملازمین ڈیوٹی کے اوقات میں نفلی عبادتیں شروع کردیتے ہیں، حالانکہ ان کے ذمے کام پڑا ہوا ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف انتظامیہ کے بعض افراد اپنے ملازمین کو پانچ وقت کی فرض نمازوں کی ادائیگی کا بھی موقع نہیں دیتے،

حالانکہ فرض نماز کی ادائیگی بہر صورت ضروری ہے، اور انتظامیہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازمین کے لئے اس کا انتظام کرے، یہ درست ہے کہ ملازم آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا پابند ہے، لیکن طبعی ضروریات کی انجام دہی خود بخود اس مدت سے مستثنیٰ ہے، فرض نماز بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کی طبعی ضروریات، لہذا اسکی ادائیگی کا وقت بھی ڈیوٹی سے خود بخود مستثنیٰ ہوگا، البتہ ملازم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اعتدال کے ساتھ نماز فرض (سنتوں سمیت) ادا کرنے پر اکتفا کرے، اور اس میں ناواجبی دیر نہ لگائے، نہ کسی اور نفلی عبادت میں مشغول ہو۔

یہ بات تو ضمنی طور پر بیچ میں آگئی، کہنا یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے حالات کا جائزہ لیکر یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم اپنا حق پورا لیکر دوسرے کے حق میں کوتاہی کرنے کے مرتکب تو نہیں ہورہے؟ ہم نے اپنے اور دوسروں کے لئے الگ الگ پیمانے تو نہیں بنا رکھے؟ ہم دوسروں سے اس چیز کا مطالبہ تو نہیں کررہے جو انکی جگہ ہونے کی صورت میں انہیں دینے کیلئے تیار نہ ہوتے؟ جب تک یہ فکر ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوگی، اور ہم قرآنِ کریم کی اس وعید میں داخل ہونے سے ڈرنے نہیں لگیں گے، اس وقت تک ان حق تلفیوں اور بدعنوانیوں میں کمی نہیں آئیگی جنہوں نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے، اور جنکی وجہ سے ہر انسان خوف وہراس، تشویش اور بے چینی کا شکار ہے، کیونکہ جب معاشرے میں حق تلفیوں کا بازار گرم ہوتا ہے تو اسکا صافی نتیجہ (Net result) سب کی پریشانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، ایک شخص اگر دس آدمیوں کی حق تلفی کرتا ہے تو دوسرے دس آدمی اسکا حق اڑالے جاتے ہیں، اور آخر میں فتح صرف شیطان کی ہوتی ہے۔

۲۶/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ

۸/ مئی ۱۹۹۴ء

مبارک ہو

,,مبارک ہو،، ایک ایسا جملہ ہے جو ہم دن رات بیشمار مواقع پر استعمال کرتے ہیں، شادی بیاہ ہو یا خوشی کی دوسری تقریبات، بچے کی ولادت ہو یا عقیقہ، امتحان میں کامیابی ہو یا ملازمت کا حصول، کوئی تجارتی فائدہ حاصل ہوا ہو، یا کوئی عہدہ ومنصب، غرض ہر خوشی کے موقع پر یہ جملہ بے ساختہ زبانوں پر آتا ہے، اور اسی کے ذریعے دوسرے کی خوشی میں اپنی شرکت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

لیکن یہ جملہ اتنی کثرت سے ایک رسمی جملے کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے کہ اب وہ اپنی معنوی اہمیت کھو بیٹھا ہے، اور اب ہمیں اس کا صرف محلِ استعمال یاد رہ گیا ہے، اس کے ٹھیک ٹھیک معنی یاد نہیں رہے، یا کم از کم ان کا دھیان نہیں رہا۔

,,مبارک ہو،، درحقیقت ایک دعا ہے، اور اسکا مفہوم یہ ہے کہ خوشی کا جو سبب تمہیں حاصل ہوا ہے، اللہ تعالی اس میں برکت عطا کرے۔

,,برکت،، کیا چیز ہے؟ آج مادّی اسباب ووسائل کی اُدھیڑ بن میں اس سوال کا جواب اتنا دھندلا گیا ہے کہ بہت کم لوگ اس سے واقف رہ گئے ہیں، اس لئے اسکی تشریح کے لئے تھوڑی سی تفصیل اور وضاحت درکار ہے۔

اس دنیا میں راحت وآرام کے جتنے مادی وسائل کی تلاش میں ہم دن رات سرگرداں ہیں، وہ راحت وآرام کے وسائل واسباب ضرور ہیں، لیکن بذاتِ خود راحت

و آرام نہیں ہیں، خواہ وہ روپیہ پیسہ ہو، زمین جائیداد ہو، کوٹھی بنگلے ہوں، نوکر چاکر ہوں، کاریں اور ہوائی جہاز ہوں، بیوی بچے اور عزیز رشتہ دار ہوں، یہ سب چیزیں راحت و آرام یا سکون واطمینان حاصل کرنے کا ذریعہ تو ہیں، لیکن ان میں لازمی طور پر ہمیشہ آرام پہنچانے اور سکون عطا کرنے کی بذاتِ خود طاقت نہیں ہے، لہذا یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کو یہ تمام چیزیں میسر ہوں، اسے ہر حال میں ان کا آرام ضرور نصیب ہو، کتنے لوگ ہیں جن کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل ہے، جو عالی شان کوٹھیوں میں رہتے اور پر شکوہ کاروں میں سفر کرتے ہیں، لیکن ان تمام اسباب راحت کے باوجود انکی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے تو انہیں آرام و سکون میسر نہیں، وہ کسی ایسے کرب میں مبتلا ہیں جس نے مال و دولت کے ان تمام مظاہر کو ان کے حق میں بیکار بنا کر رکھ دیا ہے۔

ایک شخص کے دستر خوان پر انواع واقسام کے قیمتی کھانے چنے ہوئے ہیں، تازہ اور لذیذ پھلوں کا انتخاب مہیا ہے، صاف ستھرے برتن سجے ہوئے ہیں، ماحول پر کیف خوشبو سے معطر ہے، تو لذت کے سارے اسباب بظاہر موجود ہیں، لیکن اگر اس کا معدہ خراب ہے تو لذت کے یہ سارے اسباب مل کر بھی اسے لذت عطا نہیں کر سکتے، یا اگر معدہ بھی ٹھیک ہے، لیکن کوئی شدید ذہنی پریشانی لاحق ہے جس نے بھوک اڑا رکھی ہے، تو یہ تمام لذیذ کھانے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، اور اسے لذت کی نعمت عطا نہیں کر سکتے۔

ایک شخص کے پاس رہنے کا عالی شان مکان ہے، اسکی خوابگاہ آرام وراحت کے جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ ہے، انتہائی دلکش مسہری پر نرم و گداز بستر بچھا ہوا ہے، گرمی کو دور کرنے کے لئے کمرے میں ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے، لیکن جب وہ اس خواب آور ماحول میں پہنچ کر بستر پر لیٹتا ہے تو نیند غائب ہے، ہزاروں جتن کرنے کے بعد بھی وہ سو نہیں سکتا، اور ساری رات بستر پر کروٹیں بدل کر گذار دیتا ہے، اس شخص کے پاس آرام

و آسائش کے ظاہری اسباب پوری طرح موجود تھے، لیکن اسے آرام نہ مل سکا، اور پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑی۔

دوسری طرف ایک محنت کش مزدور یا کسان ہے، وہ چار پانچ گھنٹے کی مشقت اٹھانے کے بعد جب کھانے کے لئے اپنی گٹھڑی کھولتا ہے، تو بظاہر اسمیں صبح کی پکی ہوئی معمولی ساگ روٹی ہے، لیکن اسکا معدہ صحت مند اور اسکی بھوک بھرپور ہے، اسے یقیناً اس بھوک کے عالم میں ساگ روٹی سے وہ لذت حاصل ہو جاتی ہے جو بیمار معدے کے دولت مند شخص کو انواع و اقسام کے کھانوں میں نصیب نہ ہو سکی، پھر جب رات کے وقت وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنی کھردری چارپائی پر پہنچتا ہے تو نیند سے اسکی آنکھیں بوجھل ہیں، اور وہ اس ننگی چارپائی پر لیٹتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اور آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لیکر صبح کو چاق و چوبند اٹھتا ہے، اس کے پاس نہ مسہری تھی نہ گداز بستر تھا، نہ ائیر کنڈیشنڈ کمرہ تھا، نہ روم اسپرے کی مہک تھی، لیکن اس کھرّی چارپائی پر بھی اسے وہ راحت میسر آگئی جو اس دولت مند کو ائیر کنڈیشنڈ خوابگاہ میں بھی میسر نہیں آئی تھی۔

اس قسم کی دسیوں مثالیں روزمرہ ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں جن میں ایک شخص لذت اور راحت کے سارے اسباب سے لیس ہونے کے باوجود لذت اور راحت سے محروم ہوتا ہے، اور دوسرا شخص بہت معمولی ساز و سامان کے باوجود اس سے کہیں زیادہ ذہنی سکون اور اطمینان سے سرشار۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں راحت و آسائش کے جتنے وسائل ہیں ان سے واقعۃً لذت اور راحت حاصل ہونا کچھ ایسے عوامل پر موقوف ہے جو انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہیں، انسان روپیہ خرچ کر کے راحت کے اسباب تو خرید سکتا ہے، لیکن وہ عوامل پیسے سے نہیں خریدے جا سکتے، جنکی وجہ سے ان اسباب میں حقیقی راحت و آرام عطا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

انسان دن رات ایک کر کے دولت کما سکتا ہے، بنگلے بنا سکتا ہے، کاریں خرید

سکتا ہے، ملیں کھڑی کر سکتا ہے، لیکن ان چیزوں سے حقیقی لطف اور واقعی آرام حاصل کرنے کے لئے جو صحت درکار ہے جن پر سکون گھریلو تعلقات کی ضرورت ہے، اور جو ذہنی سکون ناگزیر ہے، وہ نہ تو روپے پیسے کے بل پر حاصل کیا جا سکتا ہے، نہ اسے کوئی مشین تیار کر سکتی ہے، وہ کلّی طور پر انسان کی حدودِ اختیار سے ماوراء ہے، وہ خالصۃً اللہ تعالی کی عطا ہے، اور اس عطا میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ اگر چاہے تو پھونس کے جھونپڑے کو جنت بنادے، اور اگر چاہے تو یہ چیزیں سلب کر کے عالیشان محل کو انگاروں کے فرش میں تبدیل کر دے۔

اللہ تعالی کی یہ عطا جو بلا شرکتِ غیرے اسی کے قبضہء قدرت میں ہے، اسی کا نام ,,برکت،، ہے، یہ ,,برکت،، حاصل ہو تو تھوڑی چیز بھی کافی ہو جاتی ہے، اور اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ,,برکت،، مفقود ہو تو دولت کے ڈھیر بھی انسان کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اسی ,,برکت،، کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر دنیا کے کسی سازو سامان سے وقتی طور پر کچھ راحت مل بھی رہی ہے تو اس کا انجام بھی بخیر ہو، اگر ایک ڈاکو لاکھوں روپیہ لوٹ کر تین دن تک خوب مزے اڑائے اور چوتھے دن جیل میں پہنچ جائے تو وہ تین دن کے مزے کس کام کے؟ لہذا دنیا کا ہر لطف، لذت اور آرام اسی وقت قابلِ قدر ہے جب اس کا انجام کسی بڑی تکلیف کی صورت میں ظاہر نہ ہو، اور ,,برکت،، کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے۔

اب ,,برکت،، دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہوئی، ایک یہ کہ راحت کا جو ظاہری سبب ہمیں نظر آرہا ہے، وہ واقعۃً لذت یا آرام پہنچائے، اور کوئی ایسی حالت پیدا نہ ہو جو اس کا مزہ کرکرا کر ڈالے، اور دوسرے یہ کہ اس کا انجام بھی بخیر ہو، اور اس سے حاصل ہونے والی ظاہری لذت یا آرام کا نتیجہ خراب نہ ہو۔

لہذا جب کسی کو خوشی کا کوئی سبب حاصل ہوتا ہے، اور ہم اسے مبارکباد دیتے ہیں تو

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوشی کے اس سبب میں برکت پیدا کرے، یعنی وہ تمہارے لئے حقیقی خوشی اور راحت کا باعث بنے، اور بالآخر دنیا اور آخرت میں اس کا انجام بھی درست ہو۔

جب کسی کی شادی کے موقع پر ہم اس سے کہتے ہیں کہ "مبارک ہو" تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ تم نے اپنی سی کوشش کر کے اپنے لئے بہتر رشتہ ڈھونڈا ہے، لیکن اس رشتے کی کامیابی کچھ ان دیکھے حالات پر موقوف ہے جو ہمارے تمہارے اختیار سے باہر ہیں، اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، ہم اسی سے دعا کرتے ہیں کہ یہ رشتہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ثابت ہو۔

جب کوئی شخص گاڑی خریدتا ہے اور ہم اسے مبارکباد دیتے ہیں تو اسمیں یہ اعتراف پنہاں ہے کہ یہ گاڑی اگرچہ بظاہر آرام دہ ہے، لیکن یہ بات آنے والے غیر اختیاری حالات ہی بتا سکتے ہیں، کہ یہ واقعی آرام پہنچائیگی یا روز روز گیرج میں کھڑی رہ کر ایک نیا دردِ سر پیدا کریگی، یہ غیر اختیاری حالات چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اس لئے اسی سے دعا ہے کہ وہ اس گاڑی میں برکت پیدا کر کے حالات کو ایسا سازگار بنادے کہ یہ گاڑی واقعی تمہیں آرام پہنچائے، اور اسکا انجام بھی بخیر ہو۔

اِس تشریح سے یہ بات واضح ہوئی ہوگی کہ مبارکباد کے ہر فقرے میں ہم ہر بار یہ اعتراف کرتے ہیں کہ دنیا کے ہر آرام دہ ساز و سامان اور خوشی کے ہر واقعے میں اصل اہمیت "برکت" کو حاصل ہے، وہ ہے تو سب کچھ ہے، اور وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ "برکت" کا حصول ہمارے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ لیکن چونکہ مبارکباد کے فقرے ہم صرف ایک رسم پوری کرنے کے لئے بے سوچے سمجھے بولتے رہتے ہیں اس لئے ان جیتے جاگتے حقائق کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا، اور "مبارکباد" کا فقرہ در حقیقت "برکت" کی جس اہمیت کا

اعتراف ہے، اپنی عملی زندگی میں ہم نے ,,برکت،، کو اتنا ہی غیر اہم قرار دے رکھا ہے، چونکہ ,,برکت،، ایسی چیز نہیں جو گنتی میں آسکے، یا جسے مادی پیمانوں سے ناپا جا سکے، اس لئے ہماری ساری دوڑ دھوپ راحت ولذت کے اسباب حاصل کرنے پر تو صرف ہو رہی ہے، لیکن ان اسباب میں ,,برکت،، پیدا ہونے کی طرف ہمیں مطلق توجہ نہیں، اگر ہوتی تو ہم یہ سوچے بغیر نہ رہتے کہ جب ,,برکت،، خالصۃً اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے تو وہ ایسے ساز وسامان میں کیسے پیدا ہو سکتی ہے جو اُس کی نافرمانی کرکے حاصل کیا گیا ہو، جس سے اس کے بندوں کے حقوق پامال ہوے ہوں، اور جس کی بنیاد ہی ظلم اور ناانصافی پر اٹھی ہو؟

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مال ودولت اور ساز وسامان کی گنتی بڑھانے میں دن رات منہمک ہیں، لیکن یہ حساب لگانے کی ہمیں فرصت نہیں کہ گنتی کے اس اضافے نے حقیقی راحت میں کتنا اضافہ کیا؟ اگر ایک شخص دوسروں کے حقوق پامال کرکے یا رشوت کا گناہِ عظیم اپنے سر لے کر دس بیس ہزار روپے گھر لے آیا تو وہ اس بات پر مگن ہے کہ میں نے اپنی دولت میں اضافہ کرلیا، لیکن اگر چند ہی دنوں کے عرصے میں حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ اس سے زیادہ روپے کسی ہسپتال کا بل ادا کرنے یا کسی مقدمہ بازی میں خرچ کرنے پڑے تو یہ حساب کوئی نہیں لگاتا کہ انجام کار مجھے دردسری کے سوا کیا ملا؟ اور اگر میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر یہ رقم نہ لاتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ میری حلال کمائی کے تھوڑے پیسوں سے ہی مجھے وہ راحت مل جاتی جو اس بڑی رقم سے نہیں مل سکی۔

بعض مرتبہ دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم تو بہت سے ظالم اور بددیانت لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ بڑے مزے کی زندگی گذار رہے ہیں، اور ظلم اور بددیانتی نے ان کی لذت وراحت میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن اول تو بسا اوقات یہ بات سوچتے وقت ہم ایک بار پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ اسبابِ راحت ہی کو راحت سمجھ بیٹھتے ہیں، یعنی کسی بددیانت شخص کا شاندار بنگلہ، خوبصورت کار اور رہنے بسنے کا قیمتی سامان دیکھ کر یہ

فرض کر لیتے ہیں کہ وہ بڑے مزے میں ہوگا۔ حالانکہ لذت وراحت تو درحقیقت ایک اندرونی کیفیت کا نام ہے جس کا سُراغ کوٹھی بنگلے سے نہیں لگایا جا سکتا، جب تک کوئی شخص اس کے سینے میں اتر کر نہ دیکھے اسے ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چل سکتا کہ اس کے دل پر کیا گذر رہی ہے؟ دنیا بھر میں خودکشی کرنے والوں کا اوسط ان گھرانوں میں زیادہ ہے جو کھاتے پیتے کہلاتے ہیں، اور جن کے پاس اسباب راحت کی کوئی خاص کمی نہیں ہے، خود میرے ذاتی تجربے میں ایسی ان گنت مثالیں ہیں کہ محفلوں میں قہقہے لگانے والے دولت مند افراد نے جب تنہائی کے وقت اپنا دل میرے سامنے کھول کر رکھا تو وہ دکھوں سے چور اور زخموں سے چھلنی تھا۔

دوسرے یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ,,برکت،، کے مفہوم میں صرف وقتی راحت ہی داخل نہیں، بلکہ اس راحت کا انجام بخیر ہونا بھی ضروری ہے، لہذا اگر کسی بد دیانت شخص کو بالفرض وقتی راحت میسر آ بھی جائے تو بالآخر اسکا انجام کبھی درست نہیں ہوسکتا، اکثر تو بددیانتی کی سزا اِس دنیا ہی میں مل جاتی ہے، اور اس بری طرح ملتی ہے کہ وہ راحت اسکے آگے کالعدم ہو جاتی ہے، بعض اوقات انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں اپنے کس فعل کی سزا بھگت رہا ہوں، لیکن درحقیقت اسکی زندگی میں آنے والے مصائب خود اسی کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں، اور بالآخر آخرت میں تو ظلم وزیادتی کی سزا ملنی ہی ملنی ہے جس سے کوئی مفر ممکن نہیں، جب تک ظلم وتکبّر کا نشہ چڑھا ہوا ہے، انسان اپنے انجام سے غافل ہے، لیکن جس روز موت دروازے پر دستک دے کر یہ نشہ اتار دیگی تو آنکھیں بند ہوتے ہی وہ دہکتے ہوے انگارے نظر آ جائیں گے جنہیں دولت کے ڈھیر سمجھ کر وہ ان کی خاطر حق وانصاف کا خون کرتا رہا، قرآنِ کریم نے یہی حقیقت ان الفاظ میں یاد دلائی ہے کہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا﴾

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ نگل رہے ہیں، اور یقیناً وہ دہکتی آگ میں داخل ہو کر رہیں گے۔

۳/ ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ
۱۵/ مئی ۱۹۹۴ء

چار پیسے کا فائدہ

ہمارے ایک تاجر دوست نے ایک مرتبہ یہ لطیفہ سنایا کہ ایک شخص دن رات اپنے کاروبار میں اتنا منہمک تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے سوا کوئی اور فکر نہ تھی، جب اس کا انتقال ہوا تو فرشتوں نے پوچھا کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ جنت میں یا جہنم میں؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا ,,جہاں چار پیسے کا فائدہ ہو، وہاں بھیج دو،،۔

یہ لطیفہ ہے تو یقیناً گھڑا ہوا، لیکن اس خاص ذہنیت اور مزاج کی تصویر ہے جس کے نزدیک اس کائنات میں پیسے سے بڑی کوئی چیز نہیں جس کے ہر ہر قول و فعل، نقل و حرکت، اور انداز و ادا کا مقصد پیسے میں اضافہ کرنا ہے، اور جس کام کے نتیجے میں پیسہ حاصل نہ ہو، یا کوئی معاشی فائدہ نہ ملے، وہ کام قطعی بیکار ہے، اور اس کے پیچھے اپنی توانائی خرچ کرنا حماقت ہے۔

کچھ عرصے سے اسلامی عبادتوں کے بارے میں بھی بعض لوگ اسی ذہنیت سے سوچنے لگے ہیں، یعنی اسلام میں جو عبادتیں فرض یا واجب قرار دی گئی ہیں، یا جنہیں مسنون یا مستحب قرار دیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک میں انہوں نے مادی اور معاشی فوائد کی تلاش شروع کر دی ہے، اگر کسی عبادت میں کوئی معاشی یا کسی اور نوعیت کا مادی فائدہ نظر آ گیا تو یہ حضرات نہ صرف خوش ہوتے ہیں، بلکہ اسی مادی فائدے کو عبادت کا اصل مقصد قرار دیدیتے ہیں، اور اگر کسی عبادت میں کوئی معاشی یا مادی فائدہ نظر نہ آیا تو نہ

صرف یہ کہ خود اسے انجام نہیں دیتے، بلکہ یہ بات تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیتے ہیں کہ وہ کوئی عبادت ہے، قرآنِ کریم نے اسی طرز عمل کی طرف بڑے بلیغ انداز میں اشارہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾

لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو ایک کنارے کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اگر (عبادت سے) انہیں کوئی فائدہ پہنچ گیا تو مطمئن ہو گئے، اور اگر انہیں کسی آزمائش سے سابقہ پڑ گیا تو (عبادت سے) منہ موڑ لیا، ایسے لوگوں نے دنیا اور آخرت دونوں کا نقصان کیا۔ (سورۃ الحج: ۱۱)

اسی بناء پر بعض حضرات اس قربانی کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں جو عید الاضحیٰ کے موقع پر انجام دی جاتی ہے، انہیں چونکہ اس عمل میں کوئی معاشی فائدہ نظر نہیں آتا، اس لئے وہ یہ باور نہیں کر پاتے کہ ایک ایسا عمل جو کسی نظر آنے والے معاشی یا مادی فائدے سے خالی ہو، عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اسلام اس کی طرف کس طرح دعوت دے سکتا ہے؟ ایسے حضرات یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اگر ,,قربانی،، میں کوئی معاشی فائدہ ہونا ضروری ہے تو وہ ,,قربانی کیا ہوئی؟ یہ سالانہ قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جس قربانی کی یادگار ہے، اس میں کونسا معاشی یا مادی فائدہ تھا؟ ایک باپ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دو، بیٹا بھی کونسا؟ امنگوں اور مرادوں سے مانگا ہوا، جس نے ابھی بلوغ کی منزل بھی طے نہیں کی، باپ نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ میرے معصوم بچے کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟ وہ تو ابھی کسی جرم کے ارتکاب کے بھی لائق نہیں۔

پھر باپ نے بیٹے کو بھی بتایا کہ خواب کے ذریعے یہ صبر آزما واقعہ مجھے دکھایا گیا ہے، بیٹا نا بالغ تھا، مگر جانتا تھا کہ پیغمبر کا خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا، اس نے بھی یہ سوال نہیں کیا کہ میرا کیا جرم ہے جسکی سزا میں مجھے ذبح کیا جائیگا، اور آخر اس حکم میں حکمت و مصلحت کیا ہے؟

آخر میں ہوا کیا؟ یہ الگ بات ہے، لیکن جب اللہ تعالی کی طرف سے حکم ملا تو اس وقت باپ اور بیٹا دونوں اس کا یہی مطلب سمجھے تھے کہ باپ کے ذمے فرض کیا گیا ہے کہ وہ بیٹے کو ذبح کرے، یعنی ایک ایسا عمل کرے جو نہ صرف بے فائدہ ہے، بلکہ عام حالات میں قانوناً اور اخلاقاً ہر اعتبار سے انتہائی سنگین جرم ہے، لیکن چونکہ یقین تھا کہ یہ اللہ تعالی کا حکم ہے اس لئے اسکی حکمت و مصلحت پوچھنا بندگی کے خلاف تھا، چنانچہ باپ بیٹے دونوں حکم کی تعمیل پر کمربستہ ہو گئے، دونوں اس جذبے سے سرشار تھے کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شاعروں نے تو یہ کہہ کر شاعری کی ہے کہ ؎

نہ بود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہ کہ ؎

متاعِ جان کو سنبھالے رہیں خرد والے
ہم ابتدائے سفر ہی اسی زیاں سے کریں

لیکن عشق و محبت اور بندگی کے اس آخری درجے پر جیتے جاگتے عمل کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے نے دکھایا۔

اس عظیم قربانی کی یادگار میں ایک مسلمان سے جان نہیں، مال کا ایک حصہ مانگا

گیا ہے، اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ صاحب استطاعت ہو۔ اب اگر وہ اس ادنیٰ سے مطالبہ پر بھی یہ سوال کرے کہ اس قربانی میں میرا معاشی فائدہ کیا ہے؟ تو اس سے اِس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

تو بہ یک زخمے گریزانی زعشق؟
تو بجز نامے، چہ می دانی زعشق؟

بات دراصل یہ ہے کہ اسلام کی مقرر کی ہوئی بہت سے عبادتوں میں یقیناً کچھ جسمانی، معاشرتی یا معاشی فوائد بھی ہیں، مثلاً نماز کی پابندی سے جسمانی ورزش بھی ہو جاتی ہے، اور جماعت کی نماز سے نظم وضبط پیدا کرنے میں بھی مدد ملتی ہے، لیکن یہ فوائد ان عبادتوں کے ضمنی اور ثانوی فوائد ہیں، ان کا اصل مقصد نہیں ہیں، لہٰذا یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ نماز کا اصل مقصد صحت برقرار رکھنا ہے، اور وہ جسمانی ورزش کی غرض سے فرض کی گئی ہے، حقیقت میں نماز اور دوسری تمام عبادتوں کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور اسکی رضا جوئی ہے، اور ان کے ذریعے انسان کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے آگے بے چون وچرا سرخم کرنے کا عادی بنے، اس میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جانے کے بعد وہ اپنی بڑی سے بڑی خواہش اور بڑے سے بڑے ذاتی مفاد کو اس حکم پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوگا، اسی جذبے کا نام بندگی ہے، جب تک یہ جذبہ پیدا نہ ہو، اس وقت تک بندگی صرف ایک دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اسی لئے بعض عبادتیں ایسی بھی رکھی گئی ہیں جن کا ظاہری اسباب کے لحاظ سے کوئی خاص مادی یا معاشی فائدہ نظر نہیں آتا، مثلاً حج کے دوران بیت اللہ کے گرد چکر کاٹنا، دو پہاڑیوں (صفا اور مروہ) کے درمیان (بظاہر بے مقصد) دوڑنا، منیٰ میں جمرات پر کنکریاں مارنا، اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو تو یہ سارے کام بظاہر بڑے غیر سنجیدہ اور قطعی غیر معقول نظر آتے ہیں، اور صرف روپے پیسے اور معاشی فوائد کے بھنور میں پھنسی ہوئی عقل کبھی یہ باور نہیں

کر سکتی کہ ان گھڑ پتھروں سے بنے ہوئے تین ستونوں کو روزانہ کنکر مارنا ایسا کونسا عمل ہے جس کی خاطر (انفرادی سطح پر) ہزروں روپے کا اور (اجتماعی سطح پر) کروڑوں کا زرِمبادلہ خرچ کیا جائے؟ اور جس کے لئے وہ افراد جن کے ایک ایک گھنٹے کی قیمت ہزاروں میں ہوتی ہے، متواتر کئی کئی دن تک اپنے اوقات اس کام میں صرف کریں؟

بلکہ انسان کو محض ایک ,,معاشی جانور،،(Economic animal) سمجھنے والی ذہنیت اگر ,,چار پیسے کے فائدے،، کا حساب لگانے پرآ جائے تو وہ نماز کے بارے میں بھی یہ حساب لگا سکتی ہے، کہ ایک عام نمازی مسلمان اوسطاً ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ نماز پڑھنے میں خرچ کرتا ہے، جو مہینے میں پینتالیس گھنٹے بن جاتے ہیں، اگر وہ یہ پینتالیس گھنٹے کسی معاشی سرگرمی میں خرچ کرتا تو پیداوار اور آمدنی میں کتنا اضافہ ہوسکتا تھا؟

لیکن جس شخص کے پاس مادی وسائل واسباب سے آگے بھی کچھ دیکھنے کی صلاحیت موجود ہو، اور وہ یہ حقیقت سمجھ سکتا ہو، کہ اس کائنات میں روپیہ پیسے ہی سب کچھ نہیں ہے، اس کے نزدیک عبادات سے متعلق اعداد وشمار کے اس حساب وکتاب کا مطلب محبت کو تجارت بنانے کے سوا کچھ نہیں۔

قربانی بھی ایک ایسی ہی عبادت ہے کہ اگر اسے خشک کاروباری نقطۂ نظر سے اعداد وشمار کی ترازو میں تولا جائے تو شاید اس میں سے ٹھیٹھ معاشی فوائد برآمد نہ ہوں، لیکن جو شخص بندگی کی روح اور حقیقت سے آشنا ہو، اسے محبت کے معاملات میں یہ خشک بہی کھاتہ کھولنے ہی سے گھن آئیگی، یہ تجارت نہیں عبادت ہے جو محبت سے شروع ہوتی ہے، اور پرستش تک جاتی ہے، اس میں چار پیسے کے نفع کی تلاش اسکے بنیادی مقصد ہی کے خلاف ہے، اسکا تو بنیادی مطمحِ نظر ہی یہ ہے کہ انسان کے دل میں ایسا گہرا جذبۂ اطاعت پیدا ہو کہ اللہ کے حکم کے آگے وہ اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار ہو، یہی وہ بنیادی جذبہ ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے، اور جس کے بغیر وہ فرعون اور نمرود بن کر دوسروں کے

حقوق چھینتا اور ان کے جائز مفادات پر ڈاکے ڈالتا ہے، دوسری عبادتوں کی طرح ,, قربانی،، بھی یہ جذبہ پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، بشرطیکہ وہ عبادت کے جذبہ سے کی جائے، اور اس میں ریاکاری اور دکھاوا مقصود نہ ہو، اور نہ وہ محض رسمی خانہ پُری اور ماحول کے دباؤ کے تحت انجام دی جائے۔

آخر میں ایک اور ضروری بات! اسلام نے جہاں عید الاضحیٰ کے تین دنوں میں قربانی کی عبادت کو باعثِ فضیلت قرار دیا ہے، وہاں دوسرے بہت سے احکام بھی دیئے ہیں، ایک عبادت کی انجام دہی میں دوسرے احکام کو نظر انداز کرنا بندگی کا شیوہ نہیں، مثلاً یہ حکم بھی اسلام ہی نے دیا ہے اور انتہائی تاکید کے ساتھ دیا ہے کہ اپنے کسی عمل سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچاؤ، یہ حکم بھی آنحضرت ﷺ ہی نے عطا فرمایا ہے کہ اپنے گھروں کے ماحول کو صاف ستھرا رکھو، یہ حکم بھی آپ ﷺ ہی نے دیا ہے کہ لوگوں کی گذرگاہ اور راستوں کو گندا نہ کرو، بلکہ راستے میں پڑی ہوئی گندگی یا کسی تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹا دینا، آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق، ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے، لہٰذا جہاں قربانی ایک صاحبِ استطاعت مسلمان کے لئے ضروری ہے، وہاں اس کے ذمے یہ بھی فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ذبح شدہ جانور کی آلائش کو اس طرح ٹھکانے لگانے کا انتظام کرے کہ اس سے ماحول میں گندگی نہ پھیلے۔ ان آلائشوں کو شارعِ عام پر ڈال دینا، یا انہیں اس طرح چھوڑ کر چلے جانا کہ وہ پڑی سڑتی رہیں، اور لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوں، ایک مستقل گناہ ہے، اور اس قسم کے گناہ کر کر کے عبادت انجام دینا بھی عبادت کے بنیادی مقصد سے جہالت کی دلیل ہے۔

خلاصہ یہ کہ قربانی ایک عبادت ہے، نہ تو یہ کوئی تجارت ہے جس میں ,, چار پیسے کا فائدہ،، تلاش کیا جائے، اور نہ یہ کوئی ہڑبونگ ہے جو قواعد و ضوابط سے آزاد ہو، اور اسکے دوران نظم و ضبط اور صفائی ستھرائی کے احکام و آداب کو نظر انداز کر دیا جائے، اس عبادت

کا تو اول و آخر پیغام ہی یہ ہے کہ:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾

بے شک میری نماز، میری قربانی، اور میرا مرنا جینا سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

۱۰/ ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ
۲۲/ مئی ۱۹۹۴ء

چوری یہ بھی ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جارہے تھے، جب ریل میں سوار ہونے کیلئے اسٹیشن پہنچے تو محسوس کیا کہ ان کے ساتھ سامان اس مقررہ حد سے زیادہ ہے جو ایک مسافر کو بک کرائے بغیر اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس کھڑکی پر پہنچے جہاں سامان کا وزن کر کے زائد سامان کا کرایہ وصول کیا جاتا ہے تاکہ سامان بک کراسکیں، کھڑکی پر ریلوے کا جو اہلکار موجود تھا، وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود حضرت مولاناؒ کو جانتا تھا، اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا، جب حضرتؒ نے سامان بک کرنے کی فرمائش کی تو اس نے کہا کہ ,,مولانا! رہنے بھی دیجئے، آپ سے سامان کا کیا کرایہ وصول کیا جائے؟ آپ کو سامان بک کرانے کی ضرورت نہیں، میں ابھی گارڈ سے کہ دیتا ہوں، وہ آپ کو زائد سامان کی وجہ سے کچھ نہیں کہے گا،،

مولانا نے فرمایا: ,,یہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائیگا؟

,,غازی آباد تک،، ریلوے افسر نے جواب دیا۔

,,پھر غازی آباد کے بعد کیا ہوگا؟،، مولاناؒ نے پوچھا۔

,,یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے بھی کہدیگا،، اس نے کہا

مولاناؒ نے پوچھا ,,وہ دوسرا گارڈ کہاں تک جائیگا؟،،

افسر نے کہا ,,وہ کانپور تک آپ کے ساتھ جائے گا،،

,,پھر کانپور کے بعد کیا ہوگا؟،، مولانا پوچھا۔

افسر نے کہا,, کانپور کے بعد کیا ہونا ہے؟ وہاں تو آپ کا سفر ختم ہو جائیگا،،

حضرتؒ نے فرمایا,, نہیں، میرا سفر تو بہت لمبا ہے، کانپور پر ختم نہیں ہوگا، اس لمبے سفر کی انتہا تو آخرت میں ہوگی، یہ بتائیے کہ جب اللہ تعالی مجھ سے پوچھے گا کہ اپنا سامان تم کرایہ دیئے بغیر کیوں اور کس طرح لے گئے؟ تو یہ گارڈ صاحبان میری کیا مدد کر سکیں گے؟،،

پھر مولاناؒ نے ان کو سمجھایا کہ یہ ریل آپ کی یا گارڈ صاحب کی ملکیت نہیں ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، ریلوے کے محکمے کی طرف سے آپ کو یا گارڈ صاحب کو یہ اختیار بھی نہیں دیا گیا کہ وہ جس مسافر کو چاہیں ٹکٹ کے بغیر یا اسکے سامان کو کرائے کے بغیر ریل میں سوار کر دیا کریں، لہذا اگر میں آپ کی رعایت سے فائدہ اٹھا کر بغیر کرائے کے سامان لے بھی جاؤں تو یہ میرے دین کے لحاظ سے چوری میں داخل ہوگا، اور مجھے اللہ تعالی کے سامنے اپنے اس گناہ کا جواب دینا پڑیگا، اور آپ کی یہ رعایت مجھے بہت مہنگی پڑیگی، لہذا براہ کرم مجھ سے پورا پورا کرایہ وصول کر لیجئے۔

ریلوے کا وہ اہل کار مولاناؒ کو دیکھتا رہ گیا، لیکن پھر اس نے تسلیم کیا کہ بات آپ ہی کی درست ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے ساتھ پیش آیا، وہ ایک مرتبہ ریل میں سوار ہونے کے لئے اسٹیشن پہنچے، لیکن دیکھا کہ جس درجے کا ٹکٹ لیا ہوا ہے، اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں، گاڑی روانہ ہونے والی تھی، اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ جا کر ٹکٹ تبدیل کروالیں، مجبوراً اوپر کے درجے کے ایک ڈبے میں سوار ہوگئے، خیال یہ تھا کہ ٹکٹ چیک کرنے والا آئیگا تو ٹکٹ تبدیل

کرالینگے، لیکن اتفاق سے پورے راستے کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہ آیا، یہاں تک کہ منزل آ گئی، منزل پر اتر کر وہ سیدھے ٹکٹ گھر پہنچے، وہاں جا کر معلومات کیں کہ دونوں درجوں کے کرائے میں کتنا فرق ہے؟ پھر اتنی ہی قیمت کا ایک ٹکٹ وہاں سے خرید لیا، اور وہیں پر پھاڑ کر پھینک دیا، ریلوے کے جس ہندو افسر نے ٹکٹ دیا تھا، جب اس نے دیکھا کہ انہوں نے ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیا ہے تو اسے سخت حیرانی ہوئی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ والد صاحبؒ کی دماغی حالت پر بھی شبہ ہوا ہو، اس لئے اس نے باہر آ کر ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ آپ نے ٹکٹ کیوں پھاڑا؟ والد صاحبؒ نے اسے پورا واقعہ بتایا اور کہا کہ اوپر کے درجے میں سفر کرنے کی وجہ سے یہ پیسے میرے ذمے رہ گئے تھے، ٹکٹ خرید کر میں نے یہ پیسے ریلوے کو پہنچا دیئے، اب یہ ٹکٹ بیکار تھا، اس لئے پھاڑ دیا، وہ شخص کہنے لگا کہ ,,مگر آپ تو اسٹیشن سے نکل آئے تھے، اب آپ سے کون زائد کرائے کا مطالبہ کرسکتا تھا،، والد صاحبؒ نے جواب دیا کہ ,,جی ہاں، انسانوں میں تو اب کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں تھا، لیکن جس حق دار کے حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اسکا مطالبہ اللہ تعالیٰ ضرور کرتے ہیں، مجھے ایک دن ان کو منہ دکھانا ہے، اس لئے یہ کام ضروری تھا،،۔

یہ دونوں واقعات قیامِ پاکستان سے پہلے اُس دور کے ہیں جب برِّ صغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی، اور مسلمانوں کے دل میں اس حکومت کے خلاف جو نفرت تھی وہ محتاجِ بیان نہیں، چنانچہ ملک کو انگریزی حکومت سے آزاد کرانے کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں، خود حضرت مولانا تھانویؒ برملا اپنی اس خواہش کا اظہار فرما چکے تھے کہ مسلمانوں کی کوئی الگ حکومت ہونی چاہئے جس میں وہ غیر مسلموں کے تسلط سے آزاد ہو کر شریعت کے مطابق اپنا کاروبارِ زندگی چلاسکیں، لیکن انگریز کی حکومت سے متنفر ہونے کے باوجود اس کے قائم کئے ہوئے محکمے سے تھوڑا سا فائدہ بھی معاوضہ ادا کئے بغیر حاصل کرنا انہیں منظور نہ تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ چوری کی قانونی تعریف خواہ کچھ ہو، لیکن گناہ وثواب کے نقطہ نظر سے کسی دوسرے کی چیز اس کی آزاد مرضی کے بغیر استعمال کرنا چوری ہی میں داخل ہے، آنحضرت ﷺ نے دسیوں احادیث میں مختلف انداز سے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے، چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے، ارشاد ہے کہ :

,, حُرْمَةُ مَالِ الْمُسْلِمِ كَحُرْمَةِ دَمِهٖ،،

"مسلمان کے مال کی حرمت بھی ایسی ہی ہے جیسے اس کے خون کی حرمت،،

(مجمع الزوائد، ص: ۱۷۲۔ ج:۴)

واضح رہے کہ حدیث میں اگرچہ ,,مسلمان،، کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں مسلمان حکومت کے غیر مسلم باشندے، جو امن کے معاہدے کے ساتھ رہتے ہوں، یا اس غیر مسلم حکومت کے غیر مسلم باشندے جس کے تحت مسلمان پرامن طور پر رہتے ہوں، ان کے جان و مال کا احترام بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مسلمان کے جان و مال کا احترام، لہذا اس لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ غیر مسلموں کی جان و مال قابلِ احترام نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

,,لایحل مال امریٔ مسلم إلا بطیب نفس منه،،

کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے،

(مجمع الزوائد ص: ۱۷۲۔ ج:۴)

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے منیٰ میں جو خطبہ دیا، اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :

" لَايَحِلُّ امْرِئٍ مِّنْ مَّالِ اَخِيْهِ اِلَّا مَا طَابَتْ بِهٖ نَفْسُهٗ،،

کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کا کوئی مال حلال نہیں ہے سوائے اس مال

کے جو اس نے خوش دلی سے دیا ہو،

(مجمع الزوائد ص:۱۷۱۔ ج:۴)

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّاْخُذَ مَالَ اَخِیْهِ بِغَیْرِ حَقٍّ، وَذٰلِكَ لِمَا حَرَّمَ اللّٰهُ مَالَ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ، وَاَنْ یَّاْخُذَ عَصَا اَخِیْهِ بِغَیْرِ طِیْبِ نَفْسٍ"

کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا کوئی مال ناحق طور پر لے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کیا ہے، اور اسکو بھی حرام قرار دیا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اسکی خوش دلی کے بغیر لے۔

(مجمع الزوائد ص:۱۷۱۔ ج:۴)

ان تمام احادیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ بات بھی واضح فرمادی ہے کہ دوسرے کی کوئی چیز لینے یا استعمال کرنے کے لئے اس کا خوشی سے راضی ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کسی وقت حالات سے یہ معلوم ہو جائے کہ کسی شخص نے اپنی ملکیت استعمال کرنے کی اجازت کسی دباؤ کے تحت یا شرما شرمی میں دیدی ہے، اور وہ دل سے اس پر راضی نہیں ہے، تو ایسی اجازت کو اجازت نہیں سمجھا جائیگا، بلکہ اسکا استعمال بھی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے ان ارشادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو نظر آئیگا کہ نہ جانے کتنے شعبوں میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، ہم چوری اور غصب بس یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے

گھر میں چھپ کر داخل ہو اور اس کا سامان چرائے، یا طاقت کا با قاعدہ استعمال کر کے اس کا مال چھینے، حالانکہ کسی کی مرضی کے خلاف اسکی ملکیت کا استعمال، کسی بھی صورت میں ہو، وہ چوری یا غصب کے گناہ میں داخل ہے، اس قسم کی چوری اور غصب کی جو مختلف صورتیں ہمارے معاشرے میں عام ہو گئی ہیں، اور اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بظاہر مہذب افراد بھی ان میں مبتلا ہیں، ان کا شمار مشکل ہے، تاہم مثال کے طور پر اسکی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

(۱) ایک صورت تو وہی ہے جس کی طرف حضرت مولانا تھانویؒ کے مذکورہ واقعے میں ارشارہ کیا گیا ہے، آج یہ بات بڑے فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ ہم اپنا سامان ریل یا جہاز میں کرایہ دیئے بغیر نکال لائے، حالانکہ اگر یہ کام متعلقہ افسروں کی آنکھ بچا کر کیا گیا تو اس میں اور چوری میں کوئی فرق نہیں، اور اگر ان کی رضامندی سے کیا گیا، جبکہ وہ اجازت دینے کے مجاز نہ تھے، تو ان کا بھی اس گناہ میں شریک ہونا لازم آیا، ہاں اگر کسی افسر کو ریلوے یا ایئر لائنز کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ زیادہ سامان بغیر کرائے کے چھوڑ دے، تو بات دوسری ہے۔

(۲) ٹیلی فون ایکسچینج کے کسی ملازم سے دوستی گانٹھ کر دوسرے شہروں میں فون پر مفت بات چیت نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں سمجھی جاتی، بلکہ اسے اپنے وسیع تعلقات کا ثبوت قرار دیکر فخریہ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی ایک گھٹیا درجے کی چوری ہے، اور اس کے گناہ عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(۳) بجلی کے سرکاری کھمبے سے کنکشن لے کر مفت بجلی کا استعمال چوری کی ایک اور قسم ہے، جس کا رواج بھی عام ہوتا جا رہا ہے، اور یہ گناہ بھی ڈنکے کی چوٹ کیا جاتا ہے۔

(۴) اگر ہم کسی شخص سے اسکی کوئی چیز مانگتے ہیں جبکہ ہمیں غالب گمان یہ ہے کہ وہ زبان سے تو انکار نہیں کر سکے گا، لیکن دینے پر دل سے راضی بھی نہ ہو گا، اور دیگا تو محض

شر ماشرمی اور بادلِ ناخواستہ دیگا، تو یہ بھی غصب میں داخل ہے، اور ایسی چیز کا استعمال حلال نہیں، کیونکہ دینے والے نے خوش دلی کے بجائے وہ چیز دباؤ میں آکر دی ہے۔

(۵) اگر کسی شخص سے کوئی چیز عارضی استعمال کے لئے مستعار لی گئی اور وعدہ کرلیا گیا کہ فلاں وقت لوٹا دی جائیگی، لیکن وقت پر لوٹانے کے بجائے اسے کسی عذر کے بغیر اپنے استعمال میں باقی رکھا تو اس میں وعدہ خلافی کا بھی گناہ ہے، اور اگر وہ مقررہ وقت کے بعد اسکے استعمال پر دل سے راضی نہ ہو تو غصب کا گناہ بھی ہے۔ یہی حال قرض کا ہے کہ واپسی کی مقررہ تاریخ کے بعد قرض واپس نہ کرنا (جبکہ کوئی شدید عذر نہ ہو) وعدہ خلافی اور غصب دونوں گناہوں کا مجموعہ ہے۔

(۶) اگر کسی شخص سے کوئی مکان، زمین یا دوکان ایک خاص وقت تک کے لئے کرائے پر لی گئی، تو وقت گذر جانے کے بعد مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے استعمال میں رکھنا بھی اسی وعدہ خلافی اور غصب میں داخل ہے۔

(۷) اگر مستعار لی ہوئی چیز کو ایسی بے دردی سے استعمال کیا جائے جس پر مالک راضی نہ ہو، تو یہ بھی غصب کی مذکورہ تعریف میں داخل ہے، مثلاً کسی بھلے مانس نے اگر اپنی گاڑی دوسرے کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اسکے ساتھ "مالِ مفت دلِ بے رحم" کا معاملہ کرے، اور اسے خراب راستوں پر اس طرح دوڑائے پھرے کہ اس کے کل پرزے پناہ مانگنے لگیں، اگر کسی نے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اسپر طویل فاصلے کی کالیں دیر دیر تک کرتے رہنا یقیناً غصب میں داخل اور حرام ہے۔

(۸) بک اسٹالوں میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ ان میں سے جو پسند ہوں، لوگ انہیں خرید سکیں، پسند کے تعین کے لئے انکی معمولی ورق گردانی کی بھی عام طور سے اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر بک اسٹال پر کھڑے ہو کر کتابوں،

اخبارات یا رسالوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا جائے، جبکہ خریدنے کی نیت نہ ہو، تو یہ بھی ان کا غاصبانہ استعمال ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

یہ چند سرسری مثالیں ہیں جو بے ساختہ قلم پر آ گئیں، مقصد یہ ہے کہ ہم سب مل کر سوچیں کہ ہم کہاں کہاں چوری اور غصب کے گھٹیاں جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

۱۷/ ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ
۲۹/ مئی ۱۹۹۴ء

دیواریں یا نوٹس بورڈ؟

میں نے پچھلے مضمون میں چوری اور غصب کی بعض ایسی صورتوں کی طرف توجہ دلائی تھی جنہیں عام طور سے گناہ نہیں سمجھا جاتا، اور وہ معاشرے میں عام ہوچکی ہیں، اس پر کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ جس معاشرے میں ریوالور اور کلاشنکوف کے زور پر جان، مال، آبرو، سبھی کچھ دن دہاڑے لوٹا جارہا ہو، اور جہاں کیفیت یہ ہو کہ جس کسی کو عوامی دولت پر تھوڑا بہت اختیار مل جائے، اسکی پانچوں انگلی گھی میں ہوں، اور سر کڑھائی میں، وہاں ان چھوٹی موٹی چوریوں کا ذکر کہاں لے بیٹھے؟ بات تو بظاہر درست ہے کہ ایسے ماحول میں دیانت اور تقوی کی باریکیاں واقعی بے محل سی معلوم ہوتی ہیں، لیکن دراصل عربی زبان کی ایک کہاوت ہے کہ ,, بڑی برائی کا آغاز ہمیشہ کسی چھوٹی برائی سے ہوتا ہے،، چنانچہ لوٹ مار کی یہ گرماگرمی جس سے آج ہر شخص پریشان ہے، ایک دو دن میں یکایک پیدا نہیں ہوگئی، یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہمیں ایک عرصہ لگا ہے، اور ہوا یہ ہے کہ جب معاشرہ ایک زمانے تک چھوٹی موٹی چوریوں کو ہضم کرتا رہا، اور اس چھوٹی موٹی لوٹ مار نے عمومی شکل اختیار کرکے دوسروں کی جان و مال کا احترام دل سے اٹھادیا، اور مالِ حرام سے گھن کرنے والی ذہنیت ختم کردی تو ہر شخص کی لوٹ مار اس کے اپنے ظرف اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق بڑھتی چلی گئی۔ جب مالِ حرام کے خلاف دل سے ہر اندرونی رکاوٹ ایک ایک کرکے دور ہوجائے تو جس شخص کے پاس کلاشنکوف ہو، یا جس کے ہاتھ میں

خزانے کی چابیاں ہوں، وہ سو دو سو روپے کی چوری پر کیوں بس کرے؟ لہٰذا اصل سوال چوری کی مقدار کا نہیں بلکہ وہ ذہنیت پیدا کرنے کا ہے، جو دوسرے کے مال پر ہاتھ ڈالنے کو اندر سے روک سکے، اور یہ ذہنیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسان چھوٹی دست درازی سے بھی اسی طرح ڈرے جیسے ہاتھ میں انگارے لینے سے ڈرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ماحول میں آج لوٹ مار اور چوری ڈاکہ خواہ کتنا عام ہو چکا ہو، لیکن ظاہر ہے کہ بھاری اکثریت اب بھی ایسے ہی لوگوں کی ہے جو چوری کے نام ہی سے نفرت کرتے ہیں، لہٰذا اس قسم کی بڑی بڑی چوریاں کرنے کا ان کے یہاں کوئی سوال ہی نہیں، تاہم بے توجہی یا غفلت کے عالم میں وہ بعض ایسے کاموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جنہیں وہ چوری، غصب یا کسی بھی طرح کا گناہ نہیں سمجھتے، ان کو ایسے کاموں کی طرف متوجہ کرنا بے محل نہیں ہو سکتا، اس لئے میں نے پچھلے مضمون میں چند ایسے امور کی طرف توجہ دلائی تھی، اور آج ایسی ہی ایک اور بات پیش خدمت ہے۔

ہمارے معاشرے میں دیواروں پر اشتہارات نعرے اور اعلانات لکھنے یا چسپاں کرنے کا رواج اس قدر تشویش ناک حد تک بڑھ گیا ہے کہ اسے دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے، میں نے دنیا کے تقریباً چالیس ملک دیکھے ہیں، لیکن برِصغیر کے سوا کہیں دیواری تحریروں کا یہ طوفان دیکھنے میں نہیں آیا جو ہمارے ملک میں تیزی سے بڑھتا ہی جا رہا ہے، ملک بھر میں شاید ہی کچھ خوش قسمت دیواریں ایسی ہوں جہاں کوئی نہ کوئی تحریر درج نہ ہو، ورنہ ملک بھر میں تقریباً ہر قابل ذکر دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھا یا چپکا ہوا ضرور ملتا ہے، ڈاکٹروں اور حکیموں کے اشتہارات، سیاسی اور مذہبی جلسوں کے اعلانات، چندے اور قربانی کی کھالوں کی اپیلیں، سیاسی لیڈروں کی تعریف یا مذمت، انقلاب لانے کے پر جوش ارادے، انتخابی امیدواروں کی قابلیت اور خدمات کا تعارف، انتخابی منشوروں کے اہم نکات، سیاسی قائدین کے دعوے اور وعدے، حکومت اور مخالفین کو دھمکیاں، کارخانوں

اور محکموں میں ہونے والی زیادتیوں کے خلاف احتجاج، یہاں تک کہ ذاتی مخالفین کے خلاف گالی گفتار، غرض دنیا بھر کی باتیں دیواروں پر درج ہوتی ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ ملک کی دیواریں اپنے مکینوں کو تحفظ دینے کے لئے نہیں، بلکہ ,, آزادئ تحریر،، کا مظاہرہ کرنے کیلئے بنی ہیں، اور ہر دیوار ایک ایسا مفت نوٹس بورڈ ہے جس کے استعمال کی نہ کوئی فیس ہے، نہ اس کے لئے کسی اجازت کی ضرورت ہے، اور نہ اس پر سنسر کی کوئی پابندی ہے، بلکہ لوگوں کو صلائے عام ہے کہ وہ جب چاہیں، جو چاہیں اور جتنی بھدی تحریر میں چاہیں، اس مفت نوٹس بورڈ پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے لکھ جائیں، اور کسی ہلدی پھٹکری کے بغیر اپنی پبلسٹی کو حیاتِ دوام عطا کردیں، کیونکہ جو بات اس نوٹس بورڈ پر لکھدی گئی، وہ ایسا ,,نوشتہ دیوار،، بن گئی کہ وقت گذر جانے کے بعد بھی اسکی آب وتاب میں فرق نہیں آتا، چنانچہ الیکشن میں جن خادمانِ قوم کی ضمانتیں ضبط ہوئے بھی زمانہ گذر گیا، ان کے ,, واحد نمائندہ،، ہونے کی گواہی آج بھی دیواروں پر ثبت ہے، جن جلسوں کو حاضرین کی کمی کی وجہ سے خرد برد ہوئے بھی مدتیں بیت گئیں، ان کے ,, تاریخی اجتماع،، ہونے کی شہادت آج بھی ”ریکارڈ“ پر ہے، جو معالج حضرات اپنے اعمال کا حساب دینے کے لئے اللہ تعالی کے پاس پہنچ چکے، ان کی مسیحائی کا تذکرہ آج بھی زندہ وجاوید ہے، غرض اس نوٹس بورڈ پر لگے ہوئے اعلانات کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں، جب تک انکی تحریر اپنی عمر طبعی کو نہ پہنچ جائے یا دیوار کا مالک اس پر چونا سفیدی کرا کر کسی دوسرے اعلان کے لئے جگہ صاف نہ کردے وہ ہر دور میں تازہ اور سدا بہار رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ مجھے ایک پرائیویٹ کالج میں ایک ضرورت سے جانا پڑا، وہاں ان دنوں یونین کے انتخابات ہو رہے تھے، میں نے دیکھا کہ کالج کی صرف چار دیواری ہی نہیں، مرکزی عمارت کا بیرونی حصہ بھی نعروں اور اشتہارات سے پٹا پڑا ہے، اور میں نے باقاعدہ جائزہ لے کر دیکھا تو اس عمارت میں کوئی ایک فٹ جگہ بھی ایسی نہ تھی جس پر کچھ نہ کچھ

لکھا ہوا نہ ہو، اور بلا مبالغہ اس درسگاہ کی بلڈنگ باہر سے بے بسی کے عالم میں ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی غذا پر مکھیاں چمٹ گئی ہوں، اور انہوں نے اسکی شکل تک چھپا دی ہو۔

دیواری تحریروں کے اس اندھا دھند استعمال سے پوری قوم کی تہذیب اور شائستگی کے بارے میں جو برا اثر قائم ہوتا ہے، وہ تو اپنی جگہ ہے ہی، لیکن اس بات کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے کہ یہ عمل دینی اعتبار سے ایک بڑا گناہ بھی ہے، جو چوری کے گناہ میں داخل ہے، ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر یہ تحریریں ایسی دیواروں پر لکھی جاتی ہیں جو لکھنے والے کی ملکیت میں نہیں ہوتیں، اور نہ دیوار کا مالک اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ اسکی عمارت پر یہ میناکاری کی جائے، لہذا عموماً یہ تحریریں مالک کی مرضی کے بغیر، بلکہ اسکی شدید ناراضی کے باوجود لکھی جاتی ہیں، اور اس طرح دوسرے کی ملکیت کو ناجائز طور پر اپنے کام کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، میں پچھلے مضمون میں آنحضرت ﷺ کے وہ ارشادات لکھ چکا ہوں جن میں آپ ﷺ نے دوسرے کی چیز کو اسکی خوش دلی کے بغیر استعمال کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے، اور اس کو حرام قرار دیا ہے، لیکن چونکہ دین کو ہم نے صرف نماز روزے کی حد تک محدود کر کے رکھدیا ہے، اس لئے یہ کام کرتے وقت ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہم کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں؟ جن گناہوں کا معاملہ براہ راست اللہ تعالی اور بندے کے باہمی تعلق سے ہے، اور اس میں کسی دوسرے کے حق کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، ان کا حال تو یہ ہے کہ جب کبھی انسان کو ندامت ہو، اور سچی توبہ کی توفیق ہو جائے، وہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور ان کے ذریعے کسی بندے کا حق پامال کیا گیا ہے، وہ صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتے، جب تک متعلقہ حق دار معاف نہ کرے۔ لہذا ہم اعلان و اشتہار کے جوش میں جن جن اللہ کے بندوں کا حق پامال کر کے انکی املاک میں ناجائز تصرف کرتے ہیں، جب تک وہ سب معاف نہ کریں، اس گناہ کی معافی ممکن نہیں۔

جو حکم دیواروں پر تحریریں لکھنے کا ہے، وہی پوسٹر چپکانے کا بھی ہے، اگر قرائن سے اندازہ ہو کہ دیوار کا مالک اپنی دیوار پر پوسٹر چسپاں کرنے کو پسند نہیں کریگا تو اس دیوار پر

اشتہار لگانا بھی شرعاً جائز نہیں ہے، ہاں اگر کوئی جگہ اعلانات اور اشتہارات ہی کے لئے مخصوص ہے، جیسے مساجد میں یا بعض عوامی مقامات پر اسکا انتظام کیا جاتا ہے، یا کسی دیوار کے مالک سے اجازت لے لی گئی ہے، یا اس بات کا یقین ہے کہ وہ پوسٹر چسپاں کرنے کی بخوشی اجازت دیدے گا تو بیشک بات دوسری ہے۔

حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ مشہور و معروف ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کو شہر میں چلتے ہوئے تیمّم کرنے کی ضرورت پیش آگئی، آپ ﷺ نے ایک قریبی دیوار پر جاکر تیمّم فرمایا، اس واقعے پر بحث کرتے ہوئے علماء و فقہاء نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی دوسرے شخص کی دیوار سے تیمّم کیسے فرمالیا؟ پھر اس کا جواب دیا ہے کہ تیمّم کرنے سے دیوار کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اور یہ بات واضح تھی کہ کوئی بھی شخص اپنی دیوار سے تیمّم کرنے کو منع نہیں کرسکتا۔ اس لئے آپ ﷺ نے اجازت لینے کی ضرورت نہیں سمجھی، یہ جواب تو اپنی جگہ ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب تیمّم جیسے بے ضرر کام کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے تو دیواروں کو جان بوجھ کر خراب کرنے کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟

یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ معاشرے میں ان دیواری تحریروں کا انتشار و اجِ عام اور لوگوں کا اس سے منع نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ لوگ اپنی دیواروں کے اس استعمال پر راضی ہوگئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ لوگ راضی نہیں، بے بس ہیں، ہمارے ایک دوست نے اپنے مکان کی چار دیواری پر تازہ تازہ رنگ کرایا تو کچھ صاحبان اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے اسی دن پہنچ گئے، اور اس صاف شفاف دیوار پر اپنی خوشنویسی کا مظاہرہ شروع کردیا، ہمارے دوست نے ان سے التجا کی کہ یہ دیوار آج ہی سفیدی ہو کر تیار ہوئی ہے، کم از کم کچھ دن کے لئے اسے معاف کردیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھر میں پتھر آنے شروع ہوگئے، (غنیمت ہو کہ گولیاں نہیں آئیں) انہوں نے سوچا کہ گھر والوں کے زخمی ہونے اور شیشوں کے ٹوٹنے سے بہتر ہے، کہ دیوار کی بدزیبی گوارا کرلی جائے، چنانچہ وہ

چپ ہو کر بیٹھ گئے، اور ,, نوشتہ دیوار،، پڑھ لیا۔

ظاہر ہے کہ اگر ان حالات میں لوگ چپ رہیں تو ان کی خاموشی کو رضامندی سمجھنا ان پر دوہرا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

ان گذارشات کا مقصد، خدا نہ کرے، کسی کی دلآزاری نہیں، نہ صرف تنقید برائے تنقید پیش نظر ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ معاشرے میں کسی غلط کام کے رواج پا جانے سے بعض اوقات اس کے غلط ہونے کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی وہ غلطی کرتے چلے جاتے ہیں، ہم دن رات نہ جانے اس طرح کی کتنی غلطیاں کرتے ہیں، لیکن جب کبھی از خود یا کسی کے توجہ دلانے سے ایک مرتبہ توجہ ہو جاتی ہے تو پھر اس غلطی پر اصرار نہیں ہونا چاہئے، مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ بہت سے حضرات صرف اس لئے دیواروں پر لکھنے میں کوئی عیب محسوس نہیں کرتے کہ انہیں اس کے گناہ ہونے کا علم نہیں، یا اسکی طرف دھیان نہیں ہوا، اگر ان کو توجہ ہو جائیگی تو وہ یقیناً یہ عمل ترک کر دیں گے، اور خود میرے علم میں ایسی مثالیں ہیں کہ لوگ ایک مدت تک عام رواج کی وجہ سے یہ کام کرتے رہے، لیکن توجہ ہو جانے کے بعد انہوں نے پبلسٹی کا یہ طریقہ چھوڑ دیا، اور اسکی وجہ سے اپنے نقصان کی بھی پروا نہیں کی، خدا کرے کہ ہمارے معاشرے میں یہ روایت قائم ہو، فروغ پائے اور ترقی کرے اور ہم اپنے دین کی ان سنہری تعلیمات کے ذریعے ایک پاکیزہ اور صاف ستھرا ماحول پیدا کرنے کی لگن پیدا کر سکیں، جب ضمیر کے تقاضے سے بے قاعدگیاں کم ہونگی تو جو لوگ دھونس دھاندلی سے بے قاعدگیاں کرتے ہیں انشاء اللہ انہیں لگام دینے کا راستہ بھی نکلے گا۔

۲۴/ ذوالحجہ ۱۴۱۴ھ

۵/ جون ۱۹۹۴ء

سڑکوں کا ناجائز استعمال

دھیان نہ ہو تو انسان یہ جانے بغیر غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلط کام سرزد ہو رہا ہے، اسی خیال کے پیش نظر میں نے پچھلے مضامین میں یہ بات شروع کی تھی کہ کسی دوسرے کی چیز کا ایسا استعمال جو اس کی خوش دلانہ مرضی کے خلاف ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حرام ہے، اس کی کچھ ایسی مثالیں عرض کی گئی تھیں جن کی طرف عام طور سے دھیان نہیں ہوتا، بعض دوستوں نے بتایا کہ واقعی پہلے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں تھی کہ یہ کام دینی اعتبار سے کوئی گناہ بھی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس خامہ فرسائی کے نتیجے میں کسی ایک فرد کے دل میں بھی غلط کام کے غلط ہونے کا احساس پیدا ہو جائے یا کسی ایک کا ضمیر بھی جاگ جائے تو ان مضامین کی قیمت وصول ہے۔

اب اسی سلسلے میں ایک اور پہلو مزید توجہ کا طالب ہے، جو چیزیں کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں ہوتی ہیں ان کے بارے میں تو تھوڑا بہت احساس لوگوں کو ہو بھی جاتا ہے، لیکن جو چیزیں ,,سرکاری املاک،، کہلاتی ہیں، ان کے بارے میں واقعی ,,مال مفت دل بے رحم،، کی مثل صادق آتی ہے۔ ان پر قبضہ کر لینا ان کو خلافِ قانون استعمال کرنا یا بے دردی سے استعمال کرنا ایسی عام بات ہوگئی ہے جس پر انگلیاں بھی نہیں اٹھتیں، حالانکہ سرکاری اشیاء برسر اقتدار افراد کی ملکیت نہیں ہوتیں، پوری قوم کی ملکیت ہوتی ہیں، اور

ان کا ناجائز استعمال صرف کسی ایک شخص کی نہیں سارے عوام کی حق تلفی ہے، اور یہ "حقوق العباد" کا اتنا خطرناک شعبہ ہے کہ اس میں اگر کوئی حق تلفی ہو جائے تو اس گناہ کی معافی انتہائی مشکل ہے، اس لئے کہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں: حقوق العباد کے گناہ صرف توبہ اور استغفار سے معاف نہیں ہوتے، بلکہ ان کی معافی کے لئے اس شخص کا معاف کرنا ضروری ہے جس کا حق پامال کیا گیا، اب اگر وہ شخص ایک ہو اور معلوم ہو تو اس سے معافی مانگی جا سکتی ہے، لیکن سرکاری املاک کے حق دار چونکہ سارے عوام ہیں اس لئے اگر کبھی ندامت اور توبہ کی توفیق ہو تو آدمی کس کس سے معافی مانگتا پھرے گا؟ یہ بات مد نظر رکھتے ہوئے ان چند تصرفات پر غور فرمایئے جو ہمارے معاشرے میں بُری طرح پھیلے ہوئے ہیں۔

(۱) سرکاری زمینوں پر تجاوزات اسی قسم کی غاصبانہ کارروائی ہے جس کا تعلق حقوق العباد کے اس سنگین شعبے سے ہے، ہمارے علماء نے فقہ کی کتابوں میں اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ جس شخص کا مکان سڑک کے کنارے واقع ہو، وہ اپنی کھڑکی پر سائبان لگا سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر لگا سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ کتنا لمبا چوڑا؟ حالانکہ سائبان لگانے سے زمین کے کسی حصے پر قبضہ نہیں ہوتا، بلکہ فضا کا بہت تھوڑا سا حصہ استعمال ہوتا ہے، نیز یہ مسئلہ بھی فقہاء کے یہاں زیر بحث آیا ہے کہ جس شخص نے عام لوگوں کی گذرگاہ پر راستہ روک کر دکان لگالی ہو اس سے کوئی چیز خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اس شخص نے چونکہ عوام کا حق غصب کر رکھا ہے لہٰذا اس سے سودا خریدنا اسکی غاصبانہ کارروائی میں تعاون ہے، اس لئے اس سے کوئی چیز خریدنا جائز نہیں، بعض دوسرے فقہاء اگرچہ اس حد تک نہیں گئے، لیکن انہوں نے یہ کہا ہے کہ اگر یہ امید ہو کہ سودا نہ خریدنے سے اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے گا تو اس سے واقعی سودا نہ خریدنا چاہئے، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون تجاوزات کے بارے

میں کتنا حساس ہے؟

ہمارے معاشرے میں تجاوزات کوئی قابل ذکر عیب ہی نہیں رہے جس کا جی چاہتا ہے وہ اپنے مکان یا دکان کے گرد یا پوری کی پوری سرکاری زمین پر قبضہ جما کر بیٹھ جاتا ہے، بلکہ ہمارے گردوپیش میں جس طرح یہ تجاوزات پھیلے ہوئے ہیں ان میں ایک نہیں کئی کئی گناہ بیک وقت جمع ہیں، اول تو عوامی زمین پر ناجائز قبضہ ہی بڑا سنگین گناہ ہے، دوسرے عموماً ان تجاوزات سے راستہ چلنے والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، اور راہ گیروں کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا ایک مستقل گناہ ہے، جس پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ تیسرے ہمارے ماحول میں یہ تجاوزات رشوت خوری کے فروغ کا بہت بڑا ذریعہ بنی ہوئی ہیں کیونکہ انہیں باقی رکھنے کیلئے متعلقہ اہلکار کو ,,بھتہ،، دینا پڑتا ہے، اور یہ بھتہ ایک مرتبہ دینا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ہفتہ وار یا ماہانہ تنخواہ کی طرح اس کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے اہلکار دل سے یہی چاہتے ہیں اور اس کی پوری کوشش بھی کرتے ہیں کہ یہ تجاوزات ختم نہ ہوں، تاکہ ان کی ,,آمدنی،، کا یہ ذریعہ بند نہ ہونے پائے، لہذا انکو اپنے فرائض سے غافل کرنے بلکہ فرائض کے برعکس کام کرنے کا گناہ بھی اس میں شامل ہو تو بعید نہیں۔

(۲) اس طرح ہمارے ملک میں یہ بھی عام رواج ہو گیا ہے کہ جلسوں اور تقریبات کے لئے چلتی ہوئی سڑک روک کر شامیانے اور قناتیں لگا لی جاتی ہیں، اور اس کے نتیجے میں آنے جانے والی گاڑیوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور ٹریفک کے نظام میں بعض اوقات شدید خلل واقع ہو جاتا ہے، یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے سامنے سے گذرنا جائز نہیں، اور احادیث میں اس بات کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ کوئی بھی شخص کسی نمازی کے سامنے سے نہ گذرے، لیکن ساتھ ہی شریعت نے نماز پڑھنے والے کو یہ بھی ہدایت کی ہے کہ وہ ایسی جگہ نماز پڑھنا شروع نہ

کرے جہاں لوگوں کو گذرنے میں دشواری ہو، مثلاً مسجد کا صحن اگر کھلا ہوا ہے تو صحن کے بیچوں بیچ یا اس کے آخری سرے پر نماز کیلئے کھڑے ہو جانا اس صورت میں جائز نہیں جب سامنے لوگوں کے گذرنے کی جگہ ہو اور نماز شروع کرنے کی وجہ سے انہیں لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑتا ہو، لہذا حکم یہ دیا گیا ہے کہ ایسی جگہ نماز پڑھو جہاں یا تو سامنے کوئی ستون وغیرہ ہو جس کے پیچھے سے لوگ گذر سکیں یا سامنے نمازی ہی کی صفیں ہوں۔ اگر کوئی شخص اس ہدایت کا خیال نہ رکھے اور صحن کے بیچوں بیچ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ ایسی صورت میں کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گذرنے پر مجبور ہو جائے تو اس کے گذرنے کا گناہ نماز پڑھنے والے پر ہوگا سامنے سے گذرنے والے پر نہیں۔

غور فرمایئے کہ مسجدیں عموماً بہت بڑی نہیں ہوتیں، اور اگر کسی شخص کو چکر کاٹ کر نکلنا پڑے تو اس کے ایک دو منٹ سے زیادہ خرچ نہیں ہوتے، لیکن شریعت نے اس ایک دو منٹ کی تکلیف یا تاخیر کو بھی گوارا نہیں کیا، اور نمازی کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کو اس معمولی تکلیف سے بھی بچائے ورنہ گناہ گار وہ خود ہوگا۔

جب شریعت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی شخص ہماری وجہ سے اس معمولی تکلیف میں مبتلا ہو تو سڑک کو بالکل بند کر کے لوگوں کو دور کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ بالخصوص آج کی مصروف زندگی میں اگر کسی شخص کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں چند منٹ کی تاخیر بھی ہو جائے تو بعض اوقات اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے، کسی بیمار کو اسپتال پہنچانا ہو یا کسی بیمار کے لئے دوا لے جانی ہو یا کوئی مسافر ریلوے اسٹیشن یا ہوائی اڈے پہنچنا چاہتا ہو، اور ہمارے جلسے یا تقریب کی وجہ سے اسے پانچ یا دس منٹ کی تاخیر ہو جائے تو کہنے کو یہ تاخیر پانچ دس منٹ کی ہے، لیکن اس تاخیر کے نتیجے میں بیمار رخصت بھی ہو سکتا ہے مسافر اپنے سفر سے بالکل یہ محروم بھی ہو سکتا ہے، اور جن جن لوگوں کو اس طرح کا نقصان پہنچا ہو ہمیں نہ ان کا نام معلوم ہے نہ

پتہ، اور نہ نقصان کی نوعیت، لہذا اگر اس گناہ کی تلافی کرنا بھی چاہیں تو اس کا کوئی راستہ اختیار میں نہیں، ذاتی طور پر مجھے تو ان جلوسوں کا شرعی جواز بھی مشکوک معلوم ہوتا ہے جو گھنٹوں کے لئے آمد و رفت کا نظام درہم برہم کر کے عام لوگوں کو ناقابل بیان اذیتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں، کیونکہ یہ ساری خرابیاں ان میں بھی بہ درجہ اتم موجود ہیں۔

(۳) یہ مناظر بھی بکثرت دیکھنے میں آتے ہیں کہ سڑکوں کو کرکٹ کا میدان بنالیا جاتا ہے، اور سڑک کے بیچوں بیچ وکٹ یا وکٹ نما کوئی چیز نصب کر کے باقاعدہ کھیل شروع ہو جاتا ہے، آس پاس کی ہر کھڑی یا چلتی ہوئی گاڑی بیٹسمین کے چوکوں کی زد میں ہوتی ہے، اور گیند کے پیچھے دوڑتے ہوئے فیلڈر آنے جانے والی گاڑی کی زد میں، یہ منظر گلیوں اور چھوٹی سڑکوں پر تو نظر آتا ہی رہتا ہے، لیکن کچھ عرصے پہلے دیکھا کہ ایک ایسے مین روڈ پر باقاعدہ میچ ہو رہا تھا جہاں عام طور سے گاڑیاں ساٹھ ستر کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتی ہیں، یہ عوامی سڑک کا سراسر ناجائز استعمال تو ہے ہی خود کھیلنے والوں کے لحاظ سے بھی اقدام خودکشی سے کم نہیں، گیند کے پیچھے دوڑنے والے کے تمام تر ہوش و حواس گیند پر مرکوز ہوتے ہیں، اور وہ یکایک پیش آجانے والی کسی صورت حال کی وجہ سے اپنے جسم کو کنٹرول کرنے پر قادر نہیں ہوتا، لہذا اچانک کوئی گاڑی سامنے آجائے تو کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے، اور اس قسم کے حادثات پیش آ بھی چکے ہیں، اور جب اس کھیل کے نتیجے میں جانیں تک چلی گئی ہیں تو گاڑیاں اور ان کے شیشے ٹوٹنے کا کیا شمار؟

اس صورت حال کی ذمہ داری ان نو عمر کھیلنے والوں سے زیادہ ان کے والدین، سرپرستوں اور ان سرکاری کارندوں پر عائد ہوتی ہے جو انہیں اس خطرناک کھیل میں مصروف دیکھتے ہیں، اور اس سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کرتے، دوسری طرف بڑے شہروں میں کھیل کے میدانوں کی کمی بھی اس صورت حال کا سبب ہے جس کی طرف حکومت کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(۴) سڑکوں پر بے جگہ گاڑیوں کی پارکنگ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ہم انتہائی بے حسی کا شکار ہیں۔ چھوٹی گاڑیاں تو ایک طرف رہیں بڑی بڑی ویگنیں اور بسیں بھی ایسی جگہ کھڑی کردی جاتی ہیں کہ آنے جانے والوں کا راستہ بند ہو جاتا ہے، یا گذرنے والوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چونکہ ہم نے دین کو صرف نماز روزے ہی کی حد تک محدود کر رکھا ہے، اس لئے یہ عمل کرتے وقت کسی کو یہ دھیان نہیں آتا کہ وہ محض بے قاعدگی کا نہیں بلکہ ایک ایسے بڑے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اول تو جس جگہ پارکنگ ممنوع ہے اس جگہ گاڑی کھڑی کردینا اس عوامی جگہ کا ناجائز استعمال ہے، جو غصب کے گناہ میں داخل ہے، دوسرے حاکم کے ایک جائز حکم کی خلاف ورزی ہے، تیسرے اس بے قاعدگی کے نتیجے میں جس جس شخص کو تکلیف پہنچے گی، اسے تکلیف پہنچانے کا گناہ الگ ہے اس طرح یہ عمل جو غفلت اور بے دھیانی کے عالم میں روزمرہ ہوتا ہے، بیک وقت کئی گناہوں کا مجموعہ ہے، جن پر دنیا میں چالان ہو یا نہ ہو، آخرت میں ضرور باز پرس ہوگی۔

اسی طرح بعض جگہ پارکنگ قانوناً ممنوع نہیں ہوتی، لیکن گاڑی اس انداز سے کھڑی کردی جاتی ہے کہ آگے پیچھے کی گاڑیاں سرک نہیں سکتیں، یا گذرنے والوں کو کوئی اور تکلیف پیش آتی ہے، یہ عمل بھی دینی اعتبار سے سراسر ناجائز اور گناہ ہے۔

ہماری فقہ کی قدیم کتابیں اس زمانے میں لکھی گئی ہیں جب خودکار گاڑیوں (آٹو موبائلز) کا رواج نہیں تھا، اور سفر کے لئے عموماً جانور استعمال ہوتے تھے، اس لئے ٹریفک کا نظام اتنا پیچیدہ نہیں تھا جتنا آج ہے، اس کے باوجود ہمارے فقہائے کرام نے سڑکوں پر چلنے اور گاڑیوں کے ٹھہرانے کے بارے میں شرعی احکام کی تفصیل نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کی ہے، اور اس سے اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اور اس بات کا بھی کہ اسلام میں نظم وضبط اور حقوق العباد کی کتنی اہمیت ہے؟ اس کا تقاضا یہ ہے کہ

بحیثیت مسلمان ہمارا نظم وضبط اور ہماری تہذیب وشائستگی مثالی ہو، لیکن افسوس ہے کہ اپنی غفلت اور بے دھیانی کی وجہ سے ہم اس قسم کے بے شمار گناہ روزانہ اپنے نامہ اعمال میں شامل کر کے اپنی آخرت بھی خراب کر رہے ہیں، اور دنیا بھر کو اپنے بارے میں وہ تأثر بھی دے رہے ہیں جو نہ صرف ہم سے نفرت کا باعث بنتا ہے بلکہ اسلام کی چمکتی ہوئی تعلیمات پر ہماری بدعملی کا نقاب ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ دین کا صحیح حسن دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

۲/ محرم ۱۴۱۵ھ
۱۳/ جون ۱۹۹۴ء

دھوکے کی تاویلیں

مجھے برطانیہ سے ایک خط موصول ہوا ہے جس میں مکتوب نگار لکھتے ہیں:

,,راقم آپ کی کتابوں کا قاری ہے، آپ کے مضامین بھی ,,جنگ،، کے توسط سے گاہے بہ گاہے میسر آجاتے ہیں، آج کے اخبار میں آپ کا مضمون تھا، ,,یہ بھی چوری ہے،، اسے پڑھ کر دل چاہا کہ آپ کی خدمت میں ایک مسئلہ لکھوں جو یہاں درپیش ہے، اگر اسکا جواب اخبار ,,جنگ،، ہی میں تحریر فرمائیں تو پورے مغرب کے لئے مفید ہوگا، کیونکہ یہ مسئلہ صرف برطانیہ ہی میں نہیں، بلکہ پورے یورپ میں درپیش ہے۔

یورپ کے بہت سے ممالک میں یہ قانون ہے کہ بے روزگار افراد کو حکومت کی طرف سے ,,بے روزگاری الاؤنس،، دیا جاتا ہے، یہ الاؤنس ہفتہ وار دیا جاتا ہے، اور ایسے افراد کو ہر دو ہفتے بعد محکمۂ بے روزگاری میں یہ رپورٹ دینی ہوتی ہے کہ وہ تاحال بے روزگار ہیں، اس رپورٹ کی بنیاد پر ان کے پاس گھر ہی پر چیک پہنچ جاتا ہے، جوان کے کھانے اور رہائش وغیرہ کے اخراجات ہوتے ہیں۔

حکومت کی دی ہوئی اس سہولت سے بعض لوگ یہ فائدہ اٹھاتے

ہیں کہ روزگار مل جانے کے باوجود وہ اپنے آپ کو بے روزگار ظاہر کرتے رہتے ہیں، اور گھر بیٹھے یہ الاؤنس وصول کرتے رہتے ہیں، ان لوگوں میں ہمارے بعض مسلمان بھائی بھی شامل ہیں، وہ ایک طرف حکومت سے بے روزگاری الاؤنس وصول کرتے ہیں اور دوسری طرف کسی دوکان یا ہوٹل میں کام کرتے ہیں یا ٹیکسی چلاتے ہیں، یا ٹیوشن پڑھا کر آمدنی حاصل کرتے رہتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی چوری ہے؟ کیا ایسا کرنا حرام ہے؟ کیا اس کمائی سے حج کرنا جائز ہے؟ اس سے مسجد، مدرسے یا کسی اور فلاحی ادارے کو چندہ دیا جاسکتا ہے؟ اور اگر چندہ لینے والوں کو معلوم ہو کہ یہ رقم اس طرح حاصل کی گئی ہے، تو کیا ان کے لئے چندہ وصول کرنا جائز ہے؟

اس سوال کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض لوگ اس عمل کی حمایت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یورپ کے یہ ممالک دارالکفر ہیں، یورپ کی حکومتیں اسلام دشمن ہیں، اور مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں کی مدد کرتی ہیں، فلسطین، بوسنیا، کشمیر اور دوسرے مقامات پر مسلمان جس ظلم وستم کا شکار ہیں، اس میں یہ حکومتیں بالواسطہ ملوث ہیں، لہذا ہم بالواسطہ یورپ کی ان حکومتوں سے برسر جنگ ہیں، اور جنگ کی حالت میں ان کا مال اس طرح حاصل کرنا جائز ہے۔

یہی استدلال ٹیلی فون کے محکمے اور دوسرے پبلک محکموں کو فریب دینے کے بارے میں بھی پیش کیا جاتا ہے، بعض لوگ بینک سے قرض لے کر واپس نہیں کرتے، اور یہی دلیل استعمال کرتے ہیں،

براہِ کرم ان سوالات کا جواب قدرے تفصیل سے دلائل کے ساتھ دیجئے، کیونکہ مغربی ممالک کے مسلمانوں میں یہ باتیں اب خاصے بڑے پیمانے پر پھیل رہی ہیں، آپ کی مصروفیت کا مجھے اندازہ ہے، لیکن امید ہے کہ آپ مایوس نہیں فرمائیں گے۔

(عبدالمجید۔ ایسٹن۔ برسٹل۔ انگلینڈ)

خط آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ یہ خبر میرے لئے نئی نہیں ہے۔ مغربی ممالک کے سفروں کے دوران اس قسم کی بہت سی مثالیں میرے علم میں آتی رہی ہیں، کہ ہمارے بعض مسلمان بھائی بہت چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر ان دوسرے ملکوں میں بعض ایسے شرمناک کام کرتے ہیں جو ملک وملت کی بدنامی کا سبب ہوتے ہیں۔ لیکن جو بات نئی ہے وہ یہ کہ اب اس افسوس ناک طرز عمل کے جواز میں باقاعدہ دلائل بھی پیش کئے جارہے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ اسے جائز قرار دیا جارہا ہے، بلکہ مستحسن قرار دے کر اسکی تبلیغ بھی کی جارہی ہے، اور ,,برسرجنگ،، ہونے کی جو دلیل پیش کی گئی ہے، اس کے پیش نظر بعید نہیں کہ اسے ,,جہاد،، کا ایک حصہ قرار دیا جانے لگا ہو۔

اگر اس سلسلے میں واقعی کسی صاحب کو کوئی غلط فہمی ہے تو ان کی اطلاع کے لئے آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، خیبر مدینہ طیبہ کے شمال میں ایک بڑا شہر تھا، یہاں آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں یہودی آباد تھے، اور مدینہ طیبہ کی نوخیز اسلامی ریاست کے خلاف مسلسل سازشوں کے جال بنتے رہتے تھے، ۷ھ میں آنحضر ﷺ نے ان پر ایک فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کیا، اور خیبر کا محاصرہ فرمالیا، یہ محاصرہ کئی روز جاری رہا، اور خیبر کے یہودی باشندے قلعہ بند ہوکر مسلمانوں سے لڑتے رہے، خیبر میں ایک سیاہ فام چرواہا یہودی باشندوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے اسکا نام ,,اسود راعی،، مشہور ہے، اسی محاصرے کے دوران وہ بکریاں چرانے

کے لئے شہر سے باہر نکلا، بکریوں کو چراتے چراتے اسے سامنے مسلمانوں کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے نظر آیا، اس کے دل میں شوق پیدا ہوا کہ وہ مسلمانوں اور ان کے امیر لشکر ﷺ کو خود جا کر دیکھے، اور ان سے ان کے دین و مذہب کے بارے میں معلومات کرے، چنانچہ وہ بکریوں کو ہنکاتا ہوا مسلمانوں کے پڑاؤ کے پاس پہنچ گیا، اور لوگوں سے پوچھنے لگا کہ آپ کے ,,بادشاہ،، کا خیمہ کونسا ہے؟ مسلمانوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں ,,بادشاہ،، تو کوئی نہیں ہوتا، البتہ ہمارے قائد اللہ کے آخری پیغمبر ہیں، اور وہ اس معمولی سے خیمے میں مقیم ہیں، اگر آپ ان سے ملاقات کرنا چاہیں تو اندر چلے جائیں، چرواہے کو نہ اپنی آنکھوں پر اعتبار آیا نہ کانوں پر، اول تو جس خیمے کا پتہ بتایا جارہا تھا، اسے خیمے کے بجائے چھپر کہنا زیادہ موزوں تھا، اور اس کے لئے یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ عرب کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کا سربراہِ اعلی اس چھپر میں رہ رہا ہوگا، دوسرے یہ بات اسے مذاق معلوم ہوتی تھی کہ ایک معمولی سے انجان چرواہے کو اس سربراہِ اعلی سے اتنی آسانی کے ساتھ ملاقات کی دعوت دی جارہی ہے، لیکن بالآخر اس نے دیکھ لیا کہ جو بات کہی گئی تھی وہ مذاق نہیں، حقیقت تھی، چنانچہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ خواب کے سے عالم میں عرب ہی کے نہیں دونوں جہانوں کے سردار (ﷺ) کے سامنے کھڑا تھا، آنحضرت ﷺ سے اس چرواہے کی جو باتیں ہوئیں، وہ بڑی دلچسپ اور طویل ہیں جو سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، (میری کتاب ,,جہانِ دیدہ،، میں بھی اسکی تفصیل موجود ہے) لیکن مختصر یہ کہ آپ ﷺ کی زیارت کر کے اور آپ ﷺ کی باتیں سن کر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے سالہا سال تک زندگی کی دھوپ میں جھلنے کے بعد یکایک اس انجانی سی منزل کی چھاؤں میسر آگئی ہے، جس کی تلاش میں اسکی روح سرگرداں تھی، چنانچہ اس نے اس چھاؤں کی آغوش تک پہنچنے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہیں کی، اور مسلمان ہوگیا۔

مسلمان ہونے کے بعد اس چرواہے نے آنحضرت ﷺ سے آپ ﷺ کے ساتھ

خیبر کے جہاد میں حصہ لینے کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے اسے نہ صرف اجازت دی، بلکہ بشارت بھی دی، لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ جہاد میں شامل ہونے سے پہلے ایک کام ضروری ہے، اور وہ یہ کہ تمہارے ساتھ بکریوں کا جو ریوڑ ہے وہ تمہارے پاس ان یہودیوں کی امانت ہے، جہاد کی فضیلت حاصل کرنے سے پہلے تمہارا فرض یہ ہے کہ یہ بکریاں مالکوں کو لوٹا کر آؤ، چنانچہ اسود راعی (رضی اللہ عنہ) یہ بکریاں لے کر گئے، اور انہیں قلعے کے اندر پہنچا کر واپس آئے، پھر جنگ میں شامل ہوئے، جنگ کے خاتمے پر جب آنحضرت ﷺ شہداء کی نعشوں کے معائنے کے لئے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ شہداء کی قطار میں اس نو مسلم چرواہے کی نعش بھی شامل تھی۔

یہ واقعہ تو اختصار کی کوشش کے باوجود قدرے طویل ہو گیا (پھر بھی اسکے بعض بڑے ایمان افروز حصے باقی رہ گئے) لیکن اس وقت اس واقعے کے اس آخری حصے کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا جس میں آپ ﷺ نے بکریاں خیبر کے یہودی باشندوں کو واپس کرنے کا حکم دیا۔ خیبر کے ان یہودیوں کے ساتھ آپ ﷺ کی بالواسطہ نہیں براہ راست جنگ تھی، یہ وہی یہودی تھے جن کی سازشوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کو مدینہ منورہ میں چین سے بیٹھنے نہیں دیا، جن کی معاندانہ کارروائیوں سے مسلمانوں کے دل چھلنی تھے، اور اب ان کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کر کے ان کا محاصرہ کیا گیا تھا، کھلی جنگ کی اس حالت میں بلا شبہ ان کی جان اور مال کے خلاف ہر کارروائی جائز تھی، دوسری طرف مسلمانوں کے پاس غذائی سامان کی قلت تھی، اور بکریوں کا یہ ریوڑ جو بہت آسانی سے ہاتھ آگیا تھا مسلمانوں کے لشکر کی بہت سی ضروریات پوری کر سکتا تھا، لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت ﷺ نے یہ گوارا نہیں فرمایا کہ ان بکریوں پر قبضہ کر لیا جائے، اسود راعی رضی اللہ عنہ یہ بکریاں یہودیوں سے ایک معاہدے کے تحت قلعے سے باہر لائے تھے، اور اگر انہیں واپس نہ کیا جاتا، تو معاہدے کی خلاف ورزی لازم آتی، جنگ کی حالت

میں یہ تو جائز ہے کہ کھلم کھلا طاقت استعمال کر کے دشمن کے مال پر قبضہ کر لیا جائے، لیکن جھوٹا معاہدہ کر کے دھوکا دینے اور معاہدے کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں، آنحضرت ﷺ نے بکریاں لوٹانے کا حکم دے کر شریعت کے اس حکم کو واضح فرمایا جو رہتی دنیا تک مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

جو مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں رہتے ہیں، خواہ وہاں کی شہریت اختیار کر کے یا عارضی اقامت کے طور پر، وہ وہاں کی حکومت سے ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت رہتے ہیں، اس معاہدے کی پاسداری ان کے ذمے شرعاً لازم ہے، اور اس کی خلاف ورزی شرعی اعتبار سے بھی سخت گناہ ہے، جہاد کے ذریعے کفر اور اسلام دشمنی کی شوکت توڑنے کا جذبہ اپنی جگہ بڑا قابلِ تعریف ہے، لیکن اس کے لئے اپنا کردار اور اپنے بازو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، عہد شکنی، چوری اور دھوکہ فریب کے ذریعہ دوسرے مذہب والوں کو زک پہنچانا کفر کا شیوہ ہے، اسلام اور مسلمانوں کا نہیں، اسلام نے جہاں جہاد کی فضیلت بیان کی ہے، وہاں اس کے مفصل احکام اور آداب بھی بتائے ہیں، بلکہ دنیا کی تاریخ میں اسلام نے سب سے پہلے جنگ کو ان قواعد و آداب کا پابند بنایا جو شرافت اور بہادری کا حسین امتزاج ہیں، ورنہ اس سے پہلے جنگ، قتل و غارت گری کا دوسرا نام تھا، جو کسی قسم کی حدود و قیود کی پابند نہیں تھی، اسی طرح یہ اسلام ہی تھا جس نے بین الاقوامی تعلقات کے مفصل احکام وضع کئے جو امن اور جنگ دونوں حالتوں پر حاوی ہیں اگر ہم ان احکام و آداب کو نظر انداز کر کے من مانی کارروائیاں کرینگے تو ایک طرف شریعت کی خلاف ورزی کا شدید گناہ اپنے سر لینگے، دوسرے اپنے طرز عمل کے ذریعہ لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متنفر کر کے اسلام کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کے مجرم ہونگے۔

جو مسلمان بھائی اپنے روزگار کے حصول یا کسی اور جائز مقصد کے لئے غیر مسلم ملکوں میں جا کر آباد ہوئے ہیں، انہیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ ان کا اچھا یا برا طرزِ

عمل ان کی ذات کی حد تک محدود نہیں، اِن ملکوں کے لوگ انہیں اسلام کا نمائندہ سمجھتے ہیں، اور ان کے کردار کو دیکھ کر ان کے دین اور ان کے وطن کے بارے میں اچھی یا بری رائے قائم کرتے ہیں، اسلام کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں اسلام کی نشر واشاعت زیادہ تر تاجروں کے ذریعے ہوئی جو ان علاقوں میں تجارت اور کسب معاش کے لئے گئے تھے، لیکن ان کا پاکیزہ کردار، ان کی سچائی اور ان کی امانت ودیانت مجسم تبلیغ ثابت ہوئی، انہوں نے اپنی سیرت کی مقناطیسی طاقت سے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف کھینچا، اور بالآخر اسلام کی روشنی سے پورے خطے کو جگمگادیا۔

اگر ہم غیر مسلموں کے سامنے جھوٹ، عہد شکنی، دھوکہ فریب اور خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں تو صرف اپنی ذات پر نہیں، اپنے دین پر، اپنی قوم پر اور اپنے وطن پر وہ داغ لگاتے ہیں جسے مٹانا آسان نہیں، اور قرآن کریم کی یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی وعید اس طرز عمل پر صادق آتی ہے کہ ,,جو لوگ اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکتے ہیں انہیں ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو،،۔

پھر اس طرزِ عمل پر شرمندہ ہونے کے بجائے اسکی تاویلیں کر کے اسے جائز ثابت کرنے کی کوشش ,,عذر گناہ بدتر از گناہ،، کے مترادف ہے۔

جو سوالات مکتوب نگار نے کئے ہیں ان کا جواب بالکل واضح ہے اس طرح جھوٹ اور دھوکے سے حاصل کی ہوئی رقمیں یقیناً حرام ہیں، اور اس حرام پیسے کو حج یا مسجد اور مدرسے وغیرہ میں لگانا بھی ناجائز ہے، اور جس شخص کو معلوم ہو کہ یہ رقم حرام طریقے سے حاصل کی گئی ہے، اس کے لئے اس کا قبول کرنا بھی جائز نہیں۔

۸/ محرم ۱۴۱۵ھ

۱۹/ جون ۱۹۹۴ء

ہمدردی یا گناہ؟

ایک صاحب ایک مرتبہ مجھ سے اپنے ایک پڑوسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتا رہے تھے کہ ان کے آپس میں کتنے خوشگوار تعلقات ہیں، اور وہ کس طرح ایک دوسرے سے اپنائیت اور ''حسن سلوک'' کا معاملہ کرتے رہتے ہیں، اس ,,حسنِ سلوک،، کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ کہنے لگے کہ ,,میرے پڑوسی جس محکمے میں کام کرتے ہیں وہ اپنے ملازمین کو ان کی ذاتی گاڑی کے لئے بہت سی سہولیات فراہم کرتا ہے، (مثلاً پیٹرول کا خرچ، سروس اور مرمت وغیرہ کا خرچ) میرے پڑوسی کے پاس چونکہ اپنی کوئی گاڑی نہیں تھی، اس لئے وہ یہ سہولیات حاصل نہیں کر سکتے تھے، میں نے اپنی گاڑی ان کے نام رجسٹر کرادی، اور انہوں نے اپنے محکمے میں اسے اپنی گاڑی ظاہر کر کے وہ سہولیات حاصل کرلیں، مدتوں میری گاڑی ان کے نام پر درج رہی، اور وہ اسکے نام پر سالہا سال یہ سہولیات حاصل کرتے رہے،، میں نے ان سے پوچھا کہ ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ فرمانے لگے کہ ''ہمارے درمیان تعلقات ہی ایسے تھے'' مجھے یقین تھا کہ گاڑی ان کے نام رجسٹر ہونے کے باوجود وہ میرے ہی استعمال میں رہیگی، اور کبھی ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوگا، لہذا اگر صرف نام درج کرانے سے کسی کا بھلا ہوتا ہو تو میں کیوں اس میں رکاوٹ بنوں؟''

ایک اور صاحب نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ,,حسنِ سلوک،، کا ذکر

کرتے ہوے بتایا کہ ''ہمارے درمیان اتنے اچھے تعلقات ہیں کہ جب وہ خود یا ان کے گھر کا کوئی فرد بیمار ہوتا ہے تو میں ڈاکٹر سے اپنے نام کا نسخہ بنوا کر اپنے محکمے کے خرچ پر دوائیں لے آتا ہوں، اور اپنے دوست کو فراہم کر دیتا ہوں، اور اس طرح علاج معالجے پر میرے دوست کا کبھی کچھ خرچ نہیں ہوتا''

دونوں صاحبان نے اپنا یہ عمل بڑے فخر کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا جیسے یہ ان کی کشادہ دلی اور بلند حوصلگی کی علامت ہے، اور اس کے ذریعے انہوں نے بہت بڑی نیکی انجام دی ہے جس پر وہ دنیا میں تعریف اور آخرت میں ثواب کے مستحق ہیں، یہ دونوں میں سے کسی نے نہیں سوچا کہ اس طرح اپنے پڑوسی یا دوست کے ساتھ ,,ہمدردی،، کر کے وہ محکمے کے ساتھ کتنی بے وفائی اور بد دیانتی کا معاملہ کر رہے ہیں، اس ,,ہمدردی،، کا آغاز تو جھوٹ بولنے سے ہوا، یعنی پہلے صاحب نے اپنی کار خلافِ واقعہ اپنے پڑوسی کے نام درج کرا کے غلط بیانی سے کام لیا، بلکہ غلط بیانیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کرادیا، کیونکہ ہر مہینے وہ صاحب اپنی اس فرضی گاڑی کے لئے پیٹرول کے فرضی بل داخل کرتے تھے، جن میں سے ہر فرضی بل ایک مستقل جھوٹ تھا، اسی طرح اس فرضی گاڑی کی سروس اور مرمت کے بھی اسی طرح فرضی بل بنائے جاتے ہونگے، کیونکہ گاڑی تو بدستور پہلے صاحب ہی کے استعمال میں تھی، اس طرح اس ہمدردی کی بدولت وہ سالہا سال تک جھوٹ کا یہ پلندہ اپنے نامۂ اعمال میں درج کراتے رہے، اسی طرح دوسرے صاحب اپنے دوست کی بیماری کے موقع پر خود اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرنے کے لئے اپنے لئے فرضی نسخے بنواتے رہے، اور ڈاکٹر صاحب کو بھی اس غلط بیانی میں ملوث کرتے رہے۔

دوسری طرف محکمہ نے اگر کوئی سہولت اپنے کسی کارندے کو دے رکھی ہے تو وہ اپنے ملازم کو دی ہے، جو کچھ قواعد و ضوابط کی پابند ہے، نہ کسی شخص کے لئے یہ جائز ہے کہ

وہ اپنی یہ سہولت کسی اور کو منتقل کر دے، اور نہ یہ جائز ہے کہ قواعد و ضوابط کے خلاف جس طرح چاہے وہ سہولت حاصل کر لے، لہذا دونوں صاحبان نے جو سہولتیں اپنے پڑوسی یا دوست کو دلوائیں، وہ انکے لئے سراسر حرام اور ناجائز تھیں، لیکن دونوں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس طرح وہ کسی جرم یا گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، اسکے برعکس وہ اسے اپنی نیکیوں میں شمار کر رہے تھے۔

یہ دو واقعات تو میں نے مثال کے طور پر ذکر کر دیئے، ورنہ اپنے گردوپیش میں نظر دوڑا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا معاشرہ اس قسم کے واقعات سے بھرا ہوا ہے، کوئی سرکاری یا غیر سرکاری محکمہ اپنے ملازمین کو جو سہولیات دیتا ہے، بعض لوگ انہیں ہر قیمت پر اپنے حق میں نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ اس کے لئے جھوٹ سچ ایک کرنا پڑے، یا قواعد و ضوابط توڑنے پڑیں، یا کسی اور بدعنوانی کا ارتکاب کرنا پڑے، مثلاً بعض محکموں میں یہ قاعدہ ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو گاڑی میں استعمال کرنے کے لئے ایک خاص حد تک پیڑول کی قیمت مہیا کرتے ہیں، اب بعض لوگ ہر مہینے اتنے پیڑول کے بل داخل کر کے یہ رقم ہر حالت میں وصول کرنا ضروری سمجھتے ہیں خواہ واقعۃً اس مہینے میں اتنا پیڑول استعمال ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اسی طرح بعض ملازمین کو محکمے کی طرف سے اجازت ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص ماہانہ کرایہ کی حد تک کوئی مکان اپنی رہائش کے لئے لے سکتے ہیں، اب خواہ مکان کم کرائے پر ملا ہو، لیکن وہ زائد کرائے کا بل بنوا کر پوری رقم وصول کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اسی طرح بعض مرتبہ مکان کی مرمت یا دیکھ بھال (Maintenance) کا خرچ محکمہ برداشت کرتا ہے، چنانچہ بعض لوگ مرمت کے فرضی بل بنوا کر یہ رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، یہی معاملہ علاج معالجے کے اخراجات کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ خواہ واقعۃً کسی علاج کی ضرورت نہ پڑی ہو، لیکن جعلی بل بنوا کر علاج کا خرچ وصول کر لیا جاتا ہے۔

یہ تمام صورتیں بڑی گھٹیا قسم کی بددیانتی میں شامل ہیں، اس سلسلے میں ایک اہم شرعی اصول کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے جو بہت کم حضرات کو معلوم ہوتا ہے، اس لئے بعض اوقات اچھے خاصے دیانتدار حضرات بھی غیر شعوری طور پر اس قسم کی بددیانتی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ اصول یہ ہے کہ کسی چیز کی ملکیت اور چیز ہے، اور استعمال کی اجازت اور چیز، جو چیز اپنی ملکیت میں آ جائے، اسے تو انسان جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے، خواہ خود اس سے فائدہ اٹھائے، یا کسی اور کو عارضی یا مستقل استعمال کے لئے دیدے، اس پر کوئی پابندی نہیں لیکن جو چیز اپنی ملکیت میں نہ ہو، بلکہ مالک نے اسے استعمال کرنے کا حق یا اسکی اجازت دی ہو، (جسے اسلامی فقہ میں ,,اباحت،، سے تعبیر کیا گیا ہے) اس پر ہر طرح کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ اس اجازت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ضرورت کی حد تک اسے جس قدر استعمال کرنا چاہے کر لے، لیکن اسے یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ مالک کی اجازت کے بغیر اپنا یہ حق کسی اور کو منتقل کر دے، یا دوسروں کو دعوت دے کہ اس سے فائدہ اٹھانے میں وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو جائیں، نیز اسے یہ بھی حق نہیں ہوتا کہ اگر کسی وجہ سے وہ خود اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا تو اسکی قیمت وصول کرے۔

اسکی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ہمارے گھر کھانا پکا کر بھیج دیا تو یہ کھانا ہماری ملکیت ہے، خواہ ہم اسے خود کھائیں یا کسی اور کو تحفۃً بھیج دیں، یا صدقہ کر دیں، بلکہ جائز یہ بھی ہے کہ کسی کو بیچ کر اسکی قیمت وصول کر لیں، لیکن اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں ہماری دعوت کی تو جو کھانا وہاں موجود ہے، وہ ہماری ملکیت نہیں، البتہ مالک کی طرف سے اجازت ہے کہ ہم اپنی ضرورت یا خواہش کے مطابق جتنا چاہیں کھا لیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کھانے پر اپنے مالکانہ حقوق جتلانے لگیں، لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کہ ہم مالک کی مرضی کے بغیر اس پر کسی اور کو دعوت دینے

لگیں، اسی طرح اگر کوئی شخص دعوت کا کھانا اپنے ساتھ باندھ کر گھر لے جانے لگے تو اسے کتنا گھٹیا آدمی سمجھا جائیگا، اور اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور شرمناک بات یہ ہوگی کہ کوئی شخص اگر خود کسی وجہ سے کھانا نہ کھا سکا تو میزبان سے یہ مطالبہ کرے کہ میرے کھانے کے پیسے ادا کرو۔

بالکل یہی صورت ملازمت سے حاصل ہونے والی سہولیات کی بھی ہے، جہاں تک نقد تنخواہ کا تعلق ہے، وہ ملازم کی ملکیت ہے، اسے وہ جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے، یا جو الاؤنس کی رقمیں یکمشت محکمے کی طرف سے ادا کردی جاتی ہیں اور ان کی وصولیابی کے لئے بل پیش کرنے نہیں پڑتے، ان کا بھی یہی حکم ہے، لیکن جو دوسری سہولیات ملازم کو فراہم کی جاتی ہیں مثلاً پیٹرول، علاج معالجے اور کرائے وغیرہ کے بلوں کی ادائیگی، وہ محکمے کی طرف سے ایک اجازت ہے، لہذا اس کا مطالبہ اسی حد تک جائز اور درست ہے جس حد تک اس اجازت سے واقعی فائدہ اٹھایا گیا ہے، اس سے زیادہ نہیں، اس فائدے میں اپنے کسی عزیز، دوست یا پڑوسی کو شریک کرنا بھی جائز نہیں، اسی طرح اگر خود کو اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، یا اسکا موقع نہیں ملا، تو اس کا غلط بل پیش کر کے پیسے وصول کرنا بھی سراسر ناجائز ہے، اور اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص دعوت میں شریک نہ ہو، اور داعی کے پاس اس وقت کے کھانے کا بل بھیج دے، کہ میں چونکہ دعوت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا، اس لئے یہ بل تم ادا کرو۔ ظاہر ہے کہ کوئی گھٹیا سے گھٹیا آدمی بھی ایسی حرکت نہیں کریگا، مذکورہ سہولیات سے فائدہ اٹھائے بغیر ان کا بل محکمے کو بھیج دینا بھی ایسی ہی شرمناک حرکت ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی برائی عام طور سے محسوس نہیں کی جاتی، بلکہ اسے اپنا حق سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس میں جھوٹ اور فریب کا گناہ بھی ہے، اور دوسرے کا مال ناحق کھانے کا گناہ بھی۔

اس صورتِ حال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ روپیہ پیسہ اور مادی منافع کو زندگی کا وہ

بنیادی مقصد قرار دے لیا گیا ہے جس کے آگے دینی، اخلاقی اور روحانی قدریں اور ملک
وملت کی اجتماعی فلاح و بہبود کی فکر یا تو بے معنی ہو کر رہ گئی ہے، یا پس منظر میں چلی گئی ہے،
یہ درست ہے کہ معاشرے کا عمومی مزاج راتوں رات تبدیل نہیں ہو سکتا، لیکن اسکا یہ
مطلب نہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالی نے ضمیر کی پاکیزگی عطا فرمائی ہو، وہ اس ماحول سے
شکست کھا کر بیٹھ جائے، حسنِ کردار ایک خوشبو ہے جو بالآخر پھیل کر رہتی ہے۔

۱۵/ محرم ۱۴۱۵ھ
۲۶/ جون ۱۹۹۴ء

جھوٹ کے پاؤں

اردو میں مثل مشہور ہے کہ ,,جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے،، مگر اب اسکے پاؤں نہیں پَر ایسے نکل آئے ہیں کہ اس نے پورے معاشرے کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور زندگی کا کوئی گوشہ ہمارے ماحول میں اس سے خالی نہیں رہا، کھلا جھوٹ تو خیر ایسی چیز ہے جسے ہر شخص برا سمجھتا ہے، اس میں مسلمان اور کافر کی بھی قید نہیں، بلکہ وہ دھریے بھی جو اللہ تعالیٰ کے وجود تک میں شک کرتے ہیں، وہ بھی نظریاتی طور پر جھوٹ کو برا ہی سمجھتے ہیں جو لوگ عملاً دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں، ان سے بھی اگر پوچھا جائے کہ جھوٹ بولنا کیسا ہے؟ تو یقیناً ان کا جواب بھی یہی ہوگا کہ بہت برا ہے، لہذا ایسے لوگوں کو جب بھی اپنے کردار کی درستی کا خیال آئیگا تو وہ جھوٹ سے بھی توبہ کرسکیں گے، لیکن ہمارے زمانے میں جھوٹ کی ایسی بہت سی شاخیں وجود میں آ گئی ہیں جنہیں بہت سے لوگ جھوٹ سمجھتے ہی نہیں، لہذا انہیں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ان سے کوئی غلط کام سرزد ہو رہا ہے۔

میرے پاس ایک مرتبہ ایک اور شہر سے ایک صاحب ملنے کے لئے تشریف لائے، پڑھے لکھے اور نماز روزے کے پابند، ذہین اور تعلیم یافتہ، بڑے خوش مزاج اور ستھرے ادبی ذوق کے مالک بڑے خوبصورت شعر کہنے والے چہرے مہرے سے لے کر انداز و ادا تک ہر چیز میں شرافت جھلکتی ہوئی، کافی دیر تک انہوں نے اپنی دلنواز صحبت سے مجھے

مستفید کیا، جب چلنے کا وقت آیا تو میں نے پوچھا "کب تک قیام رہیگا؟" کہنے لگے کہ "پہلے تو میرا ارادہ کل واپس جانے کا تھا، مگر بعض عزیزوں کے اصرار پر اپنا قیام میں نے چند روز کے لئے اور بڑھالیا ہے، اور آج ہی میں اپنے دفتر کو میڈیکل سرٹیفکیٹ روانہ کر رہاہوں" میں نے چونک کر پوچھا "کیسا میڈیکل سرٹیفکیٹ؟" انہوں نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا "یہی دفتر سے چھٹی لینے کے لئے جو میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیجا جاتا ہے" میں نے پوچھا "کیا خدا نخواستہ آپ کی کچھ طبیعت ناساز ہے؟" فرمایا ارے نہیں بھائی، اللہ کے فضل سے میں بالکل تندرست ہوں، لیکن دفتر سے چونکہ مزید چھٹی ملنے کا کوئی اور راستہ نہیں، اس لئے میڈیکل سرٹیفکیٹ ہی بھیجنا پڑیگا۔

ان جیسے شخص سے یہ بات سنکر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دل پر بجلی گر گئی ہو، میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ بھی سوچا کہ یہ جعلی سرٹیفکیٹ بنوانا آپ کے لئے کیسے جائز ہوگا؟ اور اس مصنوعی تصدیق نامے کی بنیاد پر جو چھٹی آپ کو حاصل ہوگی، اس سے استفادہ آپ کے لئے درست ہوگا یا نہیں؟ نیز اس چھٹی کے دنوں کی جو تنخواہ آپ کو ملے گی، وہ آپ کے لئے حلال ہوگی یا نہیں؟، آدمی واقعی شریف تھے، یہ سنکر وہ بھی سکتے میں آگئے، کہنے لگے واقعۃً آج سے پہلے مجھے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں ہوئی، چونکہ دفتروں میں عام معمول یہی ہے کہ ضرورت کے وقت میڈیکل سرٹیفکیٹ بنواکر چھٹی حاصل کرلی جاتی ہے، اس لئے میں بھی بے سوچے سمجھے یہی کرتا رہا، پھر وہ پوچھنے لگے کہ کیا واقعی شدید ضرورت کے وقت بھی اس طرح چھٹی لینا جائز نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ اول تو صرف عزیزوں کا اصرار کوئی ایسی شدید ضرورت نہیں ہے، دوسرے اگر واقعی کوئی سخت ضرورت ہو تو وہ ضرورت بتاکر چھٹی کی درخواست دینی چاہئے، اگر اس ضرورت کی بنیاد پر چھٹی قواعد کے لحاظ سے مل سکتی ہوگی تو مل جائیگی، اور اگر اسکی بنیاد پر چھٹی نہ مل سکتی ہو تو بغیر تنخواہ کے رخصت لی جائے، جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ دے کر چھٹی لینے کا بہر حال

کوئی جواز نہیں، انہوں نے یہ سن کر میرے سامنے یہ اعتراف کیا کہ ابتک میں واقعی یہ گناہ بے سوچے سمجھے کر تا رہا ہوں، آج چونکہ مجھے صحیح بات کی طرف دھیان ہو گیا، اس لئے انشاءاللہ آئندہ کبھی اس طرح چھٹی نہیں لونگا۔

اس واقعے سے پہلے مجھے بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس قسم کے بظاہر دیانت دار حضرات بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے، کہ اس قسم کے جعلی سرٹیفکیٹ بنوانا جائز ہے، یا انہیں اسکی برائی کا احساس ہی نہیں ہوگا، اسکے بعد پتہ چلا کہ جھوٹ نے کیسے کیسے مقدس دلوں میں دھیرے دھیرے جگہ بنالی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارے ماحول میں کسی سرٹیفکیٹ کی کوئی وقعت نہیں رہی، اور حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لئے کوئی سرٹیفکیٹ دیکھنا یا نہ دیکھنا سب برابر ہے۔

پھر جو حضرات اس قسم کے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں ان کا معاملہ اور بھی زیادہ سنگین اور افسوسناک ہے، ظاہر ہے کہ یہ سرٹیفکیٹ کوئی ان پڑھ یا جاہل شخص جاری نہیں کر سکتا، تصدیق نامے وہی لوگ جاری کر سکتے ہیں جو نہ صرف تعلیم یافتہ ہوں، بلکہ کسی خاص شعبے میں انہیں کوئی مقام حاصل ہو، بالخصوص میڈیکل سرٹیفکیٹ تو کوئی ڈاکٹر ہی جاری کر سکتا ہے، اور ڈاکٹر کسی بھی معاشرے کا وہ باوقار اور ذمہ دار فرد ہوتا ہے جس کے اعتماد پر لوگ اپنی جانیں اسکے حوالے کرتے ہیں، اور خاص طور پر کسی مریض کی جسمانی کیفیت کے بارے میں اسکی زبان یا قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ معنی رکھتا ہے، اور اس پر زندگی کے بہت سے معاملات کے فیصلے ہوتے ہیں، اگر ایسی ذمہ دار شخصیت بھی یہ خیال نہ کرے کہ جو سرٹیفکیٹ اس کے قلم سے نکل رہا ہے، اسکی حیثیت ایک گواہی کی ہے، اور اس منصب کا حامل شخص بھی اپنی غیر ذمہ دارانہ بلکہ خلافِ واقعہ گواہی سے معاشرے کو گمراہ کرنے لگے تو آخر اس معاشرے کا کیا بنے گا؟، اگر اس قسم کے سرٹیفکیٹ مالی معاوضہ لے کر جاری کئے گئے ہوں، تب تو جھوٹ کے ساتھ رشوت کا

دوہرا گناہ بھی اسکے ساتھ وابستہ ہے، اور اگر محض ,,ہمدردی،، کے خیال سے جاری کر دیئے گئے ہوں تو یہ ایک ایسی ہمدردی ہے جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے، اور اس سے جو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اس سب وبال ایسے جعلی سرٹیفکیٹ جاری کرنے والوں کے نامہ اعمال کا لازمی حصہ ہے جس کا جواب ایک نہ ایک دن انہیں کہیں دینا پڑیگا۔

بعض مرتبہ یہ دلیل بھی سننے میں آتی ہے کہ اس قسم کے جعلی تصدیق نامے معاشرے میں اس درجہ رواج پاگئے ہیں کہ اب ان کا اجراء پیشہ ورانہ کاموں کا ایک حصہ بن چکا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسے سرٹیفکیٹ جاری کرنے سے پرہیز کرے تو لوگ اسکی طرف رجوع کرنا بند کر دیتے ہیں، اور وہ اپنی جائز آمدنی سے بھی محروم رہ جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل ,,عذرِ گناہ بدتر از گناہ،، کے مصداق ہے، الحمد للہ اسی گئے گذرے دور میں آج بھی بیشمار افراد وہ ہیں جنہوں نے کبھی اس قسم کی کسی پیشہ ورانہ بددیانتی کا ارتکاب نہیں کیا، وہ لوگ اپنی اس دیانت داری کی وجہ سے مر نہیں گئے، وہ زندہ ہیں، اور خدا کے فضل وکرم سے بہت اچھی طرح زندہ ہیں، خاص طور سے ڈاکٹر صاحبان کی بھاری تعداد بلکہ شاید اکثریت اب بھی ایسی ہی ہے کہ وہ اس قسم کے گھٹیا کاموں کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اس کے باوجود انہیں ناقدری کا کبھی شکوہ نہیں ہوا، وہ پوری عزت اور وقار کے ساتھ اپنے پیشہ ورانہ فرائض ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور انہیں نہ صرف یہ کہ کوئی مالی نقصان نہیں ہوا، بلکہ مالی حیثیت اور سماجی رتبے دونوں کے اعتبار سے وہ معاشرے میں بلند مقام رکھتے ہیں، معاشرے میں کسی برائی کا عام رواج درحقیقت اسی طرح ہوتا ہے کہ لوگ اس برائی کے آگے ڈٹنے کے بجائے اس کے سامنے ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں، اور ضمیر کی آواز کو دبا کر اس قسم کی بودی دلیلوں کے سائے میں پناہ لینے لگتے ہیں، اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ہمت کر کے برائی کے آگے ڈٹ جائے اور اسکے

سامنے شکست کھانے سے انکار کردے تو انجام کار فتح اسی کی ہو کر رہتی ہے، قرآنِ کریم نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا ہے کہ ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی اچھا انجام انہی کا ہے جو برائی سے بچتے ہیں۔

آج کل بہت سے مقاصد کے حصول کے لئے ,,کیرکٹر سرٹیفکیٹ،، کی بھی ضرورت پڑتی رہتی ہے، اس سرٹیفکیٹ میں کسی شخص کے بارے میں یہ تصدیق کی جاتی ہے کہ وہ اچھے اخلاق و کردار کا حامل ہے، اور میں اسے اتنی مدت سے جانتا ہوں، یہ سرٹیفکیٹ بھی بکثرت سوچے سمجھے بغیر جاری کر دیئے جاتے ہیں، اور اس بات کی پرواہ نہیں کی جاتی کہ جس شخص کے بارے میں یہ تصدیق کی جارہی ہے وہ اسکا اہل ہے یا نہیں، اور یہ بات بھی جھوٹ موٹ ہی لکھدی جاتی ہے کہ میں انہیں پانچ سال سے یا دس سال سے جانتا ہوں۔

ایک مرتبہ میں ایک فقہی کانفرنس میں شرکت کے سلسلے میں سعودی عرب کے شہر جدہ میں مقیم تھا، ایک صاحب مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے، اور انہوں نے ایک بڑے ثقہ بزرگ کا ایک خط مجھے دیا، اس خط میں انہوں نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ ان صاحب کو پاکستانی سفارت خانے سے پاسپورٹ بنوانا ہے، اس میں ان کی مدد کردیجئے، میں نے دریافت کیا کہ آپ کو یہاں سے پاسپورٹ بنانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ اس پر انہوں نے وہ درخواست میرے ہاتھ میں تھمادی جو انہوں نے پاکستانی کونسلر کے نام لکھی تھی، اس درخواست میں لکھا تھا کہ میرا پاسپورٹ سعودی عرب میں گم ہوگیا ہے، اس لئے نیا پاسپورٹ بنوادیا جائے، اور شاید اس درخواست کے ساتھ کچھ تصدیقات بھی تھیں، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ پاکستان سے کب آئے تھے اور پاسپورٹ کہاں اور کیسے گم ہوا؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے جو باتیں کیں، ان پر مجھے اطمینان نہ ہوا، اور میں نے یہ کہہ کر ان سے معذرت کرلی کہ چونکہ میں پاسپورٹ کی گمشدگی کے بارے میں

کچھ نہیں جانتا، اس لئے اس بنیاد پر کوئی سفارش کرنا میرے لئے جائز نہیں ہے، وہ صاحب خاصے ناراض ہو کر تشریف لے گئے، اور یہ شکوہ کرتے رہے کہ میں نے ان کا یہ چھوٹا سا کام کرنے سے کیوں انکار کیا، بعد میں پتہ چلا کہ در حقیقت وہ ہندوستانی نیشنل تھے، اور ایک عرصہ تک سعودی عرب میں تلاشِ روزگار سے مایوس ہو چکے تھے، اب کسی نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستان جاکر روزگار تلاش کریں، اور اس کے لئے انہوں نے یہ حیلہ اختیار کیا تھا کہ پاسپورٹ گم ہونے کی فرضی کہانی بنائی تھی، تا کہ اس طرح پاکستان کا ویزا نہیں، بلکہ اسکی قومیت ہی کا ثبوت پاسپورٹ کی شکل میں کیوں نہ حاصل کر لیا جائے۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ اس طرح لوگ کرتے ہی رہتے ہیں، لیکن مجھے حیرت ان بزرگ پر تھی جنہوں نے ان صاحب کو میرے پاس بھیجا، اور مجھے سفارشی خط بھی لکھا کہ میں ان کی مدد کر دوں، وہ کوئی جھوٹے یا دھوکے باز نہیں تھے، بلکہ بڑے قاعدے کے آدمی تھے، لیکن ان کے ذہن میں بس یہی پہلو غالب رہا کہ ایک ضرورت مند شخص کی مدد کرنی چاہئے، یہ انہوں نے نہیں سوچا کہ جھوٹ بول کر یہ کام کرنا کتنا بڑا گناہ اور اپنے ملک کے ساتھ کتنی بڑی بے وفائی ہے، کسی شخص کے چہرے پر اسکے اندرونی عزائم لکھے ہوئے نہیں ہوتے، اور اس طرح کی ,,ہمدردی،، کے نتیجے میں وہ کسی تخریب کار، کسی دہشت گرد یا کسی خطرناک جاسوس کو اپنے ملک میں بھیجنے کے بھی مجرم ہو سکتے ہیں، اور اگر اسکے نتیجہ میں اپنے ہم وطنوں کی جانیں گئیں، یا کوئی اور تخریبی واقعہ پیش آیا تو اس جرم کی ذمہ داری سے وہ بھی بری نہیں ہونگے۔

اس قسم کی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ہمارے معاشرے میں کسی شخص کے حق میں کوئی تصدیق نامہ جاری کر دینا ایک کھیل بنکر رہ گیا ہے، اور اچھے اچھے ثقہ قسم کے لوگ بھی اس میں جھوٹ سچ کا امتیاز نہیں کرتے، بلکہ اسے جھوٹ میں شامل ہی نہیں سمجھتے، اس صورتِ حال نے معاشرے میں جو تباہی مچا رکھی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں،

لیکن مسئلہ اس صورتِ حال کی مذمت کرتے رہنے سے حل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اسے تبدیل کرنے کا پختہ عزم نہ کرے، دوسروں پر نہ سہی، لیکن ہر شخص کو اپنے آپ پر مکمل اختیار حاصل ہے جسے کام میں لائے بغیر یہ صورتِ حال تبدیل نہیں ہوگی۔

۲۹/ محرم ۱۴۱۵ھ
۱۰/ جولائی ۱۹۹۴ء

لوگ کہتے ہیں

انسانی نفس کی چوریوں سے آنحضرت ﷺ سے زیادہ کون باخبر ہوسکتا ہے؟ چنانچہ آپ ﷺ نے جو حکم بھی دیا، اس کے تمام مضمرات کو سمجھتے ہوئے ایسے تمام راستوں کو بھی بند کیا جو اس حکم کی خلاف ورزی کی طرف لے جا سکتے ہیں، اور ان چور دروازوں کی بھی نشان دہی فرمائی جہاں سے انسان کی نفسانی خواہشات حیلے بہانے تلاش کرسکتی ہیں، نفس انسانی کی ایک فطرت یہ ہے کہ جس برائی کا الزام وہ براہِ راست اپنے سر لینا نہیں چاہتا، اسے کسی اور شخص کے کندھے پر رکھ کر انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ مقصد بھی حاصل ہو جائے، اور اپنے اوپر حرف بھی نہ آئے، آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کے سلسلے میں انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کو نہایت لطیف اور بلیغ پیرائے میں بیان فرمایا ہے، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

,,بِئْسَ مَطِيَّةُ الْكَذِبِ: يَقُوْلُ النَّاسُ،،

جھوٹ کی بدترین سواری یہ فقرہ ہے کہ ,,لوگ یوں کہتے ہیں،،

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ براہِ راست جھوٹ بولنے سے کتراتے ہیں، وہ بے بنیاد اور بے تحقیق باتیں لوگوں کے سر پر رکھ کر کہہ دیتے ہیں، ''لوگ تو یوں کہتے ہیں'' ''لوگوں میں تو یہ بات مشہور ہے، لوگوں کا کہنا تو یہ ہے، یہ وہ فقرے ہیں جو جھوٹ کے الزام سے بچنے کے لئے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں، اور جھوٹ جو اپنے پاؤں چل کر

نہیں پھیل سکتا، اس قسم کے فقروں پر سوار ہوکر پھیل جاتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس فقرے کو ,,جھوٹ کی سواری،، قرار دیا۔

یہ تو ایک لطیف اور استعاراتی پیرایۂ بیان تھا، جو حقائق پر نگاہ رکھنے والوں کے لئے بڑا مؤثر اور دل میں اتر جانے والا ہے، لیکن اسی بات کو آپ ﷺ نے ایک اور حدیث میں بالکل سادہ اور عام فہم الفاظ میں بھی ارشاد فرمایا جسے ہر شخص سنتے ہی سمجھ جائے، فرمایا:

,,كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ،،

,,انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات بھی کافی ہے کہ وہ ہر وہ بات دوسروں کو سنانے لگے جو اس نے کہیں سے بھی سن لی ہو،،

دونوں ارشادات کا منشا درحقیقت یہ بتانا ہے کہ ایک سچے مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہر کچی پکی بات کہیں سے سنکر اسے آگے چلادے، اس طرح افواہیں جنم لیتی ہیں، جھوٹی باتیں معاشرے میں پھیلتی ہیں، اور متضاد افواہوں کے گرد وغبار میں حقیقت کا چہرہ مسخ ہوکر رہ جاتا ہے، قرآنِ کریم نے بھی ایسی بے تحقیق افواہیں پھیلانے کی پرزور مذمت کی ہے، آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں یہ منافقین کا وطیرہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان ایسی افواہیں پھیلاتے رہتے تھے جن سے لوگوں میں بے چینی اور تشویش پیدا ہوتی تھی، اور دشمنوں کو فائدہ پہنچتا تھا، قرآنِ کریم نے ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ (۴:۸۳)

,,جب بھی امن یا خوف (جنگ) کے بارے میں انہیں کوئی بات پہنچتی ہے، وہ اسے پھیلانے میں لگ جاتے ہیں، اگر وہ اسے (پھیلانے کے بجائے) ذمہ دار لوگوں تک پہنچاتے تو ایسے لوگ اسکی حقیقت جان لیتے

جو اسکی کھود کرید (تحقیق) کر سکتے ہیں،،

قرآن و سنت کے ان ارشادات سے اسلام کا جو مجموعی مزاج سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جبتک کسی بات کی مناسب تحقیق نہ ہو جائے، اس وقت تک اُسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا جائز نہیں، اگر کوئی شخص اس قسم کی بے تحقیق بات کو پورے وثوق اور یقین سے بیان کرے تب تو ظاہر ہے کہ وہ خلافِ واقعہ اور غلط بیانی کے ذیل میں آتا ہے، لیکن اگر بالفرض وثوق کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے ,,لوگ کہتے ہیں،، جیسے فقرے کا پردہ رکھ کر بیان کرے، لیکن مقصد یہی ہو کہ سننے والے اُسے سچ باور کرلیں، تب بھی مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں ایسا کرنا جائز نہیں۔

دراصل اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ہر مسلمان معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بن کر زندگی گذارے، اس کے منہ سے جو بات نکلے، وہ کھری اور سچی بات ہو، اور وہ اپنے کسی قول و فعل سے غیر ذمہ داری کا ثبوت نہ دے، قرآنِ کریم ہی کا ارشاد ہے کہ :

﴿مَایَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلاَّ لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾

انسان جو بات بھی زبان سے نکلتاہے، اسے (محفوظ رکھنے کے لئے)
ایک نگہبان ہر وقت تیار ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان یہ نہ سمجھے کہ جو بات وہ زبان سے نکال رہا ہے، وہ فضا میں تحلیل ہو کر فنا ہو جاتی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کہیں ریکارڈ ہو رہی ہے، اور آخرت میں اس سارے ریکارڈ کا ہر شخص کو جواب دینا ہو گا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے بہت سی احادیث میں زبان کو قابو میں رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔

لیکن ان تمام تعلیمات کے برعکس آج کل ہماری زبانیں اتنی بے قابو ہو گئی ہیں کہ ان کے استعمال میں ذمہ داری کا تصور ہی باقی نہیں رہا، جو کوئی اڑتی ہوئی بات کہیں سے ہاتھ آگئی اسے تحقیق کے بغیر دوسروں تک پھیلانے اور پہنچانے میں کوئی جھجک محسوس

نہیں کی جاتی، اور لوگ اسے بے دھڑک ایک دوسرے سے اس طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں، کہ فضا میں افواہوں کا ایک طوفان ہمہ وقت بپا رہتا ہے۔

یوں تو ہر قسم ہی کی خبر میں احتیاط اور ذمہ داری کی ضرورت ہے، لیکن جس خبر کے نتیجے میں کسی دوسرے پر کوئی الزام لگتا ہو، اس میں تو احتیاط کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، کیونکہ اس سے کسی دوسرے انسان کی عزت و آبرو کا مسئلہ وابستہ ہے، اور بلا تحقیق افواہوں کی بنیاد پر کسی انسان کی عزت کو مجروح کرنا صرف جھوٹ ہی نہیں، بہتان بھی ہے، اور حقوق العباد میں سے ہونے کی بنا پر اور زیادہ سنگین جرم ہے، لیکن ہمارے موجودہ ماحول میں کسی شخص پر کوئی الزام عائد کرنا ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، جس میں کسی تحقیق اور ذمہ داری کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، بالخصوص اگر کسی شخص سے ذاتی، جماعتی یا سیاسی اختلاف ہو تو اسکی غیبت کرنا، اس پر بہتان باندھنا اور اسے طرح طرح سے بے آبرو کرنا حلال طیب سمجھ لیا گیا ہے۔

اس صورتِ حال کے یہ نتائج بد کھلی آنکھوں ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ فضا جھوٹی خبروں سے اتنی آلودہ ہو چکی ہے کہ حقیقتِ حال کا پتہ لگانا دشوار ہے اور اسکی وجہ سے کسی کو کسی پر اعتبار نہیں رہا، نیز جھوٹ کی اس قدر کثرت نے غلط بیانی اور بہتان طرازی کی برائی دلوں سے نکال دی ہے، اور ہر غیر ذمہ دار شخص کو یہ حوصلہ ہو گیا ہے کہ وہ بے بنیاد سے بے بنیاد بات دھڑلے سے معاشرے میں پھیلا دے، اور پھر ایک انتہائی خطرناک بات یہ ہے کہ غلط الزامات کے سیلاب میں حقیقی مجرموں کو بھی فی الجملہ پناہ مل گئی ہے، یعنی جو لوگ واقعی خطاکار اور بد عنوان ہیں، انہیں بدنامی کا زیادہ خطرہ باقی نہیں رہا، اس لئے کہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر کوئی خبر ہماری بد عنوانی کے بارے میں اڑی تو وہ اسی طرح مشکوک سمجھی جائیگی جیسے اور بہت سی بے تحقیق باتوں کو سنجیدہ لوگ مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، چنانچہ بد عنوان افراد آرام سے بد عنوانیوں میں ملوث رہتے ہیں، اور بہت

سے بے گناہوں کے دامن پر داغ لگ جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ماحول میں غیر ذمہ دارانہ باتیں بے حد پھیل گئی ہیں، لیکن اس کا علاج بھی دور دور سے اس صورتِ حال کی مذمت کرتے رہنا نہیں ہے، بلکہ ہر برائی کا علاج یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ یہ عزم کرلے کہ دوسرے لوگ خواہ کچھ کرتے رہیں، کم از کم وہ اپنے قول و فعل میں ذمہ داری کا مظاہرہ کریگا، اور بے تحقیق باتوں کو پھیلا کر افواہ طرازی کا مرتکب نہیں ہوگا۔ ہر شخص کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ اپنے طرز عمل میں تبدیلی لاکر معاشرے سے کم از کم ایک غیر ذمہ دار شخص ضرور کم کرسکتا ہے، اور اس کے نتیجے میں کم از کم اپنے آپ کو اللہ تعالی کے سامنے جھوٹ کے گناہ سے بچا سکتا ہے، اور پھر تجربہ یہ ہے کہ جب افراد میں یہ فکر پیدا ہو جاتی ہے تو ایک شخص کا طرزِ عمل دوسرے کے لئے بھی ایک نمونہ بنتا ہے، اور ایسے نمونوں میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو تا جائے تو اسی طرح معاشرہ سدھار کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے، آج ہماری ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم معاشرتی برائیوں کے رواجِ عام کو مایوسی کا ذریعہ بنانے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے سے خود بھی بچیں، اور دوسروں کو بھی بچائیں، اس کے بجائے اپنے عمل اور عزم سے بدعنوانی کی تاریکیوں میں امید کی مشعلیں روشن کریں، جن سے باعزت اور پاکیزہ زندگی کی طرف بڑھنے کا حوصلہ ابھرے، اس کے بغیر کبھی کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتی۔

۱۴/ صفر ۱۴۱۵ھ

۲۴/ جولائی ۱۹۹۴ء

ایک خوشی کا واقعہ

قرآنِ کریم نے آنحضرت ﷺ کو دنیا میں بھیجنے کے جو مقاصد بیان فرمائے ہیں، ان میں سے ایک اہم مقصد یہ ہے کہ آپ ,,کتاب،، (یعنی قرآنِ کریم) اور ,,حکمت،، کی تعلیم دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے قول اور فعل دونوں کے ذریعے امت کو قرآنِ کریم اور حکمت کی تعلیم دی۔ آپ ﷺ کے اقوال وافعال ہی کو اصطلاح میں ,,حدیث،، یا ,,سنت،، کہا جاتا ہے، اور یہ قرآنِ کریم کے بعد شریعت کا دوسرا بڑا مأخذ ہے، بلکہ خود قرآنِ کریم کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے بھی ,,حدیث،، یا ,,سنت،، کی رہنمائی لازمی ہے، اس لئے اس مأخذ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

,,حدیث،، کی اسی اہمیت کی وجہ سے اس امت نے حدیث کو اپنی صحیح شکل وصورت میں محفوظ رکھنے اور اسکی چھان بین کے لئے عملی میدان میں جو محنتیں کی ہیں اسکی نظیر کسی مذہب وملت میں موجود نہیں ہے، آنحضرت ﷺ کی احادیث کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لئے اس امت کے علماء نے ,,حدیث،، کے حوالے سے اتنے بہت سے باقاعدہ علوم کی بنیاد ڈالی کہ ان کا صرف تعارف بھی ایک ضخیم کتاب کی وسعت چاہتا ہے، چونکہ تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پریس وغیرہ کی سہولیات موجود نہیں تھیں، اس لئے ایک طرف تو احادیث کی نشرواشاعت میں بڑی مشکلات تھیں، اور دوسری طرف اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ جعلساز قسم کے لوگ غلط باتوں کو حدیث کہہ کر پیش

کریں اور واقعۃً بہت سے بدنہاد افراد نے ایسا کیا بھی، اس لئے علماء امت نے ان مختلف علوم کے ذریعے حدیث کے گرد ایک حفاظتی حصار قائم کردیا، اور وہ لگے بندھے پیمانے وضع کردیئے جنکی روشنی میں کسی حدیث کے اصلی یا جعلی ہونے کا پتہ چل سکے۔

اول تو ,,احادیث،، کے بارے میں یہ پابندی لگادی گئی کہ کوئی حدیث سند کے بغیر بیان نہیں کی جائیگی، یعنی جو شخص بھی کوئی حدیث بیان کرے (جسے اصطلاح میں ,,راوی،، کہتے ہیں) اس کے ذمے ضروری ہے کہ وہ یہ بتائے کہ یہ حدیث اس کو کس طرح پہنچی؟ جب تک وہ اپنے آپ سے لے کر آنحضرت ﷺ تک کے تمام واسطوں کو بیان نہ کرے، اسکی روایت کی ہوئی حدیث قابل اعتماد نہیں سمجھی جائیگی، پھر محدثین کی ایک جماعت نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کردیا کہ جتنے لوگ احادیث زبانی یا تحریری طور پر بیان کرتے ہیں، ان سب کی زندگی کا پورا کچا چٹھا جمع کر کے یہ دیکھا کہ وہ اپنی دیانت وامانت، نقل وروایت کی ذمہ داری اور قوتِ حافظہ وغیرہ کے لحاظ سے کتنے قابل اعتماد ہیں؟۔ اس طرح ایک مستقل علم کی بنیاد پڑی جسے ,,اسماء الرجال،، کا علم کہا جاتا ہے، اور یہ اسی علم کا کرشمہ ہے کہ آج آپ حدیث کی کوئی بھی کتاب اٹھا لیجئے اور اس میں کسی بھی جگہ سے کوئی حدیث نکال لیجئے، اسکی جو مکمل سند مذکور ہوگی، اس میں سے کسی بھی راوی کو چن لیجئے، اس راوی کے وہ تمام حالات آپ کو ,,اسماء الرجال،، کی کتابوں میں مل جائیں گے، جو اسکی روایت کے قابلِ اعتماد یا نا قابلِ اعتماد ہونے پر روشنی ڈال سکتے ہیں، اگر اس کے ایسے حالات معلوم نہ ہونگے تو کم از کم یہ بات مل جائیگی کہ اس کے حالات معلوم نہیں ہوسکے، ایسے شخص کو ,,مجہول،، یا ,,مستور،، کہا جاتا ہے، اور اسکی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا۔

یہ تو میں نے حدیث کی تحقیق کے صرف ایک رخ کا ذکر کیا ہے، اس طرح کی بہت سی جہتوں سے محدثین نے احادیث کی چھان پھٹک کا کارنامہ اللہ تعالیٰ کی خاص

توفیق سے اس طرح انجام دیا ہے کہ اسے صرف آنحضرت ﷺ کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ جب ایک ہوائی جہاز کسی ائیر پورٹ پر اتر کر کھڑا ہوتا ہے تو عملے کے مختلف گروہ اس پر اپنے اپنے کام شروع کر دیتے ہیں، کوئی سیڑھی لگا کر مسافروں کو اتارتا ہے، کوئی لفٹر لگا کر سامان جہاز سے نکالتا اور اسے کنوئیر بیلٹ تک پہنچاتا ہے، کوئی تخریب کاری سے جہاز کی حفاظت کے لئے مسلح ہو کر اس کے آس پاس چکر لگانا شروع کر دیتا ہے، کوئی جہاز کے پرزوں کی چیکنگ شروع کر دیتا ہے، کوئی اس میں آئندہ سفر کے لئے پیٹرول ڈالنا شروع کر دیتا ہے، کوئی کیبن کی صفائی پر لگ جاتا ہے، غرض مختلف قسم کے لوگ بیک وقت اپنا اپنا کام کر کے اسے آئندہ سفر کے لئے تیار کر دیتے ہیں، بالکل اسی طرح جب ایک شخص اس دور میں کوئی حدیث روایت کرتا تو محدثین کے مختلف گروہ اس روایت کی سند اور متن پر اپنا اپنا تحقیقی کام شروع کر دیتے تھے، کچھ لوگ اس روایت کو احادیث کے مجموعوں میں درج کرنے کیلئے اسکی تقسیم (Classification) کرتے، کچھ لوگ اس کی سند کے ایک ایک راوی کو خوردبین لگا لگا کر چیک کرتے، کچھ لوگ یہ دیکھتے کہ جن اشخاص کی طرف یہ روایت منسوب کی جا رہی ہے، تاریخی طور پر انکی طرف یہ نسبت ممکن بھی ہے یا نہیں؟ کچھ حضرات اس حیثیت سے روایت کا جائزہ لیتے کہ یہی بات کسی اور نے بھی روایت کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو دونوں روایتوں میں کیا فرق ہے؟ کچھ حضرات یہ دیکھتے کہ اسی موضوع پر جو دوسرا مسلم مواد موجود ہے اسکی روشنی میں یہ روایت کس حد تک قابلِ تسلیم ہو سکتی ہے؟ کچھ حضرات اس قسم کی معلومات کی بنیاد پر یہ فیصلہ کرتے کہ یہ حدیث استناد کے اعتبار سے کس کیٹگری میں داخل ہوتی ہے؟ پھر کچھ حضرات نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کیا ہوا تھا کہ جو "حدیث" معتبر ثابت ہو، اس سے فقہی احکام مستنبط کریں، اور امت کو یہ بتائیں کہ "حدیث" کی روشنی میں ان کے لئے راہ عمل کیا ہے؟ اس غرض کے لئے انہیں ایک موضوع پر روایت کی جانے والی احادیث کا انتہائی

گہری نظر سے تقابلی مطالعہ کرنا پڑتا تھا، جو ایک مستقل عرق ریزی کا طالب تھا، غرض محدثین اور فقہاء کے یہ مختلف گروہ ہر حدیث پر اپنے اپنے حصے کا کام کر کے اس کے بارے میں ضروری معلومات مہیا فرمادیتے تھے۔

احادیث کے جو مجموعے ابتدائی صدیوں میں تیار ہوئے، ان میں عموماً یہ تمام معلومات یکجا نہیں تھیں، بلکہ حدیثیں سند کے ساتھ صرف بیان کردی گئی تھیں، بعد میں علماء امت نے مذکورہ تمام معلومات کو ہر ہر متعلقہ حدیث کے تحت یکجا کرنے کے لئے حدیث کے ان مجموعوں کی شرحیں لکھی ہیں، تاکہ جب کوئی شخص حدیث کے ان مجموعوں کا مطالعہ کرے تو وہ ہر حدیث کے ساتھ ہی ساتھ ان تمام معلومات سے بھی مستفید ہو تا جائے، چنانچہ حدیث کے ہر اہم مجموعے کی مختلف شرحیں مختلف زمانوں میں لکھی جاتی رہی ہیں، اور حالات زمانہ کے تغیر سے ان کے مضامین وغیرہ میں بھی اضافہ ہو تارہاہے، اس طرح ,,شرح حدیث،، ایک مستقل موضوع بن گیا، جس پر ہر زمانے کے علماء اپنے اپنے دور کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق خامہ فرسائی کرتے رہے، چونکہ حدیث کے تمام مجموعوں میں ان چھ کتابوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی جو ,,صحاح ستہ،، کے نام سے مشہور ہیں، اس لئے زیادہ تر شرحیں انہی چھ کتابوں کی لکھی گئی ہیں۔

آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے ,,شرح حدیث،، کے اس عظیم کام میں برِ صغیر پاک وہند کے علماء کو خصوصی امتیاز عطا فرمایا، اور گذشتہ دو سو سال میں احادیث کی جتنی شرحیں اس خطے میں لکھی گئی ہیں، عالم اسلام کے کسی دوسرے ملک میں نہیں لکھی گئیں، مصر کے مشہور محدث علامہ سید محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ علم حدیث کا مرکز اس زمانے میں برِ صغیر پاک وہند کی طرف منتقل ہو گیا ہے، اور علماء ہند نے احادیث کی شروح پر جو خدمتیں کی ہیں وہ علم حدیث کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے علمی دنیا کا کونسا فرد ناواقف ہوگا؟ قیامِ پاکستان کے لئے ان کی گرانقدر خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، اور انہی خدمات کی وجہ سے قائداعظم مرحوم نے پاکستان کا جھنڈا پہلی بار خود لہرانے کے بجائے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو منتخب کیا، اور انہی کے ہاتھوں سے مغربی پاکستان میں سبز ہلالی پرچم لہرایا گیا، انہوں نے بھی تحریک پاکستان سے پہلے حدیث کی مشہور کتاب ,,صحیح مسلم،، کی شرح ,,فتح الملہم،، کے نام سے لکھنی شروع کی تھی۔ اس کتاب کی تین جلدیں بڑے سائز پر شائع بھی ہوچکی تھیں اور انہوں نے دنیا بھر کے اہل علم سے خراجِ تحسین حاصل کیا تھا، ,,صحیح مسلم،، احادیث کے مجموعوں میں ,,صحیح بخاری،، کے بعد دوسرے نمبر پر ہے، اور اسکی ایک مبسوط شرح کی ضرورت تمام اہل علم محسوس کرتے تھے، حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضرورت کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا تو ساری عملی دنیا نے اس پر مسرت کا اظہار کیا، چونکہ کتاب کسی ایک خطے کے لئے نہیں، بلکہ پوری اسلامی دنیا کے اہل علم کے لئے لکھی جارہی تھی، اس لئے علامہ نے اسے عربی میں لکھا جو پورے عالم اسلام کی مشترک علمی زبان ہے، لیکن ابھی علامہ نے ,,صحیح مسلم،، کا نصف حصہ بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ ہندوستان میں قیام پاکستان کی تحریک شروع ہوگئی، اور علامہ نے اپنے آپ کو پاکستان کی خدمت کے لئے وقف کردیا، اور شب وروز کی ہنگامہ خیز مصروفیات میں اس کتاب کی تالیف رک گئی، پاکستان بننے کے بعد وہ پاکستان کی تعمیر میں دن رات مصروف رہے، اس لئے یہاں آکر بھی اسکی تکمیل نہ کرسکے، یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں آپ کی وفات ہوگئی، اور یہ کام تشنۂ تکمیل رہ گیا، برِّ صغیر کے علاوہ عرب ممالک کے علماء بھی اس اشتیاق اور انتظار میں تھے کہ کوئی اور شخص اس تالیفی منصوبے کی تکمیل کرے، تاکہ یہ عظیم الشان علمی کارنامہ، جس نے ایک بڑے خلا کو پر کیا ہے ادھورا نہ رہ جائے۔

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے حکم سے اللہ تعالی کے نام پر ۱۹۷۶ء میں اس شرح کی تکمیل کا کام شروع کیا تھا، ,, تکملہ فتح الملہم،، کے نام سے، اسکی چار ضخیم جلدیں ابتک شائع بھی ہو چکی ہیں، اپنی گوناگوں مصروفیات کی بناپر میں بمشکل ڈیڑھ دو گھنٹہ یومیہ اس کام میں صرف کرپاتا تھا، اور پے در پے سفروں کی وجہ سے بیچ میں طویل وقفے بھی آجاتے تھے، لیکن اللہ تعالی کا فضل وکرم ہے کہ اٹھارہ سال نو مہینے کے بعد اس ہفتے (۳ راگست ۱۹۹۴ء کو) یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، ایک طویل سفر کے مسافر کو منزل پر پہنچ کر جو سرور اور سکون میسر آتا ہے، دل چاہا کہ اپنے قارئین کو بھی اسکی مسرت میں شریک کروں، الحمد للہ اس ,, تکملے،، کی چار جلدیں تو پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں، پانچویں جلد کی کمپوزنگ مکمل ہو چکی ہے، اور اب وہ پریس جانے والی ہے، چھٹی جلد کی کمپوزنگ شروع ہو چکی ہے، اور امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ چھ ماہ میں تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل یہ چھ جلدیں مکمل طور سے منظر عام پر آجائیں گی۔

میں نے ,, صحیح مسلم شریف،، کے جس حصے کی شرح لکھی ہے، وہ زیادہ تر معاشی، معاشرتی اور سیاسی موضوعات کی احادیث پر مشتمل ہے، اور موجودہ دور میں ان میدانوں میں جو نت نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں میں نے کوشش کی ہے کہ ان پر تحقیقی اور فکری مباحث اس کتاب میں آجائیں۔ آنحضرت ﷺ کی احادیث زندگی کے ہر گوشے کے لئے بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہیں، اور یہ ہر دور کے اہل علم کا کام ہے کہ وہ اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق ان احادیث سے یہ رہنمائی حاصل کر کے امت کو اس سے آگاہ کریں، میں نے اپنی بساط کی حد تک محض اللہ تعالی کی توفیق کے سہارے اس کتاب کے ذریعے یہ فریضہ ادا کرنے کی ادنی کوشش کی ہے، اور یہ اللہ تعالی کا فضل وکرم ہے کہ عالم اسلام کے معروف اہل علم ودانش نے اس کوشش کی پذیرائی کی ہے، عالم اسلام کے اہل قلم اپنے تحقیقی کاموں میں اس کتاب کے حوالے دے رہے ہیں، اور اس پر ایسے تبصرے

لکھے جارہے ہیں جو میرے لئے حوصلہ افزائی کا بھی باعث ہیں، اور بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے ملک کی نیک نامی کا بھی۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کاوش کی قبولیت اور امت کیلئے اسکے مفید ہونے کی دعا فرمائیں، آج تقریباً انیس سال کی محنت کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے شب وروز کے بہترین اوقات وہ تھے جو میں نے خاموشی کے ساتھ اس کتاب کی تیاری پر صرف کئے، امت مسلمہ کی ایک اہم علمی ضرورت پوری کرنے کے جذبے کے علاوہ اس میں میرا ذاتی فائدہ صرف اس امید کی صورت میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی سنت کے خادموں پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہو، تو ان کی کسی آخری صف میں اس خطاکار پر بھی اس بارش کے کچھ چھینٹے پڑ جائیں، قارئین سے اسی دعا کی درخواست ہے۔

۲۹/ صفر ۱۴۱۵ھ

۸/ اگست ۱۹۹۴ء

ایک اُلٹی سوچ

,,بٹ کے رہے گا ہندوستان،،۔ ,,بن کے رہے گا پاکستان،،۔ ,,سینے پر گولی کھائیں گے۔ پاکستان بنائیں گے،،۔ ,,پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ إلا اللهُ!،، یہ ولولہ انگیز نعرے تھے جنکی گونج میں ہماری عمر کے لوگوں کی آنکھ کھلی۔ آج بھی جب اس جوش اور جذبے کا تصور آتا ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت بچے بچے کے دل میں موج زن تھا، تو قلب روح کی گہرائیوں میں پاکیزگی کی ایک لہراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اسی مخلصانہ اجتماعی جذبے کی برکت تھی کہ پیچ در پیچ سازشوں کے عین درمیان اللہ تعالی نے ہمالیہ کے دامن میں پھیلا ہوا یہ خطۂ زمین ,,پاکستان،، کی صورت میں ہمیں محض اپنے فضل وکرم سے عطا فرمایا، آج اس تاریخ ساز واقعے کو سینتالیس سال گذر گئے، اور جن حسین تصورات اور بلند ولولوں کے ساتھ یہ ملک حاصل کیا گیا تھا جب ان کا موازنہ اپنے موجودہ حالات سے کیا جاتا ہے تو بیشک یہ محسوس ہوتا ہے کہ ؎

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بہ کجا؟

سینتالیس سال کے اس طویل عرصے میں ہم ان پاکیزہ جذبات کی اعلی سطح سے نیچے گرتے گرتے کہاں جا پہنچے ہیں؟ اس کا اندازہ کرنے کیلئے کسی بھی صرف ایک دن کے اخبار کا مطالعہ کافی ہے، حالات کی خرابی اپنی جگہ ہے، اور قوموں کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آیا ہی کرتے ہیں، لیکن کسی بھی قوم کی زندگی میں سب سے زیادہ تشویشناک مرحلہ وہ ہوتا ہے

جب حالات کی خرابی کے ساتھ ساتھ اس کی مت الٹی ہو جائے، اور وہ اصلاحِ حال کی کوشش کرنے کے بجائے الٹی سمت میں سوچنا شروع کر دے، فانی مرحوم نے کسی ایسی ہی صورتِ حال کے لئے کہا تھا کہ ؎

ڈوبنے والوں کو موجوں نے بہت کچھ پلٹا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

لہذا موجودہ حالات کی خرابی سے زیادہ تشویش اس بات سے ہوتی ہے کہ ایسے حالات میں بھانت بھانت کی بولیاں قوم کو الٹی سمت میں سوچنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔

مثلاً یہ عجیب وغریب معاملہ ہے کہ جب کبھی پاکستان ہماری بداعمالیوں کی بنا پر کسی المیے سے دوچار ہوتا ہے، یا اسکے سیاسی حالات خراب ہوتے ہیں، یا اسے بدامنی یا باہمی جھگڑوں سے سابقہ پیش آتا ہے تو کہیں نہ کہیں سے یہ آواز ضرور اٹھنی شروع ہو جاتی ہے کہ یہ ملک بنا ہی غلط تھا، اور وہ لوگ برحق تھے جو پاکستان قائم کرنے کے بجائے متحدہ ہندوستان کے قائل تھے، جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تو اس وقت بھی یہ پروپیگنڈا بڑے شدومد کے ساتھ کیا گیا کہ اس کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کا نظریہ بھی ٹوٹ گیا، اور آج جب کہ ہم گوناگوں خلفشار سے دوچار ہیں ایک بار پھر اسی قسم کی باتیں کی جارہی ہیں، لیکن سینتالیس سال بعد اس قسم کی باتوں کا مقصد کوئی واضح نہیں کرتا، یعنی یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اگر ملک غلط بنا تھا تو اب کیا کرنا چاہئے؟ لیکن اس مرحلے پر نظریۂ قیامِ پاکستان کی تردید کا بظاہر منطقی تقاضا اس کے سوا اور کیا ہے کہ جب ملک بنا ہی غلط تھا تو (خاکم بدہن) اب اس کے وجود کا بھی کوئی جواز نہیں، اور آج اگر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ جس بنیاد پر پاکستان قائم کیا گیا تھا، وہ بنیاد درست نہیں تھی تو پھر اس بھول کی تلافی کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اپنی سابقہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ملک چاندی کی کشتی میں رکھ کر ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔ امانت ودیانت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی بات کا

یہ منطقی نتیجہ بھی برملا کہہ دیا کریں، لیکن شاید ابھی صاف گوئی کا اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوا، اس لئے صرف پہلی بات کہہ کر اسکے نتائج سامع کی فہم وبصیرت پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے اپنی بدعملی سے اس ملک کو جو اسلام کے مقدس نام پر حاصل کیا گیا تھا، ایسے الجھے ہوئے مسائل کی سرزمین بنادیا ہے جنہیں سلجھانے کا کام مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے، لیکن یہ عجیب وغریب فلسفہ ہے کہ اس صورتِ حال کی ذمہ داری اپنی بدعملی کے بجائے اس نظریے پر ڈال دی جائے جس کے تحت یہ ملک بنایا گیا تھا، اور اپنی بدحالی کا ذمہ داران رہنماؤں کو ٹھرایا جائے جنہوں نے خون پسینہ ایک کر کے اس ملک کی تعمیر میں حصہ لیا تھا، اگر ایک باپ اپنی اولاد کے لئے کوئی شاندار مکان تعمیر کر کے جائے، اور بعد میں وہ اولاد آپس میں لڑ بھڑ کر اپنی نااہلی سے اس مکان کو خراب کر دے تو کیا اس خرابی کا قصوروار وہ باپ ہے جس نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی اس مکان کی تعمیر پر صرف کی؟ کیا کوئی شخص بہ قائمی ہوش وحواس یہ کہہ سکتا ہے کہ باپ نے یہ مکان بنا کر غلطی کی تھی؟ ظاہر ہے کہ ہر وہ شخص جس میں عقل وفہم کی ادنیٰ رمق ہے، یہی کہے گا کہ باپ نے تو مکان تعمیر کر کے احسان کیا تھا، لیکن اولاد نے اسکی قدر نہ کی، اور اپنی نااہلی سے اسے خراب کر ڈالا، لیکن نہ جانے بیچارے پاکستان نے وہ کونسا قصور کیا ہے کہ اسکے باشندوں کی ساری بداعمالیوں کا پشتارہ اسکے قیام کے بنیادی نظریے پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے؟

جہاں تک حالات کی خرابی کا تعلق ہے ہندوستان کے حالات بھی آزادی کے بعد کوئی قابلِ رشک نہیں رہے، نظم وضبط سے لے کر امن وامان تک ہر شعبۂ زندگی میں وہاں بھی انگریزوں کے زمانے کے مقابلے میں نمایاں انحطاط آیا ہے، رشوت ستانی سے لے کر قتل وغارت گری تک کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں آزادی کے بعد بے تحاشا اضافہ نہ ہوا ہو، لیکن حالات کی اس خرابی کی بنا پر یہ بات کوئی نہیں کہتا کہ ہندوستانیوں کا آزادی کا

مطالبہ ہی غلط تھا، اور انہیں کبھی انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ لیکن حالات کی خرابی کا سارا غصہ غریب پاکستان ہی پر اتارا جاتا ہے کہ گویا اسکے قیام کا نظریہ ہی ان ساری خرابیوں کا ذمہ دار ہے۔

اگر لوگوں کی بد اعمالی سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی ذمہ داری کسی تحریک کے بنیادی نظریہ پر ڈالنے کا یہ فلسفہ ایک مرتبہ مان لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑیگا کہ ہر وہ مخلصانہ تحریک جو بالآخر خرابیوں کا شکار ہوئی، اسکا ذمہ دار اسکا اصل بانی ہے کہ اس نے یہ تحریک چلائی ہی کیوں؟ پھر تو یہ کہیئے کہ میر صادق کی غداری سے میسور کی جو سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلی اس میں اصل خطاکار سلطان ٹیپو تھے کہ انہیں یہ سلطنت بنانی ہی نہ چاہئے تھی، میر جعفر کی بد اعمالیوں سے اگر بنگال ہاتھ سے نکلا تو اس کا ذمہ دار سراج الدولہ کو قرار دیجئے کہ اس نے انگریزوں سے لڑنے کی پالیسی ہی کیوں اختیار کی؟ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جو بالآخر اپنوں کی غداری سے ناکام ہوئی، اسکے بارے میں کہئے کہ یہ تحریک چلی ہی غلط تھی، حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال جسے کچھ آستین کے سانپوں نے سبوتاژ کیا، کہہ دیجئے کہ اسکی بنیاد ہی غلط تھی، اور ان سب کو دراصل انگریز کی غلامی پر قناعت کر کے بیٹھ رہنا چاہئے تھا۔ اگر آزادی کی ان تمام مقدس تحریکوں کے بارے میں جو ہماری تاریخ کا جگمگاتا ہوا حصہ ہیں یہ باتیں نہیں کہی جا سکتیں، اور یقیناً نہیں کہی جا سکتیں، تو آخر تحریکِ پاکستان کا وہ کونسا جرم ہے جسکی بنا پر اسکے ساتھ یہ الٹا سلوک کیا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب کبھی ملک میں کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو ساری ذمہ داری اس تحریک پر رکھدی جائے؟

پھر جن خرابیوں کی بنا پر آج یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان بنا ہی غلط تھا، ان کے بارے میں یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر پاکستان نہ بنتا، اور اکھنڈ بھارت وجود میں آجاتا تو یہ خرابیاں کیوں رونما نہ ہوتیں؟ کیا وہی لوگ جو پاکستان میں رہ کر بد دیانت، کام چور، بد عمل اور مفاد

پرست ہوگئے، اکھنڈ بھارت کے مقدس سائے میں رہ کر فرشتے بن جاتے؟ اور ان سے، وہ بد اعمالیاں سرزد نہ ہوتیں جو آج پاکستان میں سرزد ہو رہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی مسلم اکثریتی علاقوں میں کم وبیش زمام کار انہی ہاتھوں میں ہوتی جن ہاتھوں میں آج پاکستان کی باگ ڈور ہے، فرق صرف یہ ہے کہ آج وہ ہندو اکثریت کی سرپرستی سے محروم ہیں، اور متحدہ ہندوستان میں ان کے سر پر وفاق کی ہندو اکثریت کا ہاتھ ہوتا، لیکن اگر یہ ہندو اکثریت کی سرپرستی ایسی ہی بابرکت شے ہے کہ اسکے نتیجے میں موجودہ تمام خرابیاں کافور ہوسکتی تھیں تو پاکستان کو چھوڑ کر آج بھی برّصغیر کے تقریباً اسی فیصد علاقے کو یہ سرپرستی حاصل ہے، کیا وہاں یہ خرابیاں کافور ہوگئی ہیں؟ جن بدعنوانیوں، رشوت ستانیوں، قتل وغارت گری، فرقہ وارانہ تعصبات اور لسانی گروہ بندیوں کا ہمیں پاکستان میں شکوہ ہے، کیا بھارت میں یا اسکے زیر سرپرستی علاقوں میں ان کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا؟ اگر وہاں بھی یہ ساری خرابیاں موجود ہیں، اور یقیناً موجود ہیں، تو آخر کس بنا پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ پاکستان نہ بنتا تو ہمارے حالات اتنے خراب نہ ہوتے؟

بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے اپنی بدعملی کی اصلاح سے فرار اختیار کرنے کے لئے یہ ایک بہانہ تلاش کیا ہے کہ حالات کی ساری ذمہ داری پاکستان کے تصور پر ڈال کر اپنے معمولات میں مگن ہو جائیں، یہ درست ہے کہ ہم نے پاکستان کی تعمیر اور حفاظت میں شدید غفلت اور مجرمانہ بے حسی سے کام لیا، جس کے نتیجے میں آج ہر شخص بے چین اور پریشان ہے، لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پاکستان جیسی نعمت کی ناشکری شروع کر دیں، آج کے گئے گذرے حالات میں بھی اگر ہر شخص اپنی ذاتی زندگی کا موازنہ قیامِ پاکستان سے پہلے کے حالات سے کرے، یا اپنے ان عزیزوں دوستوں کے حالات سے کرے جو اب بھی ہندوستان میں مقیم ہیں تو وہ محسوس کریگا کہ پاکستان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس پر ان گنت نعمتوں کی بارش برسائی ہے، اور ان نعمتوں کے باوجود جو کچھ خرابی یا

پریشانی ہے، وہ ان نعمتوں کے غلط استعمال سے ہے، لہذا ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہونی چاہئے کہ ان نعمتوں کی قدر کر کے ان کا صحیح استعمال کیا جائے۔ اگر آج بھی ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ درست ہونے کا تہیہ کرلے تو پاکستان آج بھی پوری دنیا کے لئے ایک مثال بن سکتا ہے، اگر ایک شاندار مکان کو ہم نے شرارت وفساد کے ذریعے خراب کر ڈالا ہے تو اسکا علاج یہ نہیں ہے کہ اس گھر کو ڈھا دیا جائے، اس کا علاج یہ ہے کہ اس مکان کا ہر مکین اپنی سابقہ غفلت اور بد عملی سے تائب ہو، اور اب پوری مستعدی اور دیانت داری سے اسکی تعمیر نو میں لگ جائے، ابھی وقت ہے کہ ہم اس حقیقت کا ادراک کرلیں، وقت گذرنے کے بعد حسرتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

۵/ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
۱۴/ اگست ۱۹۹۴ء

قاہرہ کانفرس کا پروگرام آف ایکشن

اقوام متحدہ کی طرف سے قاہرہ میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہورہی ہے جس کا موضوع ہے ,,آبادی اور ترقی،، یہ کانفرنس ۵ر سے ۱۳ر ستمبر تک جاری رہیگی، اور اس میں بنیادی طور پر ,,بہبود آبادی،، ,,خاندانی منصوبہ بندی،، اور ان کے متعلقہ مسائل پر غور کر کے ممبر ملکوں کے لئے وہ رہنما اصول طے کئے جائیں گے جنکی روشنی میں وہ اپنے اپنے دائرہ اختیار میں ,,تنظیم آبادی،، کے لئے حکمتِ عملی وضع کرسکیں، اس کانفرنس کی تیاریاں کافی عرصے سے جاری ہیں، اور اس کا ,,پروگرام آف ایکشن،، طے کرنے کے لئے ایک ابتدائی کمیٹی (Preparatory Committee) بنائی گئی تھی جس کا ایک اجتماع اپریل میں نیویارک میں منعقد ہوا، اس کمیٹی نے ایک سو تیرہ صفحات پر مشتمل ایک مسودہ تیار کیا ہے جس میں ان تجاویز کو آخری شکل دی گئی ہے جو کانفرنس میں پیش کرکے ان پر کانفرنس کی منظوری لی جائیگی، ,,پروگرام آف ایکشن،، کا یہ ابتدائی مسودہ محدود پیمانے پر طبع بھی کردیا گیا ہے، لاس انجلس (امریکہ) کے ایک مسلمان خالد بیگ صاحب نے اس پورے مسودے کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ایک مفصل خط بھیجا ہے جس میں اس ,,پروگرام آف ایکشن،، پر اپنی شدید تشویش کا اظہار کیا ہے، اصل خط انگریزی میں ہے، لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکتوب نگار کی رائے میں یہ ,,پروگرام آف ایکشن،، درحقیقت ,,بہبود آبادی،، اور ,,خاندانی منصوبہ بندی،، کے نام پر اس مغربی کلچر کو پوری دنیا پر مسلط

کرنے کا منصوبہ ہے جس میں شرم وحیا، اور عفت وعصمت کی تمام پاکیزہ قدروں کو ملیا میٹ کردیا گیا ہے، فاضل مکتوب نگار نے اس مغربی کلچر کو ,,کنڈوم کلچر،، (Condom Culture) کا نام دیا ہے اوران کا کہنا یہ ہے کہ اس ,,پروگرام آف ایکشن،، کے ذریعے یہی کنڈوم کلچر جو مغربی معاشرے کی چولیں ہلا چکا ہے، تمام مشرقی ملکوں میں بھی رائج کرنا پیش نظر ہے۔ اور یہ کانفرنس منعقد کرنے کے لئے قاہرہ کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان ملک کو اس منصوبے کی ترویج میں پیش پیش رکھ کر عالم اسلام کو اس منصوبے میں ملوث کیا جائے، اور اسلامی ملکوں کی طرف سے اس منصوبے کی جو مخالفت ہوسکتی تھی، اسکی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی جائے، فاضل مکتوب نگار کا کہنا ہے کہ مختلف ممالک کی بعض مسلمان تنظیموں نے اس ,,پروگرام آف ایکشن،، کے خلاف آواز اٹھائی ہے، لیکن ابھی تک عام طور سے مسلمانوں کو نہ اس کانفرنس کے انعقاد کا علم ہے، اور نہ ان تجاویز کی سنگینی کا اندازہ ہے جو اس کانفرنس میں پیش کی جارہی ہیں، اس لئے ابھی تک اس پر کماحقہٗ ردعمل سامنے نہیں آسکا، اور اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ ایک عالمی ادارے سے یہ تجاویز خاموشی کے ساتھ منظور ہوجائیں، اور مسلمان ممالک جو اقوام متحدہ کے رکن ہیں، اس کانفرنس میں منظور ہونے والی تجاویز کے پابند ہوکر اپنے یہاں ان کے عملی نفاذ کے اقدامات شروع کردیں۔

فاضل مکتوب نگار نے از راہِ مہربانی اس ,,پروگرام آف ایکشن،، کے انگریزی متن کی ایک مکمل کاپی بھی مجھے ارسال کی ہے، جو ایک سو تیرہ صفحات پر مشتمل ہے، اوراس کے بعض حصوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فاضل مکتوب نگار کے خدشات بے بنیاد نہیں ہیں، اس مسودے کو پورا نقل کرنا تو یہاں ممکن نہیں ہے، لیکن اس میں جن امور پر بار بار زور دیا گیا ہے ان میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) عورتوں پر سے خانہ داری کا بوجھ کم کر کے انہیں ہر شعبۂ زندگی کی معاشی

سر گرمیوں میں بڑے پیانے پر شریک کیا جائے۔

(۲) شادی کی عمر بڑھادی جائے،اور جلدی شادی کرنے کے رجحان کی مکمل ہمت شکنی کی جائے۔

(۳) تعلیم گاہوں میں جنسی تعلیم(Sex education)بالکل ابتدائی مرحلے سے دینے کا انتظام کیا جائے،اور بچوں کے بالغ ہونے سے پہلے پہلے ہی انہیں ضروری جنسی معلومات فراہم کردی جائیں،اور جنسیات کی تعلیم کا یہ سلسلہ ہر سطح پر جاری رکھا جائے۔

(۴) کنڈوم (مانع حمل غلاف)اور دوسری مانع حمل اشیاء کی فراہمی اتنی آسان بنا دی جائے کہ ہر شخص بوقت ضرورت اسے بہ آسانی حاصل کر سکے،(مغربی ملکوں میں کنڈوم کے حصول کے لئے خود کار مشینیں جگہ جگہ نصب ہوتی ہیں جن میں پیسے ڈال کر ہاتھ کے ہاتھ کنڈوم فراہم ہو جاتا ہے، غالباً کنڈوم کی فراہمی میں سہولت پیدا کرنے سے اسی قسم کی کوئی صورت مراد ہے،ورنہ اسٹورز میں تو آج بھی اسکی فراہمی کچھ دشوار نہیں ہے)۔

(۵) ایسے مشاورتی مراکز کثرت سے قائم کئے جائیں جن میں صرف شادی شدہ جوڑوں کو نہیں بلکہ غیر شادی شدہ نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی جنسی معلومات اور منع حمل کی تدابیر وغیرہ آسانی سے فراہم کی جائیں،اور ان کے خصوصی مسائل پر انہیں مفید مشورے دیئے جائیں،اور ان مشوروں میں اس بات کا پورا انتظام کیا جائے کہ انکی تکریم اور رازداری کی پوری ضمانت ہو، تاکہ یہ نوعمر لڑکے اور لڑکیاں افشاء راز یا بے عزتی کے کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔

اس سلسلے میں مذکورہ بالا,,پروگرام آف ایکشن،، کے الفاظ یہ ہیں:

"Countries Should remove legal, regulatory and Social barriers to sexual and reproductive health information and care for adoles-

cents and must ensure that the programmes and attitudes of health-care providers do not restrict the access of adolescentes to the services and information they need. In doing so, services for adolescents must safeguard their rights to privacy, confidentiality, informed consent and respect....."

یعنی: "حکومتوں کو چاہئے کہ وہ ایسی تمام قانونی، انتظامی اور سماجی رکاوٹوں کو دور کریں جن سے نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو جنسی اور تولیدی صحت کے بارے میں معلومات اور طبّی توجہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیدا ہوتی ہو، نیز حکومتوں کو اس بات کو یقینی بنانا چاہئے کہ طبّی توجہ فراہم کرنے والوں کا پروگرام یا ان کا مجموعی رویہ نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو ان کی ضرورت کے مطابق معلومات اور خدمات فراہم کرنے پر کوئی پابندی عائد نہ کرے، اور اس طرح جو خدمات ان نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو فراہم کی جائیں، ان میں مکمل رازداری کا بھی اہتمام کیا جائے، اور انہیں اس بات سے مطلع بھی کیا جائے کہ ان کو یہ خدمت بہ رضا و رغبت پورے احترام کے ساتھ فراہم کی جارہی ہے"۔ (فقرہ ۷۔۴۳)

اسی بات کی مزید وضاحت کے لئے آگے کہا گیا ہے کہ:

"Sexually active adolescents will require special family planning information, counselling and services, including contraceptive services, and those who become pregnant will require special support from their families

and community..."

یعنی: "جو نو عمر لڑکے یا لڑکیاں جنسی طور پر فعال ہیں، انہیں خاندانی منصوبہ بندی کی معلومات خصوصی طور پر فراہم کرنا ضروری ہوگا، نیز انہیں مشورے اور دوسری خدمات کی بھی ضرورت ہوگی جن میں منع حمل کی خدمات بھی داخل ہیں، اور ان میں سے جو لڑکیاں حاملہ ہو جائیں، ان کو اپنے خاندان اور معاشرے کی طرف سے خصوصی حمایت اور سرپرستی کی حاجت ہوگی"۔ (فقرہ نمبر ۷۵۰۴)

(۶) اس پروگرام میں حکومتوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ جو نو عمر (غیر شادی شدہ) لڑکیاں حاملہ ہو جائیں ان کے خلاف پائے جانے والے امتیازی رویے کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں۔

(۷) مذکورہ بالا تمام اقدامات کے لئے تمام ذرائع ابلاغ ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ کو استعمال کیا جائے۔

یہ چند بہت موٹے موٹے نکات ہیں جو اس "پروگرام آف ایکشن" میں بار بار بڑی تاکید کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اور ان پر بہت زور دیا گیا ہے۔

ان تمام نکات کو یکجا طور پر پڑھنے سے جو منظر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں چپے چپے پر مرد و عورت اور لڑکوں لڑکیوں کا آزادانہ میل جول ہے، جنسی تعلیم نابالغی کے وقت ہی شروع ہو چکی ہے، اور ٹی وی کے ذریعے بھی اسکے تمام مخفی گوشے بر سر عام دکھائے جا رہے ہیں، بلوغ کے فوراً بعد شادی پر پابندی ہے، لیکن نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو راز داری کے ساتھ منع حمل کی تدابیر اور دوسری جنسی معلومات ان کی ضرورت کے مطابق فراہم کی جا رہی ہیں، کنڈوم ہر وقت اور ہر جگہ مہیا ہے، اور اس کے استعمال کے طریقے پوری عزت اور احترام کے ساتھ ان نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو سکھانے کا پورا انتظام موجود ہے، اور اگر کبھی اتفاقاً حمل ہو بھی جائے تو خاندان اور

معاشرے کی طرف سے پوری حمایت اور سرپرستی مہیا ہے۔

یہ مغرب کے اسی آتش گیر ماحول کی تصویر ہے جسے فاضل مکتوب نگار نے "کنڈوم کلچر" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور جس کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ اس کی تباہ کاریوں کو ہم امریکہ میں رہنے والے زیادہ بہتر طریقے پر جانتے ہیں، فاضل مکتوب نگار نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر قاہرہ کی کانفرنس میں یہ تجاویز ایک مرتبہ منظور ہو گئیں تو خواہ انکی حیثیت محض تجویز کی ہو، لیکن ان کے عملی نفاذ کے لئے عالمی مالیاتی اداروں کو ایک ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ تجاویز قاہرہ کی کانفرنس میں پیش ہونے کیلئے تیار ہیں، چونکہ اقوام متحدہ دنیا بھر کے ملکوں پر مشتمل ہے، جن میں وہ مغربی ممالک بھی داخل ہیں جہاں پہلے ہی سے یہ ماحول بہ تمام وکمال موجود ہے، اس لئے ان تجاویز کا صفحۂ قرطاس پر آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن ذمہ داری ان مسلمان ملکوں کی ہے جن کے عوام کی بھاری اکثریت آج بھی عفت و عصمت کو اپنی قیمتی متاع سمجھتی ہے، مسلمان ملکوں پر مشتمل تنظیم "رابطہ عالم اسلامی" نے مسلمان ملکوں سے بجا طور پر اپیل کی ہے کہ وہ اس "پروگرام آف ایکشن" کے قابل اعتراض حصوں پر ہرگز صاد نہ کریں، اور آخری منظوری کے وقت ان تجاویز کی بھرپور مخالفت کر کے ان میں ضروری ترمیمات کروائیں، دیکھنا یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے نمائندے رابطہ عالم اسلامی کی اس اپیل پر کس طرح عمل کرتے ہیں؟

۲۰/ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
۲۹/ اگست ۱۹۹۴ء

اسلام اور ٹریفک

آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے جب میں پہلی بار جنوبی افریقہ گیا تو کسی جدید ترقی یافتہ ملک کی طرف وہ میرا پہلا سفر تھا، اب تو جنوبی افریقہ پرامن طور پر آزاد ہو چکا ہے، اور وہاں نسلی امتیاز کی پالیسی ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے، لیکن ان دنوں وہاں سفید فام ڈچ حکمرانوں کا راج تھا، اور نسلی امتیاز کے قوانین پوری آب وتاب پر تھے، چنانچہ بڑے شہروں میں مستقل رہائش کا حق صرف گوروں کو حاصل تھا، دوسری نسلوں کے لوگوں کے لئے الگ الگ آبادیاں قائم تھیں، جو ان بڑے شہروں سے کافی فاصلے پر واقع تھیں، جوھانسبرگ سے تقریباً تیس میل دور ایک ایسی ہی خوبصورت آبادی ,,آزادویل،، کے نام سے بسائی گئی تھی جو تمام تر ہندوستانی نسل کے باشندوں کے لئے مخصوص تھی، ہمارے میزبان چونکہ اسی آبادی میں رہتے تھے، اس لئے ہمارا قیام بھی وہیں ہوا، یہ بڑی پرفضا بستی تھی، جو زیادہ تر رہائشی مکانات پر مشتمل تھی۔ تھوڑی آبادی کے لئے اگر ایک وسیع رقبے پر منصوبہ بندی کے ساتھ مکانات بنائے جائیں تو ظاہر ہے کہ بستی میں کشادگی کا احساس ہوگا، یہی صورت یہاں بھی تھی کہ یہ بستی بہت خوبصورت لگتی تھی، کھلی کھلی، پرسکون، اور حد درجہ صاف ستھری۔ یہاں کے مکینوں میں سے تقریباً ہر شخص کے پاس اپنی اپنی کار تھی، لیکن سڑکوں پر ہجوم کا سوال ہی نہیں تھا، پیدل چلنے والے بہت کم تھے، سڑک پر اکا دکا چلنے والے نظر آجاتے، اور وہ بھی زیادہ تر فٹ پاتھ پر، ورنہ سڑکیں زیادہ

تر سنسان پڑی رہتی تھیں، لیکن ان سنسان سڑکوں پر بھی ہر چھوٹے سے چھوٹے موڑ کے کنارے زمین پر ایک سیاہ لائن کھینچی نظر آتی تھی، اور بعض مقامات پر موڑ کے بغیر بھی، میں نے کار میں سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ کار چلانے والا اس لائن پر پہنچ کر چند لمحوں کے لئے رکتا، اور دائیں بائیں دیکھنے کے بعد پھر آگے بڑھتا، میرے لئے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سڑک دور دور تک سنسان پڑی ہے، اور کسی آنے جانے والے کا نام ونشان نہیں ہے، اسکے باوجود ڈرائیور خواہ کتنی جلدی میں ہو، یا باتوں میں کتنا مشغول ہو، اس لکیر پر پہنچ کر رکتا ضرور ہے، اور اسکی گردن خود بخود دائیں بائیں اس طرح مڑ جاتی ہے جیسے کوئی خود کار مشین کسی ریموٹ کنٹرول کے ذریعے مڑ رہی ہو، پہلی پہلی بار میں یہ سمجھا کہ ڈرائیو کرنے والے کو اچانک کوئی شبہ ہو گیا جس کی وجہ سے اس نے گاڑی روکی، لیکن جب بار بار یہی منظر نظر آیا تو میں نے لوگوں سے اسکی وجہ پوچھی، انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ ٹریفک کا قاعدہ ہے کہ ہر موڑ پر یا جہاں زمین پر یہ لائن کھینچی ہوئی ہو، گاڑی کو روک کر دائیں بائیں دیکھنا ہر ڈرائیور کے ذمے لازم ہے، اب ہمیں اس قاعدے پر عمل کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ کوئی موڑ دیکھ کر یا زمین پر کھینچی ہوئی یہ لکیر دیکھ کر پاؤں بے ساختہ بریک پر پہنچ جاتے ہیں اور گاڑی کے رکتے ہی گردن دائیں بائیں مڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد جتنے دن وہاں میرا قیام رہا، میں روزانہ بار بار یہ منظر دیکھتا رہا، کوئی ایک شخص بھی مجھے ایسا نہیں ملا جس نے اس قاعدے کی خلاف ورزی کی ہو، مجھے اپنی قیام گاہ سے مین روڈ تک روزانہ کئی کئی بار جانا پڑتا، اور ہر بار میں یہ دیکھتا کہ کار ڈرائیو کرنے والا مین روڈ پہنچنے سے پہلے کئی مرتبہ ان سنسان سڑکوں پر رکتا تھا، حالانکہ مجھے اس پورے عرصے میں ٹریفک پولیس کا کوئی سپاہی ان سڑکوں پر نظر نہیں آیا جو لوگوں سے اس قاعدے کی پابندی کرارہا ہو، نہ ہمارے ملک کی طرح ایسے اسپیڈ بریکر نظر آئے جنہیں کار بریکر کہنا زیادہ مناسب ہے۔

یہ نظارہ پہلی بار جنوبی افریقہ میں دیکھا تھا، اور اس لئے اچنبھا معلوم ہوا تھا کہ آنکھیں پاکستان کی آزادی اور بے مہار ٹریفک دیکھنے کی عادی تھیں، بعد میں یہی منظر مشرق و مغرب کے بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی دیکھا، یہانتک کہ اب نگاہیں اسکی بھی عادی ہو گئیں، لیکن جب اپنے ملک میں ٹریفک کا حال دیکھو تو وہ نہ صرف وہیں کا وہیں ہے، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ الٹی سمت میں سفر کر رہا ہے، تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اسلئے نہیں کہ وہ ہر شخص کے سامنے ہے۔

اس صورتِ حال کا سبب سرکاری انتظام کا ڈھیلا پن اور تعلیم و تربیت کا فقدان تو ہے ہی، لیکن ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے زندگی کے ان روزمرہ کے مسائل کو دین سے باہر کی چیز سمجھ رکھا ہے، اور یہ بات ذہن میں بٹھار کھی ہے کہ دین اور اسلام کا تعلق تو صرف مسجد اور مدرسے سے ہے، دنیوی کاروبار اور اس سلسلے کے تمام امور دین کی گرفت سے (معاذ اللہ) باہر ہیں، لہذا ٹریفک کے مسائل کا دین سے کیا واسطہ؟ اس غلط سوچ کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، بلکہ اب تو قاعدوں کو توڑنا ایک بہادری کی علامت بن گئی ہے، جو شخص جتنے قاعدہ توڑے اتنا ہی وہ اپنے آپ کو بہادر اور جیالا سمجھتا ہے، اور اسی غلط سوچ کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اچھے بھلے دیندار لوگ جو نماز روزے کے پابند ہیں، اور مجموعی اعتبار سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی فکر بھی رکھتے ہیں، ٹریفک کے قواعد کی دھڑلے سے خلاف ورزی کرتے ہیں، اور نہ ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوتا ہے، نہ اس طرز عمل کو غلط یا گناہ سمجھتے ہیں، چنانچہ غلط جگہ پر گاڑی کھڑی کر دینا، مقررہ رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلانا، غلط سمت میں سفر کرنا، رکنے کے سرخ اشارے کو توڑ دینا جہاں اوورٹیکنگ ممنوع ہے وہاں گاڑیوں کی باقاعدہ ریس لگانا، روزمرہ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے، حالانکہ یہ سارے کام صرف بے قاعدگی کے زمرے ہی میں نہیں آتے، بلکہ دینی اعتبار سے گناہ بھی ہیں، اول

تو اس لئے کہ ٹریفک کے تمام قواعد دراصل تمام انسانوں کی مصلحت کے تحت بنائے گئے ہیں، اور جو قوانین حکومت کی طرف سے عمومی مصلحت کے لئے بنائے جائیں، ان کی پابندی شرعی اعتبار سے بھی واجب ہے، اور ان کی خلاف ورزی ناجائز، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے ذمہ دار حاکموں کی اطاعت کرو"

اس اطاعت سے مراد یہی ہے کہ حکام عمومی مصلحتوں کی بنیاد پر جو قاعدے مقرر کریں (بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو) ان کی پابندی کی جائے، اس پابندی کا حکم اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے قواعد کی پابندی شرعاً بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

دوسرے جب کوئی شخص سڑک پر گاڑی چلانے کا لائسنس لیتا ہے تو وہ حکام سے زبانی، تحریری یا کم از کم عملی وعدہ کرتا ہے کہ وہ سڑک پر گاڑی چلاتے وقت تمام مقررہ قواعد کی پابندی کریگا، اگر لائسنس کی درخواست دیتے وقت ہی وہ متعلقہ حکام کو یہ بتادے کہ وہ ٹریفک کے اصولوں کی رعایت نہیں رکھ سکے گا، تو اسے کبھی لائسنس نہ دیا جائے، لہذا اسے لائسنس اسی وعدے کی بنیاد پر دیا گیا ہے، چنانچہ اسکے بعد اگر وہ ٹریفک کے قواعد کو توڑتا ہے تو اس میں وعدے کی خلاف ورزی کا بھی گناہ ہے۔

تیسرے ان قواعد کو توڑنے سے عموماً کسی نہ کسی انسان کو تکلیف ضرور پہنچتی ہے، بعض اوقات تو اسی بنا پر کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے، اور کسی بے گناہ کی جان چلی جاتی ہے، یا اسے کوئی اور جسمانی نقصان پہنچ جاتا ہے، یا کم از کم اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ اس سے دوسروں کو ذہنی تکلیف پہنچتی ہے، اور یہ بات میں ان صفحات میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ کسی بھی شخص کو

بلاوجہ تکلیف پہنچانا اتنا سنگین گناہ ہے کہ اسکی معافی صرف توبہ سے نہیں ہوتی، جب تک وہ شخص معاف نہ کرے۔

اسلامی فقہ کی ہر کتاب میں یہ اصول لکھا ہوا ہے کہ عام راستوں پر چلنا اور کوئی سواری چلانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ چلنے والا دوسروں کی "سلامتی" کی ضمانت دے، یعنی ایسے ہر کام سے اجتناب کرے جو کسی دوسرے شخص کے لئے تکلیف یا خطرے کا باعث بن سکتا ہو، اس احتیاط کے بغیر اس سڑک کا استعمال ہی جائز نہیں ہے، جو تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے، اور اگر اس بے احتیاطی کے نتیجے میں کسی شخص کو کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچ جائے تو اسکا سارا تاوان شرعی اعتبار سے اس شخص کے ذمے عائد ہوتا ہے جس نے بے احتیاطی کے ساتھ سڑک کو استعمال کیا۔

اب غور فرمایئے کہ اگر ایک شخص سگنل توڑ کر گاڑی آگے لے گیا، یا اس نے کسی ایسی جگہ سامنے والی گاڑی کو اوورٹیک کیا جہاں ایسا کرنا ممنوع تھا، تو بظاہر تو یہ معمولی سی بے قاعدگی ہے، لیکن در حقیقت اس معمولی سی حرکت میں چار بڑے گناہ جمع ہیں، ایک قانون شکنی، اور حاکم کے جائز حکم کی نافرمانی کا، دوسرے وعدہ خلافی کا، تیسرے کسی کو تکلیف پہنچانے کا، چوتھے سڑک کے ناجائز استعمال کا یہ گناہ ہم دن رات کسی تکلف کے بغیر اپنے دامنوں میں سمیٹ رہے ہیں، اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہے۔

پھر بعض اوقات کسی ایک شخص کی بے قاعدگی سینکڑوں انسانوں کا راستہ ہی بالکل بند کر دیتی ہے، مثلاً سڑک کے ایک حصے میں اگر کسی وجہ سے ٹریفک رک گیا تو بعض جلد باز لوگ تھوڑے سے انتظار کی زحمت گوارا کرنے کے بجائے سڑک کے اس حصے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جو آنے والے ٹریفک کے لئے مخصوص ہے، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آنے والی گاڑیوں کا راستہ رک جاتا ہے، اور گھنٹوں تک کے لئے ٹریفک اس طرح جام

ہو جاتا ہے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اس قسم کی بے قاعدگی درحقیقت "فساد فی الارض" کی تعریف میں آتی ہے، اور سینکڑوں انسانوں کو کرب وعذاب میں مبتلا کرنے کا گناہ اس شخص پر ہے جس نے غلط سمت میں گاڑی لے جا کر اس صورتِ حال سے لوگوں کو دوچار کیا۔

ہمارے دین نے ہمیں یہ ساری باتیں بتائی ہیں، ان کے بارے میں تفصیلی ہدایات دی ہیں، اور وہ تعلیمات عطا کی ہیں جو ہر دور میں سدا بہار ہیں، لیکن ہم نے ان کو سمجھنے سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کے بجائے دین کو صرف مسجد اور مدرسے کی چار دیواری تک محدود کر ڈالا، دوسری قوموں نے ان اصولوں پر عمل کر کے کم از کم اپنا ظاہری نظم وضبط درست کر لیا، لیکن ہم انہیں چھوڑ کر اپنی آخرت بھی خراب کر رہے ہیں، اور اپنی دنیا کو بھی مشکلات اور بے چینیوں کی آماجگاہ بنا رکھا ہے، اور اپنی بدعملی سے اسلام کے رُخِ زیبا کو بھی مسخ کر رکھا ہے۔ لیکن ان مسائل کا حل صرف ان پر دور دور سے تبصرہ کر لینا نہیں ہے، بات اسی وقت بنے گی جب ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنے ضمیر کو بیدار کرے، اور دوسروں کے طرزِ عمل سے بے نیاز ہو کر کم از کم خود گناہوں سے بچنے اور ان زرّین اسلامی اصولوں پر عمل کرنے کا آغاز کر دے، تبدیلی ہمیشہ افراد کے ذاتی عمل سے وجود میں آتی ہے، اور پھر وہی رفتہ رفتہ قومی مزاج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

۴/ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ

۱۱/ ستمبر ۱۹۹۴ء

لاقانونیّت کیوں؟

پاکستان بننے سے پہلے سالہا سال ہم انگریزی حکومت کے ماتحت رہے، یہ حکومت چونکہ محض سینہ زوری کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی، اور اس نے اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لئے ظلم وستم اور سفاکی اور درندگی کے ریکارڈ قائم کئے تھے، اس لئے ہندوستان کے باشندوں نے، بالخصوص حریت پسند مسلمانوں نے، اس حکومت کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ سات سمندر پار سے آنے والے حکمران اپنی چمڑی کے رنگ سے لیکر زبان اور دماغ تک، ہر چیز میں یہاں کے باشندوں سے مختلف تھے، اور ان کا تمام تر اقتدار صرف توپ اور بندوق کی بنیاد پر قائم تھا جسکی طرف اکبرالہ آبادی مرحوم نے بڑی خوبصورتی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ؎

اپنے عیبوں کی کہاں آپکو کچھ پروا ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے ''تیغ سے پھیلا اسلام''
یہ نہ ارشاد ہوا ''توپ سے کیا پھیلا ہے؟''

ظاہر ہے کہ اسلحہ کی زور زبردستی سے کسی کے گلے میں غلامی کا طوق تو ڈالا جا سکتا ہے، لیکن اس کے دل میں محبت اور احترام پیدا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہندوستان کے باشندے بے بس ہوکر ان کے محکوم تو بن گئے، لیکن ان کے سینوں میں انگریزی

حکومت کے خلاف نفرت کا لاوا ہمیشہ ابلتا رہا، یہی نفرت کا لاوا تھا جو آزادی کی بہت سی تحریکوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوا۔ انگریزی حکومت سے نفرت کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ اس کے مسلط کئے ہوئے قانون کا دلوں میں احترام کبھی قائم نہیں ہوا، اس قانون کی پشت پر صرف سزا کا خوف تھا جو لوگوں سے ڈنڈے کے زور پر تو قانون کی پابندی کرا لیتا تھا، ورنہ وہ دل سے اسے ماننے کیلئے تیار نہ تھے، چنانچہ جہاں موقع ملتا وہ اس سے فرار اختیار کر لیتے تھے، بلکہ آزادی کی بہت سی تحریکوں نے باقاعدہ لوگوں کو قانون شکنی کی ترغیب دی، اور وہاں سزا کا خوف بھی قانون کو توڑنے سے مانع نہیں ہوا، لوگوں نے اپنی نفرت کے اظہار اور اپنا احتجاج رجسٹر کرانے کے لئے حکومت کی نافرمانی کر کر کے جیلیں بھر دیں، یہاں تک کہ حکومت کی نافرمانی حریت پسندی کی ایک علامت بن گئی، اور قانون کی خلاف ورزی بہادری اور جی داری کا ایک ثبوت۔ رفتہ رفتہ قانون کے بارے میں یہ تصور عام ہو گیا کہ وہ درحقیقت ہمیں غلامی کے شکنجے میں کسنے والوں کا ایک حربہ ہے جس کے ساتھ تقدس اور احترام وابستہ ہو ہی نہیں سکتا۔

حکومت اور قانون کے بارے میں یہ ذہنی فضا تھی جس میں پاکستان بنا۔ پاکستان کا حصول ایک ایسا انقلابی واقعہ تھا جس کے نتیجے میں یہ ذہنی فضا بہت آسانی سے تبدیل ہو سکتی تھی، شروع شروع میں عوامی جذبہ واقعی یہ تھا کہ یہ ہمارا ملک، ہماری حکومت اور ہمارا اپنا گھر ہے، اس کی ہر چیز ہماری ہے، اور ہمیں مل جل کر اسکی تعمیر کرنی ہے، لہٰذا اس موقع پر لوگوں کو نظم و ضبط اور قاعدے قانون کا پابند بنانا بہت آسان تھا، لیکن اول تو ہم نے آزاد ہونے کے بعد بھی اپنا قانون کا جوں کا توں وہی رکھا جو انگریز کا لایا ہوا تھا، اور جس سے بحیثیتِ مجموعی عوام کو نفرت تھی، یہاں تک کہ قانون کی زبان بھی بدستور وہی باقی رکھی جسے ملک کے ہزار باشندوں میں سے بمشکل ایک آدمی سمجھتا ہے، حد تو یہ ہے کہ انگریز ججوں کے دور میں طریقہ یہ تھا کہ نچلی عدالتوں میں گواہوں کے بیانات اردو یا کسی اور

مقامی زبان میں ہوتے تھے، پھران کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا تھا، تاکہ جج صاحبان انہیں سمجھ سکیں، نچلی عدالتوں کے جج مقامی حضرات میں سے بننے لگے، تب بھی ان کو پابند کیا گیا کہ وہ تمام بیانات کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر محفوظ رکھیں، تاکہ جب کبھی معاملہ اوپر کی عدالتوں میں جائے تو وہاں کے انگریز جج صاحبان بیانات کو سمجھ سکیں، یہ بدیسی حکمرانوں کی ایک مجبوری تھی جس کی وجہ سے نچلی عدالتوں میں ایک ایک بیان دو دو زبانوں میں یکارڈ ہوتا تھا۔ لیکن مجبوری کا یہ طریقہ آج سینتالیس سال گذرنے کے بعد بھی اسی طرح چلا آتا ہے، اب نچلی عدالتوں سے لے کر عدالتِ عظمیٰ تک کوئی انگریز جج باقی نہیں رہا، لیکن نچلی عدالتوں کے جج صاحبان آج بھی اس دوہری محنت کے پابند ہیں کہ بیانات اردو یا کسی اور مقامی زبان میں بھی قلمبند کرائیں، اور پھر اسکا انگریزی میں ترجمہ بھی کریں، پھر تمام عدالتوں میں چونکہ زیادہ تر بیان کے انگریزی ترجمے ہی کو استعمال کیا جاتا ہے، اسلئے بعض جگہ ترجمے میں اونچ نیچ کا شبہ ہو تو اصل اردو بیان کو بھی نکال کر دیکھنا پڑتا ہے، یہ ساری مشقت جس میں یقیناً وقت اور پیسے کا ضیاع بھی ہے، ہم آج تک برداشت کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن ہم سے ابتک یہ نہیں ہوسکا کہ بیانات جس زبان میں دیئے گئے ہیں اسی پر اکتفا کر کے اسے قابل استفادہ بنادیں، یا اپنی عدالتی زبان وہ بنالیں جسے ملک کی اکثریت سمجھتی ہو۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی عوام کے ذہن سے یہ تاثر دور نہیں ہوا کہ ہم پر وہی بدیسی قانون اور نظام مسلط ہے جو انگریز نے ہم پر لادا تھا، چنانچہ اس قانون کے بارے میں نفرت اور عناد کے جو جذبات آزادی سے پہلے تھے، آج بھی وہ کلی طور پر دور نہیں ہوئے، اور کسی بھی قانون کی کامیابی کیلئے جس قبولیت عامہ کی ضرورت ہے وہ آج تک ملکی قانون کو کما حقہ حاصل نہیں ہوئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری شامتِ اعمال سے قیامِ پاکستان کے کچھ ہی عرصے کے بعد ہمارے سیاسی حالات میں وہ ابتری آئی کہ عوام حکومتوں سے بدظن ہوگئے، اور

حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد کی جو فضا کسی بھی قوم کی ترقی کے لئے ضروری ہے وہ مفقود ہو گئی، لوگ یہ سمجھنے لگے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد بھی حکومت ہماری نہیں، کسی اور کی ہے، ہم اب بھی اسی نظام میں جکڑے ہوے ہیں جس میں آزادی سے پہلے مقید تھے، بلکہ اس پر بد نظمی اور بد امنی کا اور اضافہ ہو گیا ہے، لہذا ہمارے حق میں نظام کے لحاظ سے کوئی واضح تبدیلی نہیں آئی ۔

نہ تم بدلے، نہ رُت بدلی، نہ انداز چمن بدلا
میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کرلوں؟

یہ دوسری وجہ ہے جس کی بنا پر سرکاری قوانین اور قاعدوں ضابطوں کے بارے میں وہ منفی ذہنی فضا آج بھی برقرار ہے جو انگریزی سامراج کے دور میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ قانون کا احترام اور قانون کی بالادستی جو کسی بھی ملک و قوم کے استحکام کے لئے سب سے پہلی شرط کی حیثیت رکھتی ہے، ہمارے معاشرے میں عنقا ہوتی جارہی ہے، لوگ دھڑلّے سے قانون کو توڑتے ہیں، اور اس قانون شکنی پر نہ کسی کو ندامت ہوتی ہے، نہ ضمیر ملامت کرتا ہے، انگریز کے دور میں کم از کم پکڑے جانے کا خوف تھا، اب بد نظمی اور افراتفری نے وہ خوف بھی دل سے نکال دیا ہے، اور لا قانونیت کی بن آئی ہے۔

یہ درست ہے کہ اس صورت حال کو بدلنے کی کنجی حکومت کے پاس ہے، وہی نظام میں ایسی تبدیلیاں لاسکتی ہے جن کے نتیجے میں "پرائی حکومت" اور "پرائے قانون" کا یہ تأثر عوام کے دل و دماغ سے نکلے، اور قانون کا صحیح معنی میں احترام پیدا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر حکومت اس سلسلے میں اپنے فرائض سے غفلت برتتی رہی ہے، تو کیا ہمیں لاقانونیت کے اس مزاج پر صبر کرکے بیٹھ جانا چاہئے جو روز بروز زندگی کو دوبھر بنارہا ہے؟ اگر حکومت اپنی اصلاح نہیں کرتی، تو کیا افراد کو بھی اپنی اصلاح نہیں کرنی چاہئے؟

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمیں حکومت سے شکایات ہیں تو ان شکایات کا ازالہ کرنے کی فکر ضرور کرنی چاہئے، اور اگر کسی حکومت سے مایوسی ہو تو حکومت کو بدلنے کی مناسب تدبیر بھی اختیار کرنی چاہئے، لیکن یہ بات کبھی فراموش نہ کی جائے کہ آزادی کے بعد کے حالات بہر صورت پہلے کے مقابلے میں مختلف ہیں، شرعی اعتبار سے بھی صورتِ حال یہ ہے کہ جو قوانین قرآن و سنت سے متصادم ہیں انکی بات تو اور ہے، لیکن جو قوانین اور سرکاری ضابطے قرآن و سنت کے کسی حکم سے نہیں ٹکراتے، ان کی پابندی شرعی اعتبار سے بھی ہر مسلمان حکومت کے باشندے کے لئے ضروری ہے، حکومت خواہ کتنی بری ہو، لیکن اس کے ایسے احکام، بالخصوص وہ احکام جو مصلحت عامہ کے تحت بنائے گئے ہیں ان کی تعمیل ہر باشندے کا فرض ہے، اور آنحضرت ﷺ نے دسیوں احادیث میں اس بات کی تاکید فرمائی ہے، لہذا مسلمان حکومت کے قیام کے بعد کسی ایسے قانون کو توڑنا صرف قانونی غلطی یا جرم ہی نہیں ہے شرعی اعتبار سے بھی گناہ ہے، اور اگر اس قانون شکنی کے نتیجے میں عام لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو، یا اس سے معاشرے میں افراتفری پھیلتی ہو تو بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہونے کی بنا پر انتہائی سنگین گناہ ہے۔

اس وقت ہمارے ملک کی صورتِ حال یہ ہے کہ اگرچہ یہاں بنیادی طور پر انہی انگریزی قوانین کو اختیار کر لیا گیا تھا جو انگریز کے زمانے میں نافذ تھے، لیکن قیام پاکستان کے بعد بہت سے قوانین میں تبدیلی بھی آئی ہے، اور اس دور کے جو قوانین اب بھی نافذ چلے آتے ہیں ان میں سے بہت سے واقعۃً مصلحتِ عامہ پر مبنی ہیں، اور ان سب کے بارے میں یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ وہ شریعت کے خلاف ہیں (اور جو شریعت کے خلاف ہیں، ان کو منسوخ کرنے کے لئے وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے ایک آئینی راستہ بھی اب دستورِ پاکستان میں فراہم کر دیا گیا ہے) لہذا اب وہ ذہنی فضا ختم ہونی چاہئے جس میں قانون شکنی کو برحق اور بہادری کی علامت قرار دے کر قابلِ تعریف سمجھا جاتا تھا۔

کسی بھی قوم یا معاشرے کی ترقی اور استحکام کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اس میں قانون کی حکمرانی ہو، اگر معاشرہ لاقانونیت کا شکار ہو جائے تو یہ صرف حکومت کا نہیں، قوم کے ہر ہر فرد کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے، اگر ہم حکومت کی نااہلی یا غلط کاری کو بنیاد بنا کر لاقانونیت کے عادی بنے رہیں تو یہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مرادف ہے، یہ ملک صرف برسرِ اقتدار افراد کا نہیں، بارہ کروڑ سے زائد افراد کا ہے، ہم سب کا اور ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل اس سے وابستہ ہے، اگر ہم لاقانونیت سے نجات حاصل کرنے کیلئے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کریں گے تو خود بھی افرتفری کا شکار ہو کر امن وسکون سے محروم رہیں گے، اپنے بچوں کے لئے بھی مسائل کا ایسا جہنم چھوڑ کر جائیں گے جو عمر بھر ان کے لئے وبالِ جان بنا رہیگا، اور اپنے اس غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کا حساب ہمیں آخرت میں بھی دینا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ وقتی حیلوں بہانوں سے ہم دنیا کی فوری باز پرس سے بچ جائیں، لیکن اپنی کی ہوئی برائی کے لازمی نتائج بہر صورت رونما ہو کر رہیں گے، اور آخرت کی باز پرس سے تو کوئی بچ ہی نہیں سکتا۔

۱۷/ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
۲۴/ ستمبر ۱۹۹۴ء

پاکی اور صفائی

تقریباً دو سال پہلے میں برطانیہ کے ایک سفر کے دوران برمنگھم سے ٹرین کے ذریعے ایڈنبرا جا رہا تھا، راستے میں مجھے غسل خانہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا تو دیکھا کہ وہاں ایک انگریز خاتون پہلے سے انتظار میں کھڑی ہیں جس سے اندازہ ہوا کہ غسل خانہ خالی نہیں ہے، چنانچہ میں ایک قریبی سیٹ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، جب کچھ دیر گذر گئی تو اچانک غسل خانے کے دروازے پر میری نگاہ پڑی، وہاں Vacant کی تختی صاف نظر آ رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غسل خانہ خالی ہے، اور اسمیں کوئی نہیں ہے، اس کے باوجود وہ خاتون بدستور دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید ان کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے قریب جا کر ان سے کہا کہ غسل خانہ تو خالی ہے، اگر آپ اندر جانا چاہیں تو چلی جائیں، انہوں نے جواب دیا کہ دراصل غسل خانے کے اندر میں ہی تھی، لیکن جب میں پیشاب سے فارغ ہوئی تو ریل پلیٹ فارم پر رک گئی، اور میں کموڈ کو فلش نہیں کرسکی، (یعنی اس پر پانی نہیں بہا سکی)، کیونکہ جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو فلش کرنا مناسب نہیں، اب میں باہر آ کر اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلے تو میں اندر جا کر کموڈ کو فلش کروں، پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھونگی۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا معمولی واقعہ تھا، لیکن میرے ذہن پر ایک نقش چھوڑ گیا، یہ

ایک انگریز خاتون تھیں، اور بظاہر غیر مسلم، لیکن انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ دراصل اسلام کی تعلیم تھی، مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک صاحب سے ایک مرتبہ یہ غلطی سرزد ہوئی کہ وہ غسل خانہ استعمال کرنے کے بعد اسے فلش کئے بغیر باہر آ گئے تو میرے والدِ ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) نے اس پر انہیں سخت تنبیہ کی، اور فرمایا کہ ایسا کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق سخت گناہ ہے، کیونکہ اس طرح گندگی پھیلانے سے آنے والے شخص کو تکلیف ہوگی، اور کسی بھی شخص کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے۔

دوسری طرف جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو اس وقت غسل خانے کا استعمال یا اسے فلش کرنا ریلوے کے قواعد کے تحت اس لئے منع ہے کہ اس کے نتیجے میں ریلوے اسٹیشن کی فضا خراب ہوتی ہے، اور پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کو ریلوے لائن پر پڑی ہوئی گندگی سے ذہنی کوفت بھی ہوتی ہے، اور وہ گندگی بیماریاں پھیلنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے، اس خاتون نے بیک وقت دونوں باتوں کا خیال کیا، ٹرین کے کھڑے ہونے کی حالت میں پانی بہانا بھی گوارا نہ کیا، اور پانی بہائے بغیر سیٹ پر آ کر بیٹھنا بھی پسند نہیں کیا، تاکہ کوئی شخص اس حالت میں جا کر تکلیف نہ اٹھائے۔

ہم مسلمان ہیں، اور ہماری ہر دینی تعلیم کا آغاز ہی طہارت سے ہوتا ہے، جسے آنحضرت ﷺ نے ,,ایمان کا آدھا حصہ،، قرار دیا ہے، نیز آپ ﷺ نے انتہائی باریک بینی سے ہر اس کام سے منع فرمایا ہے جو ناحق کسی دوسرے کی تکلیف کا باعث ہو، لیکن یہ بات کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے مشترک غسل خانے، خواہ وہ ریل میں ہوں یا جہاز میں، بازار میں ہوں یا مسجدوں میں، تعلیم گاہوں میں ہوں یا شفاخانوں میں، ہر جگہ عموماً گندگی کے ایسے مراکز بنے ہوئے ہیں کہ ان کے قریب سے گذرنا مشکل ہوتا ہے، اور جب تک کوئی بپتا ہی نہ پڑ جائے، کسی سلیم الطبع شخص کے لئے ان کا استعمال ایک شدید آزمائش سے کم نہیں۔ اس صورتِ حال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان معاملات میں

ہم نے دین کی تعلیمات کو بالکل نظر انداز کیا ہوا ہے، اور مشترک استعمال کے مقامات پر گندگی پھیلانے کے بعد ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم اذیت رسانی کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، جس کا ہمیں جواب دینا پڑیگا۔

ہمارے ملک میں بھی ریلوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہے کہ جب تک گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہو، بیت الخلا استعمال نہ کیا جائے، لیکن عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی اسٹیشن مشکل ہی سے ایسا ہوگا جس کی ریلوے لائن پر اس ہدایت کی خلاف ورزی کے مکروہ مناظر نظر نہ آتے ہوں، اسی طرح ہوائی جہازوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ بیت الخلا میں کوئی ٹھوس چیز نہ پھینکی جائے، نیز یہ کہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے جو بیسن لگا ہوتا ہے اسے استعمال کرنے کے بعد آنے والے مسافر کی سہولت کے لئے اسے کاغذ کے تولیہ سے صاف کردیا جائے، لیکن ان ہدایات پر بھی کماحقہٗ عمل نہیں کیا جاتا، چنانچہ ہمارے ہوائی جہازوں کے غسل خانے بھی اب ہمارے مجموعی قومی مزاج کی نہایت بھدی تصویر پیش کرتے ہیں، حالانکہ اگر ان ہدایات پر عمل کرکے ہم دوسروں کے لئے راحت کا سامان کریں تو یہ محض ایک شائستگی کی بات ہی نہیں ہے بلکہ یقیناً اجر و ثواب کا کام ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد اتنا مشہور ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو معلوم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ,,ایمان کے ستر سے بھی زیادہ شعبے ہیں، اور ان میں سے ادنیٰ ترین شعبہ یہ ہے کہ راستے سے گندگی یا تکلیف دہ چیز کو دور کردیا جائے،،۔ اس ارشاد نبوی ﷺ کی روشنی میں مؤمن کا کام تو یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے شخص نے بھی کوئی گندگی پھیلادی ہے اور اندیشہ ہے کہ لوگوں کو اس سے تکلیف پہنچے گی، تو وہ خود اسے دور کردے، نہ یہ کہ خود گندگی پھیلاتا پھرے، اگر گندگی دور کرنا ایمان کا شعبہ ہے تو گندگی پھیلانا کس چیز کا شعبہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ بے ایمانی کا، یا کفر و فسق کا؟ لیکن ہم نے اپنے عمل سے کچھ

ایسا تأثر دے رکھا ہے کہ صفائی ستھرائی درحقیقت ہمارا نہیں، بلکہ غیر مسلم مغربی اقوام کا شیوہ ہے۔

یہاں مجھے پھر اپنے والدِ ماجد کا سنایا ہوا ایک لطیفہ یاد آ گیا، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہندوستان میں ایک انگریز مسلمان ہو گیا، اور اس نے پانچوں وقت نماز پڑھنے کیلئے مسجد میں آنا شروع کر دیا، جب کبھی اسے وضو خانے میں جانے کی ضرورت پیش آتی تو یہ دیکھ کر اسکا دل کڑھتا تھا کہ نالیوں میں گندگی پڑی رہتی ہے، کناروں پر کائی جمی رہتی ہے، نہ لوگ ان میں گندگی ڈالنے سے پرہیز کرتے ہیں نہ ان کی صفائی کا کوئی انتظام ہے، آخر ایک روز اس نے یہ طے کیا کہ اس مقدس عبادت گاہ کو صاف رکھنا چونکہ بڑے ثواب کا کام ہے، اس لئے وہ خود ہی یہ خدمت انجام دے گا، چنانچہ وہ کہیں سے جھاڑو وغیرہ لا کر اپنے ہاتھ سے اسے صاف کرنے لگا، معقول مسلمانوں نے تو یقیناً اس کے اس عمل کی قدر کی ہوگی، لیکن محلے کے ایک صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ,,یہ انگریز مسلمان تو ہو گیا، لیکن اس کے دماغ سے انگریزیت کی خو بو نہیں گئی،،۔

جن صاحب نے یہ افسوسناک تبصرہ کیا، انہوں نے تو کھل کر صریح لفظوں ہی میں یہ بات کہدی، لیکن اگر ہمارے مجموعی طرزِ عمل کا جائزہ لیا جائے تو محسوس یہ ہی ہوتا ہے کہ ہم نے صفائی ستھرائی کو ,,انگریزیت کی خو بو،، قرار دے رکھا ہے۔ اور شاید گندگی کو اپنی خُو بُو، حالانکہ اسلام نے، جس کے ہم نام لیوا ہیں، صفائی ستھرائی سے بھی بہت آگے بڑھ کر طہارت کا وہ تصور پیش کیا ہے جو ظاہری صفائی سے کہیں بلند و برتر ہے، اور جسم کے ساتھ ساتھ روح کی پاکیزگی کے وہ طریقے سکھاتا ہے جن سے بیشتر غیر اسلامی اقوام محروم ہیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جن مغربی اقوام کی ظاہری صفائی پسندی کا ذکر پیچھے آیا ہے، ان کا یہ ذوق صرف اس صفائی کی حد تک محدود ہے جو دوسرے کو نظر آئے، لیکن جہاں تک ذاتی اور اندرونی (Intrinsic) صفائی کا تعلق ہے، اس سے ان اقوام کی محرومی کا

تھوڑا سا اندازہ ان طریقوں کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جو وہ بیت الخلا استعمال کرنے کے بعد اپنے جسم کی صفائی کے لئے اختیار کرتے ہیں، جب تک اس عمل کے بعد نہانا نہ ہو، جسم سے گندگی دور کرنے کے لئے پانی کے استعمال کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں، اس بات کا تو ان کے یہاں بڑا اہتمام ہے کہ غسل خانے کے فرش پر پاک پانی کی بھی کوئی چھینٹ پڑی نظر نہ آئے، لیکن جسم سے نجاست اور گندگی کو دور کرنے کے لئے صرف ٹائیلٹ پیپر کو کافی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ پانی کے استعمال کے بغیر گندگی کا کلی ازالہ مشکل ہے، چنانچہ اگر گندگی کے کچھ چھوٹے اجزاء جسم یا کپڑے پر اس طرح باقی رہ جائیں کہ وہ نظر نہ آئیں تو ان کے ازالے کی اتنی فکر نہیں ہے۔ پھر اگر اس عمل کے بعد غسل بھی کرنا ہو تو عموماً اس کا طریقہ یہ ہے کہ ٹب میں پانی جمع کر کے اسی حالت میں پانی کے اندر اس طرح داخل ہو جاتے ہیں کہ پانی کے اخراج کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اور نجاست کے باقی ماندہ چھوٹے اجزاء بعض اوقات پورے پانی کو ناپاک کر سکتے ہیں۔

یہ تمام طریقے اس لئے اختیار کئے گئے ہیں کہ سارا زور صرف اس ظاہری صفائی پر ہے جو دوسرے کو نظر آئے، ذاتی اور اندرونی صفائی جس کا نام ”طہارت“ ہے اسکا کوئی تصور نہیں، اللہ تعالی کے فضل وکرم سے اسلام نے ہمیں ظاہری صفائی ستھرائی (نظافت) کے ساتھ ساتھ ”طہارت“ (پاکی) کے بھی مفصل احکام دیئے ہیں، اس لئے اسلام میں صفائی کا تصور کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بلند وبرتر ہے، اسلام کو ”طہارت“ بھی مطلوب ہے اور نظافت بھی، طہارت کا مقصد یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود واقعی پاک صاف رہے، اور نظافت کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی گندگی سے دوسروں کیلئے تکلیف کا باعث نہ بنے۔

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد نبوی اتنی زیادہ کشادہ نہیں تھی، عام طور سے صحابہ کرامؓ محنت پیشہ تھے، اور موٹے کپڑے پہنتے تھے، گرمی کے موسم میں جب پسینہ

آتا تو کپڑے پسینے سے تر ہو جاتے،اور جمعہ کے اجتماع میں اس پسینے کی وجہ سے بو پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا،اس لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو تاکید فرمائی کہ جمعہ کے روز سب حضرات غسل کر کے، حتی الامکان صاف کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مسجد میں آیا کریں،اب ظاہر ہے کہ طہارت کا کم سے کم تقاضا تو اس طرح بھی پورا ہو سکتا تھا کہ لوگ وضو کر کے آجایا کریں، اور ان کے کپڑے ظاہری نجاست سے پاک ہوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے اس پر کتفا کرنے کے بجائے مذکورہ بالا احکام نظافت کی اہمیت کی وجہ سے عطا فرمائے، تاکہ کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے،اس چھوٹی سی مثال ہی سے یہ بات واضح ہے کہ طہارت کے ساتھ ساتھ نظافت بھی اسلام میں مطلوب ہے،اور کوئی بھی ایسا اقدام جائز نہیں ہے جس کی وجہ سے ماحول میں گندگی پھیلتی ہو، یہ ہر شخص کی ایسی دینی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی کے لئے بنیادی ضرورت توجہ کی ہے، یہ توجہ پیدا ہو جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے ماحول سدھر جاتا ہے۔

۲۶/ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ

۳/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

آدم خوری کی لذّت

کراچی یونیورسٹی سے ایک پروفیسر صاحب نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا ہے کہ:۔

,,غیبت کے متعلق حضور اکرم ﷺ کے ارشادات اور قرآن مجید سب سے میں متفق ہوں کہ غیبت ایسی چیز ہے جیسے بھائی اپنے بھائی کا گوشت کھائے، لیکن میری الجھن نفسیاتی ہے (میں نفسیات، فلسفہ اور عمرانیات کا طالب علم ہوں) انسان اگر غیبت سے اپنے آپ کو روکے رکھے تو یہ گویا تقوی ہے، لیکن عام زندگی میں ہم جب ایک دوسرے کا اسکی غیر حاضری میں ذکر کرتے ہیں تو ہمیں اسکا احساس نہیں ہوتا، عورتیں اس معاملے میں بہت آگے ہیں، کسی دعوت سے آنے کے بعد تنقید کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، کھانے، کپڑے، سب پر تنقید ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ اگر ہم دوسروں کے متعلق بات نہ کریں تو پھر کیا کریں؟ خاموشی یقیناً سب سے بہتر ہے، لیکن وہ کسی ولی اللہ یا بزرگ کو زیب دیتی ہے، ہم کو نہیں، اگر دوسروں کے ذکر کو نکال دیا جائے تو ہماری روزانہ کی گفتگو میں کچھ نہ رہے گا، ہم تمام وقت خاموش بیٹھے رہیں گے، مختصراً غیبت

ایک بہت بڑی نفسیاتی الجھن ہے، ہم تقوی اختیار نہ کریں تو نہ کسی کی برائی کریں، اور نہ کسی کی برائی سنیں، ایسا کرنے کے لئے ہمیں بہت جدو جہد کرنی ہو گی جو عام زندگی میں ممکن نہیں ہے، غیبت کے بغیر ہماری زندگی ایسی ہو گی جیسے ساز کے بغیر موسیقی، اس موضوع پر اگر آپ جنگ ہی میں لکھدیں تو شاید میری طرح بہت سے لوگوں کی الجھن دور ہو سکے،،۔

پروفیسر صاحب نے جو سوال اٹھایا ہے اسکے جواب کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ,,غیبت،، کیا چیز ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، خود آنحضرت ﷺ نے بڑے مختصر اور جامع لفظوں میں ,,غیبت،، کی نپی تلی حقیقت بیان فرمادی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ:۔

,,غیبت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کا تذکرہ (اسکی غیر حاضری میں) اس انداز سے کرو کہ (اگر اسے پتہ چلے تو) اسے ناگوار ہو،،۔

,,غیبت،، کی اس تعریف میں بنیادی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کسی کا تذکرہ اس طرح کیا جائے کہ وہ اس کے لئے ناگواری کا موجب ہو، اگر اس بات کا یقین ہے کہ اس تذکرے سے اسے ناگواری نہیں ہو گی تو وہ غیبت نہیں ہے، خواہ وہ اس کی کسی برائی ہی کا بیان ہو، لہذا اگر کچھ دوست آپس میں بے تکلف ہیں، اور ان کے درمیان ہنسی مذاق اس طرح چلتا رہتا ہے کہ اس میں کسی شخص کی واقعی برائی کا بیان اسے ناگوار نہیں گذرتا، اور ایسی صورت میں وہ اپنے کسی غیر حاضر دوست کا تذکرہ اسی بے تکلفی کے ماحول میں کرتے ہیں، اور اسمیں اسکی کوئی برائی بھی بیان کردیتے ہیں جس کے بارے میں غالب گمان ہوتا ہے کہ وہ اس غائبانہ تذکرے کو ناگوار نہیں سمجھے گا، تو یہ ,,غیبت،، نہیں ہے، لیکن اگر وہی بات اس دوستانہ ماحول سے ہٹ کر کسی ایسی جگہ کہی جاتی ہے جہاں وہ اس دوست

کی خفت، تذلیل یا تحقیر کا موجب ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ بات اسے ناگوار ہو گی، اور ,,غیبت،، میں داخل ہو جائیگی، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں دوستوں کا مقصد اپنے دوست کی بد خواہی، تحقیر یا تذلیل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے جو محبت ہی کا ایک شعبہ ہے، اس لئے ایسا تذکرہ نہ اس کے لئے مضر ہے، نہ اس سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے، اور نہ اسے ناگوار ہوتا ہے، ہاں! بعض لوگ دوستی میں بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں، اور اس قسم کے بے تکلف ماحول میں بھی برائی سے اپنا تذکرہ انہیں ناگوار ہوتا ہے، ایسا تذکرہ پھر غیبت میں داخل ہو جائے گا۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوئی ہو گی کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کا کوئی تذکرہ اسی وقت غیبت بنتا ہے جب وہ اس شخص کی ناگواری یا دلآزاری کا سبب ہو، اس کے بغیر نہیں، پھر غیبت اسی وقت ناجائز اور حرام ہے جب اس کا کوئی جائز مقصد نہ ہو، لیکن اگر ,,غیبت،، کسی جائز اور معقول وجہ سے کی جائے، تو وہ حرام نہیں، مثلاً ایک مظلوم شخص کسی کے ظلم کا نشانہ بنا ہو، اور وہ ظالم کی غیر موجودگی میں اپنی مظلومیت کا ذکر کرے تو یہ جائز ہے، خواہ ظالم کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح اگر کسی شخص کی کوئی برائی اس لئے بتانی ضروری ہو کہ لوگ اس کی برائی کا شکار نہ ہوں، اور اس کی دھوکہ بازی یا اس کے کسی اور شر سے محفوظ رہیں، تو یہ غیبت بھی ناجائز نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات واجب ہو جاتی ہے، لیکن اس قسم کی کسی وجہ کے بغیر کسی شخص کی برائی محض تفریح طبع کے لئے یا اسکی تذلیل کے لئے اس طرح اس کے پیچھے بیان کرنا ضرور حرام ہے، اور سخت حرام ہے، جس سے اسکی دل شکنی اور دلآزاری ہو، یا اسے تکلیف پہنچے، جس غیبت کو قرآنِ کریم نے حرام قرار دے کر اسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے، وہ یہی غیبت ہے۔

,,غیبت،، کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب ہر شخص کو خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا چاہئے کہ اگر ہمیں یہ اطلاع ملے کہ فلاں مجلس میں ہمارا اس طرح مذاق اڑایا

گیا ہے، یا مزے لے لے کر ہماری برائیاں بیان کی گئی ہیں، تو کیا یہ خبر ہمارے لئے دلآزاری، دل شکنی یا تکلیف کا موجب نہیں ہوگی؟ اور کیا ہمیں ان لوگوں سے شکایت پیدا نہیں ہوگی جو محض مجلس آرائی کی خاطر ہماری تحقیر کرتے رہے؟ اگر ہوگی، اور ہم ان کے اس عمل کو اچھا نہیں سمجھیں گے تو دوسروں کے لئے ہم اسی عمل کو کس طرح جائز اور برحق قرار دے سکتے ہیں جو ان کی ناگواری کا باعث ہے؟

آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے کسی کی جس برائی کا تذکرہ کیا، وہ واقعۃً اس میں موجود تھی، ہم نے اس پر کوئی غلط الزام نہیں لگایا ٹھیک ہے! آپ نے جھوٹ نہیں بولا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آپ کی واقعی برائیاں اس طرح برسرعام بیان کی جایا کریں تو یہ آپ کو ناگوار ہوگا یا نہیں؟ اگر ناگوار نہیں ہوگا تو یہ غیبت ہی نہیں، اور اگر ناگوار ہوگا تو جو چیز اپنے لئے ناگوار ہے، وہ دوسروں کے لئے کس منطق یا فلسفے سے گوارا کی جاسکتی ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ جس شخص میں کوئی عیب ہو، اگر وہ اس کا اختیاری عیب ہے، مثلاً کوئی گناہ، کوئی بدعملی، تو نرمی اور خیرخواہی سے خود اسی کو متنبہ کرنا چاہئے، نہ یہ کہ دوسروں کے سامنے اسے رسوا کیا جائے، اِلا یہ کہ اس بدعملی سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہو، تو ایسے میں دوسروں کے سامنے بیان کرنا بھی جائز ہے، اور اگر وہ عیب غیر اختیاری ہے، مثلاً کوئی پیدائشی جسمانی عیب، تو اس میں اس بیچارے کا کیا قصور کہ اسکی وجہ سے اس کا تذکرہ حقارت یا استہزاء کے انداز میں کیا جائے؟

پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ ,,غیبت،، ایک نفسیاتی الجھن ہے، میں اس میں ذرا سی تبدیلی کرکے یہ عرض کروں گا کہ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے، جس غیبت کو قرآن وسنت نے حرام قرار دیا ہے، اس پر جب کبھی انصاف کے ساتھ غور کیا جائے گا، اس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی ایسا محرک ضرور نکلے گا، جو کسی نہ کسی نفسیاتی روگ کی نشان دہی کرے گا، بعض اوقات اس کا محرک حسد ہوتا ہے، ہم کسی شخص کو آگے بڑھتا دیکھتے ہیں، یا لوگوں سے اس کی

تعریف سنتے ہیں تو دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ اسکی برائی کر کے اپنے حسد کو تسکین دی جائے، بعض اوقات غیبت کا محرک احساس کمتری یا تکبر ہوتا ہے، ہم اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا باور کرانا چاہتے ہیں، اور اس شوق میں کسی کی برائی کرتے ہیں کہ ہمیں اس برائی سے پاک سمجھا جائے، کبھی اس کا محرک صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کا مذاق اڑا کر ہم مجلس میں مقبولیت حاصل کریں، یعنی ہم اپنی مقبولیت کی عمارت دوسرے کی آبرو پر کھڑی کرنا چاہتے ہیں، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس طرح کے گیارہ نفسیاتی اسباب کا ذکر فرمایا ہے، جنکی وجہ سے انسان حرام غیبت میں مبتلا ہوتا ہے، یہ تمام اسباب درحقیقت کسی نہ کسی اندرونی روگ کی نشان دہی کرتے ہیں۔

یہ تو غیبت کے اسباب تھے نتائج کا معاملہ یہ ہے کہ اسی غیبت کی بدولت باہمی رنجشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اس سے دلوں مین بغض کی گرھیں پڑتی ہیں، محبت اور خلوص کی جگہ منافقت اور لگاوٹ پیدا ہوتی ہے، اور میل ملاپ کی ہزار رسمی کارروائیوں کے باوجود اندر ہی اندر کینے کا لاوا پکتا رہتا ہے، اور بالآخر کسی وقت باقاعدہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں پھوٹ پڑتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر غیبت کا رواج عام ہے، تو اس کے یہ نتائج بھی عام اور واضح ہیں جنہیں ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے، اب خود دیکھ لیجئے کہ غیبت زندگی کی موسیقی کا ساز ہے، یا محبت وخلوص کے لئے جنگ کا نقارہ؟

پروفیسر صاحب نے درست فرمایا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اکثر وبیشتر مجلسیں غیبت کے گناہ سے ملوث ہوتی ہیں۔ لیکن اگر صرف رواج عام کی بنیاد پر برائیوں کو سندِ جواز دینے کی طرح پڑ جائے تو پھر رشوت، خیانت، جھوٹ اور مکر وفریب وغیرہ میں سے کوئی چیز بھی بری نہیں رہے گی۔ کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ اس بات سے نہیں ہوتا کہ معاشرے میں اسکا کتنا رواج ہو گیا ہے؟ بلکہ اس چیز کا ذاتی حسن وقبح ہی اسکا فیصلہ کرتا ہے، جب آپ خود یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ غیبت بھائی کا گوشت کھانے جیسی چیز

ہے، تو ظاہر ہے کہ محض رواجِ عام کی بنیاد پر آدم خوری کو جائز نہیں کہا جا سکتا۔

رہا یہ سوال کہ ,,اگر ہم دوسروں کے متعلق بات نہ کریں تو پھر کیا کریں؟،، یا یہ خیال کہ ,,اگر دوسروں کے ذکر کو نکال دیا جائے تو ہماری روزانہ کی گفتگو میں کچھ نہ رہے گا،، تو ظاہر ہے کہ یہ باتیں مبالغے پر مبنی ہیں، کیا واقعی دوسروں کی برائی کے سوا ہمارے پاس بات کرنے کیلئے کوئی موضوع نہیں ہے؟ اصل بات تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں خود اپنے عیوب کی اصلاح کی فکر عطا فرمادے تو شاید ہمارے پاس بولنے ہی کے لئے نہیں سوچنے کے لئے بھی کوئی اور موضوع نہ رہے، جو شخص خود کسی شدید درد یا مہلک بیماری میں مبتلا ہو، وہ دوسرے کے نزلے کھانسی کا تذکرہ کرے گا یا اپنے درد اور تکلیف کا؟ لیکن اگر اس اعلیٰ مقام سے بھی تھوڑی دیر کے لئے صرفِ نظر کر لیں تب بھی ,,غیبت،، کو چھوڑنا دو وجہ سے مشکل معلوم ہوتا ہے، ایک تو اس لئے کہ غیبت کی صحیح حقیقت معلوم نہیں ہوتی، اور بعض مرتبہ اس بات کو بھی غیبت سمجھ لیا جاتا ہے جو درحقیقت غیبت نہیں ہے، یا غیبت تو ہے لیکن حرام نہیں ہے، جس کی تھوڑی سی تفصیل میں ابھی عرض کر چکا ہوں، دوسروں پر ہر تنقید غیبت نہیں ہوتی، صرف وہ تنقید غیبت ہے جو کسی جائز وجہ کے بغیر اس طرح کی جائے کہ وہ متعلقہ شخص کو ناگوار ہو، یا اسکی دلآزاری کا سبب بنے، لوگ ہر قسم کی تنقید کو غیبت اور حرام سمجھ کر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ غیبت کو چھوڑنا قابلِ عمل نہیں ہے، اور پھر ہر قسم کی غیبت کا بے محابا ارتکاب کرتے چلے جاتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کسی بیماری کی وجہ سے ذائقہ خراب ہو جائے (یا کسی فکری یا نفسیاتی بیماری سے ذوق بگڑ جائے) تو کڑوی چیز میٹھی اور میٹھی چیز کڑوی معلوم ہونے لگتی ہے، پھر کڑوی چیز کو چھوڑنا مشکل معلوم ہوتا ہے، اس کا علاج یہ نہیں کہ کڑوی چیز کو میٹھی ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس بیماری کے ازالے کی فکر کی جائے جس نے ذوق یا ذائقہ بگاڑ رکھا ہے۔ اس کے لئے کسی ایسے ماہر

طبیب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو بیماری کی صحیح تشخیص کر کے اسکا علاج کرے، اور یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ بیماری کی وجہ سے فیصلہ میرا صحیح نہیں، صحیح فیصلہ اس ماہر طبیب ہی کا ہے، خواہ وہ مجھے بظاہر کتنا غلط یا مشکل معلوم ہوتا ہو، جب انسان اس طبیب کے کہنے پر عمل کرتا ہے، تو رفتہ رفتہ بیماری دور ہو جاتی ہے۔

انسان کا حال یہی ہے کہ مختلف بیرونی عوامل سے اس کا ذوق اور ذائقہ بگڑتا رہتا ہے، اور وہ مہلک چیزوں کو لذیذ سمجھنے لگتا ہے، ایسے ہی مواقع پر قرآن وحدیث اس کے لئے طبیب کا کام کرتے ہیں، جو ان کی بات مان کر عمل کرلیتا ہے، اسکی بیماری دور ہو جاتی ہے، اور پھر اسے زندگی کا لطف گناہوں میں نہیں، گناہوں سے بچنے میں حاصل ہوتا ہے، اور اسے پتہ چلتا ہے کہ گناہوں کی لذت در حقیقت ایسی لذت ہے جیسے ایک خارش زدہ شخص کو اپنی خارش کی جگہ کھجانے میں لذت محسوس ہوتی ہے، لیکن وہ محض دھوکے کی لذت ہے، جو صحت اور تندرستی کی لذت کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

۱۰/ جمادی الاولی ۱۴۱۵ھ

۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

دعوت یا عداوت

کچھ عرصہ قبل میں اپنے ایک عزیز کے یہاں شادی کی ایک تقریب میں مدعو تھا، چونکہ آج کل شادی کی تقریبات متعدد وجوہ سے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہیں، اس لئے میں بہت کم تقریبات میں شرکت کرتا ہوں، اور رشتہ داری یا دوستی کا حق کسی اور مناسب وقت پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اتفاق سے اس روز اسی وقت میں پہلے سے بہار کالونی میں ایک جگہ تقریر کا وعدہ کر چکا تھا، جبکہ شادی کی یہ تقریب نیشنل اسٹیڈیم کے متصل ایک لان میں منعقد ہو رہی تھی، یعنی دونوں جگہوں کے درمیان میلوں کا فاصلہ تھا، اس لئے میرے پاس ایک معقول عذر تھا، جو میں نے تقریب کے منتظمین سے عرض کر دیا، اور پروگرام یہ بنایا کہ میں بہار کالونی جاتے ہوئے اہلِ خانہ کو تقریب میں چھوڑتا جاؤنگا، اور جب بہار کالونی کے پروگرام سے واپس ہونگا تو اس وقت تک تقریب ختم ہو چکی ہوگی، میں منتظمین کو مختصر مبارکباد دے کر گھر والوں کو ساتھ لے جاؤنگا۔ چنانچہ اسی نظم کے مطابق میں نے عشاء کی نماز بہار کالونی میں پڑھی، نماز کے کافی دیر بعد وہاں پروگرام شروع ہوا، مجھ سے پہلے ایک اور صاحب نے خطاب کیا، پھر میرا خطاب بھی تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا، اس کے بعد عشائیہ کا انتظام تھا، میں نے اس میں بھی شرکت کی، پھر وہاں سے روانہ ہوا، اور جب اسٹیڈیم پہنچا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے، خیال یہ تھا کہ اگرچہ دعوت نامے پر نکاح کا وقت آٹھ بجے اور کھانے کا وقت غالباً ساڑھے

آٹھ بجے درج تھا، لیکن اگر کچھ دیر ہوئی ہو گی، تب بھی ساڑھے گیارہ بجے تک ضرور تقریب ختم ہو گئی ہو گی، لیکن جب میں تقریب والے لان میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک بارات ہی نہیں آئی، لوگ بیچارگی کے عالم میں ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے، بعض لوگوں کے کندھوں سے بچے لگے ہوئے تھے جو بھوک یا نیند کے غلبے کی وجہ سے روتے روتے سونے لگے تھے، کچھ لوگ بار بار گھڑی دیکھ کر نکاح میں شرکت کے بغیر واپسی کی سوچ رہے تھے، اور بہت سے افراد منتشر ٹولیوں کی شکل میں وقت گذاری کے لئے بات چیت میں مشغول تھے، اور بہت سے ساکت وصامت بیٹھے آنے والے حالات کا انتظار کر رہے تھے، منتظمین نے لوگوں کے پوچھنے پر انہیں "اطمینان" دلایا کہ ابھی فون سے پتہ چلا ہے کہ بارات روانہ ہو رہی ہے، اور انشاءاللہ آدھے گھنٹے تک یہاں پہنچ جائیگی!!

میں تو خیر پہلے ہی معذرت کر چکا تھا، اس لئے چند منٹ بعد منتظمین سے اجازت لے کر چلا آیا، لیکن آدھے گھنٹے بعد بارات کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ سوا بارہ بجے رات کو بارات پہنچی ہو گی، ساڑھے بارہ کے وقت نکاح ہوا ہو گا، اور کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے یقیناً لوگوں کو ڈیڑھ بج گیا ہو گا۔

یہ تو ایک تقریب کا واقعہ تھا، شہر کی بیشتر شادی کی تقریبات کا یہی حال ہے کہ دعوت نامے پر لکھے ہوئے اوقات قطعی طور پر بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں، خود لکھنے والوں کا ارادہ بھی یہی ہوتا ہے کہ ہم ان اوقات کی پابندی نہیں کرینگے، لہٰذا جن حضرات کو دعوت نامہ پہنچتا ہے، وہ بھی اتنی بات تو یقین سے جانتے ہیں کہ دعوت نامہ میں لکھے ہوئے اوقات پر عمل نہیں ہو گا، لیکن تقریب کے واقعی اوقات کیا ہونگے؟ چونکہ اس کے بارے میں یقینی بات کوئی نہیں بتا سکتا، اس لئے ہر شخص اپنا الگ اندازہ لگاتا ہے، شروع شروع میں لوگوں نے یہ اندازہ لگانا شروع کیا کہ مقررہ وقت سے آدھے پون گھنٹے کی تاخیر ہو جائیگی، لیکن جب اس حساب سے دعوت میں پہنچ کر گھنٹوں خوار ہونا پڑا تو انہوں نے

تاخیر کا اندازہ اور بڑھالیا، اور اس طرح ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نہ اب تاخیر کی کوئی حد مقرر ہے، نہ اندازوں کا کوئی حساب، ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں کہ رات کو ایک بجے کے بعد نکاح ہوا، اور لوگ دو بجے کے بعد اپنے گھروں کا رخ کر سکے، ہر شخص کے پاس اپنی سواری بھی نہیں ہوتی، اور رات گئے سواری کا انتظام ہوئے شیر لانا تو ہے ہی، شہر کے موجودہ حالات کے پیش نظر جان کا جوا کھیلنے کے مرادف بھی ہے۔

اس صورتِ حال کے نتیجے میں کسی ایک تقریب میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کم از کم چار پانچ گھنٹے خرچ کرے، بے مقصد انتظار کی کوفت برداشت کرے، رات گئے ٹیکسیوں کا کئی گنا کرایہ ادا کرے، اور پھر بھی سارے راستے ممکنہ خطرات سے سہما رہے، رات کو بے وقت سونے کے نتیجے میں صبح کو دیر سے بیدار ہو کر فجر کی نماز غائب کرے، اور یا تو اگلے روز آدھے دن کی چھٹی کرے، یا نیم غنودگی کی حالت میں الٹا سیدھا کام کرے، سوال یہ ہے کہ

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

دنیا کا کوئی نظامِ فکر ایسا نہیں ہے جس میں وقت کو انسان کی سب سے بڑی دولت قرار دے کر اسکی اہمیت پر زور نہ دیا گیا ہو۔ انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اور جو قومیں وقت کی قدر پہچان کر اسے ٹھیک ٹھیک استعمال کرتی ہیں، وہی دنیا میں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔

مجھے کبھی جاپان جانے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن میرے ایک دوست نے (جو خاصے ثقہ ہیں) ایک صاحب کا یہ قصہ سنایا کہ وہ اپنے کسی تجارتی مقصد سے جاپان گئے تھے، وہاں ان کے ایک ہم پیشہ تاجر یا صنعت کار نے انہیں رات کے کھانے پر اپنے یہاں دعوت دی، جب یہ صاحب کھانے کے مقررہ وقت پر ان کے گھر پہنچے تو میزبان کھانے کی میز پر بیٹھ چکے تھے، اور کھانا لگایا جا چکا تھا، ان صاحب کو کسی قسم کے تمہیدی تکلفات کے بغیر

سیدھے کھانے کی میز پر لے جا کر بٹھا دیا گیا، اور کھانا فوراً شروع ہوگیا، کھانے کے دوران باتیں ہوتی رہیں، لیکن ان صاحب نے ایک عجیب سی بات یہ نوٹ کی کہ میزبانوں کے پاؤں کھانے کے دوران ایک خاص انداز سے حرکت کر رہے تھے، شروع میں انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید یہ اس انداز کی حرکت ہے جیسے بعض لوگ بے مقصد پاؤں ہلانے کے عادی ہوجاتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ پاؤں کی حرکت میں کچھ ایسی باقاعدگی ہے جو بے مقصد حرکت میں عموماً نہیں ہوا کرتی، بالآخر انہوں نے میزبانوں سے پوچھ ہی لیا، اور ان صاحب کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ دراصل میز کے نیچے کوئی مشین رکھی ہوئی ہے اور وہ کھانے کے دوران بھی اپنا پاؤں استعمال کر کے کوئی ہلکا پھلکا ''پیداواری کام'' جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ سچا ہے یا کسی ''جہاں دیدہ'' نے زیب داستان کے لئے گھڑا ہے، لیکن اس قسم کے قصے بھی اسی قوم کے بارے میں گھڑے جاسکتے ہیں جس نے اپنے عمل سے وقت کی قدر و قیمت پہچاننے اور محنت کرنے کی مثالیں قائم کی ہوں، ہمارے ملک کے بارے میں اس قسم کا کوئی قصہ جھوٹ موٹ بھی نہیں گھڑا جاسکتا، اس لئے کہ ہمارا مجموعی طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ وقت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ بے وقعت چیز ہے، اور اگر شادی کی کسی ایک رسمی تقریب میں شرکت کے لئے ہمارا پورا دن برباد ہوجائے تو بھی ہمیں کوئی پروا نہیں۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہم وقت کی یہ ناقدری اس دین اسلام کے نام لیوا ہونے کے باوجود کرتے ہیں جس نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب آخرت میں دینا ہوگا، جس نے پانچ وقت کی باجماعت نماز مقرر کر کے اس کے ہر دن کو خود بخود پانچ حصوں میں تقسیم کردیا ہے، اور اس کے ذریعے شب و روز کا بہترین نظام الاوقات طے کرنا آسان بنادیا ہے۔

یوں تو وقت ضائع کرنے کے مظاہرے ہم زندگی کے ہر شعبے میں کرتے ہیں، لیکن اس وقت موضوعِ گفتگو تقریبات اور دعوتیں تھیں جن میں وقت کی پابندی نہ کر کے ہم اپنا بھی، اور سینکڑوں مدعوین کا بھی وقت برباد کرتے ہیں، لوگوں کو دعوت میں بلا کر انہیں غیر محدود مدت تک انتظار کی قید میں رکھنا ان سب کے ساتھ ایسی زیادتی ہے جس کے خلاف ایسے خوشی کے مواقع پر کوئی احتجاج کرنا بھی آسان نہیں ہوتا، کیونکہ لوگ مروت میں اس زیادتی پر زبان بھی نہیں کھولتے، لیکن جو شخص بھی انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو بلاوجہ تکلیف پہنچانے کا سبب بنے، کیا وہ گنہگار نہیں ہوگا؟ مدعو حضرات میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کا وقت بچتا تو ملک و ملت کے کسی مفید کام میں خرچ ہوتا، ایسے لوگوں کا وقت ضائع کر کے انہیں گھنٹوں بے مقصد بٹھائے رکھنا صرف ان پر نہیں، ملک و ملت پر بھی ظلم ہے، یہ حقیقت میں دعوت نہیں، عداوت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ ایک غلط رِیت معاشرے میں چل پڑی ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اسے غلط سمجھ کر اسکی اصلاح کرنا بھی چاہے تو اب اصلاح اس کے بس میں نہیں رہی، لیکن مجھے اس نقطہ نظر سے کبھی اتفاق نہیں ہوا، سوال یہ ہے کہ آپ اس قسم کی غلط، بلکہ مہلک، رِیت کا کب تک ساتھ دیں گے؟ کب تک رواجِ عام کو غلطیوں کا بہانہ بنایا جاتا رہے گا؟ ہر غلط رِیت کے آگے ہتھیار ڈال کر اس کے بہاؤ پر بہنے کا سلسلہ آخر کہاں جاکر رکے گا؟۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل ضرورت صرف ایک پختہ اور ناقابلِ شکست ارادے کی ہے، اسی ماحول میں جہاں مقررہ وقت پر کسی دعوت میں پہنچنے والا بے وقوف سمجھا جاتا ہے، خود میں نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے دعوت نامے پر پابندیٔ وقت کی خصوصی ہدایت لکھی، اور اس پر عمل کر کے بھی دکھایا، اور کھانے کا جو وقت دیا گیا تھا، اس پر کھانا واقعی شروع کر دیا، اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ حاضرین کم ہیں یا زیادہ؟ سوال یہ ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پابندیٔ وقت کے خصوصی التماس کے باوجود آنے میں

دیر کی ہے تو اسکی سزا ان لوگوں کو کیوں دی جائے جو بے چارے وقت پر آگئے تھے؟ جب تک کچھ لوگ اِن باتوں کو سنجیدگی سے سوچ کر پابندیٔ وقت کا تہیہ نہیں کریں گے، اس وقت تک تقریبات کا یہ بے ڈھب سلسلہ کسی حد پر نہیں رکے گا۔ آج بھی جو تقریبات ہوٹلوں میں ہوتی ہیں، اور جہاں گھنٹوں کے حساب سے بکنگ ہوتی ہے، وہاں سارے کام کس طرح وقت پر ہو جاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ ضرورت صرف پختہ ارادے کی ہے، اگر چند افراد بھی یہ پختہ ارادہ کرلیں اور اس پر عمل کر کے دکھادیں تو تبدیلی ہمیشہ افراد ہی سے آتی ہے، اور پھر رفتہ رفتہ وہ عمومی رواج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

۲۴/ جماد الاولی ۱۴۱۵ھ
۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۴ء

حج کے بارے میں کچھ گذارشات

آج کل حج پر جانے کے خواہش مند حضرات سے درخواستیں وصول کی جارہی ہیں، اس سلسلے میں حج پالیسی کا اعلان ہو چکا ہے، اور قواعد وضوابط مشتہر کردیئے گئے ہیں، غالباً ۳۰/نومبر تک حج کی درخواستیں وصول کی جائیں گی، اس موقع پر بعض قارئین نے خط کے ذریعے توجہ دلائی ہے کہ حج کی فرضیت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اگر ایک مضمون کے ذریعے ان کا ازالہ کردیا جائے تو مفید ہوگا، اس فرمائش کی تعمیل میں چند گذارشات پیش خدمت ہیں۔

(۱) حج کے بارے میں بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑھاپے میں کرنے کا کام ہے، لہذا جب تک اچھی خاصی عمر نہ گذر جائے، لوگوں کو دھیان ہی نہیں ہوتا کہ اس فریضے کی ادائیگی کرنی چاہئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حج کا کسی خاص عمر سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس طرح نماز اور روزہ بالغ ہوتے ہی انسان کے ذمے فرض ہو جاتے ہیں، اور اگر انسان صاحبِ نصاب ہو تو زکوۃ بھی فرض ہو جاتی ہے، اسی طرح بالغ ہونے کے بعد جب بھی کسی شخص کو اتنی استطاعت حاصل ہو کہ وہ حج کر سکے، اس پر فوراً حج فرض ہو جاتا ہے، قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ حج ہر اس شخص پر فرض ہے جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو، اس استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس مکہ مکرمہ آنے جانے اور وہاں قیام وطعام وغیرہ کا ضروری خرچ موجود ہو، نیز اگر وہ اہل وعیال کو

وطن میں چھوڑ کر جارہا ہے تو ان کے ضروری اخراجات انہیں دے کر جاسکے، جب کبھی کسی شخص کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ وہ یہ ضروریات پوری کرسکے، تو اس پر حج کی ادائیگی فرض ہے، اگر اتنا خرچ نقد موجود نہ ہو، لیکن اپنی ملکیت میں اتنا زیور ہو، یا فوری ضرورت سے زائد اتنا سامان (مثلاً سامانِ تجارت) ہو کہ اسکی مالیت سے یہ خرچ پورے ہو سکتے ہوں تو اس پر بھی حج فرض ہو جاتا ہے۔

(۲) جب ایک مرتبہ حج فرض ہو جائے تو پھر اسے کسی شدید عذر کے بغیر ٹلانا یا مؤخر کرنا جائز نہیں، بلاوجہ مؤخر کرنے سے انسان گناہگار ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کتنا عرصہ زندہ رہے گا، لہذا حج فرض ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو، یہ فریضہ ادا کرلینا چاہئے، آج کل چونکہ اس کام کے لئے درخواست دے کر منظوری لینی پڑتی ہے، اس لئے جس شخص کے ذمے بھی اوپر بیان کئے ہوئے معیار کے مطابق حج فرض ہو، اس پر حج کے لئے درخواست دینا شرعاً ضروری ہے، اگر قرعہ اندازی میں نام نہ آئے، یا سرکار کی طرف سے اجازت نہ ملے تو ایک مجبوری ہے، اور انشاءاللہ اس صورت میں درخواست دینے والا حج کو مؤخر کرنے سے گناہگار نہیں ہوگا، اور جب تک وہ ہر سال درخواست دیتا رہے گا، اسکی ذمہ داری پوری ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ اسے اجازت مل جائے، اور وہ باقاعدہ حج کرے۔ لیکن یہ تصور قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تصور ہے کہ جب عمر بڑی ہو جائے گی اس وقت حج کے لئے درخواست بھیجی جائیگی۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ حج کا اصل لطف درحقیقت جوانی ہی میں ہے، اول تو اس لئے کہ حج میں جسمانی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے، اور حج کے افعال اسی وقت نشاط اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیئے جاسکتے ہیں جب انسان کے قویٰ اچھے ہوں، اور وہ اطمینان کے ساتھ یہ محنت برداشت کرسکتا ہو، ورنہ بڑھاپے میں اگرچہ انسان جوں توں کرکے حج کرلیتا ہے، لیکن کتنے کام ایسے ہیں جنہیں نشاط چستی اور حضورِ قلب کے

ساتھ انجام دینے کی حسرت ہی دل میں رہ جاتی ہے، دوسرے اس لئے کہ حج اگر اخلاص اور نیک نیتی سے صحیح طور پر انجام دیا جائے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ایک انقلاب ضرور لے کر آتا ہے، اس سے انسان کے دل میں نرمی، اللہ تعالی کے ساتھ تعلق اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے جو بالآخر اسے گناہوں، جرائم اور بدعنوانیوں سے روکتی ہے، قلب وذہن کی اس تبدیلی کی سب سے زیادہ ضرورت انسان کو جوانی میں ہوتی ہے، کیونکہ اسکے بغیر وہ جوانی کی رو میں غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے ؎

وقت پیری گرگِ ظالم می شود پرہیزگار

درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری ست

(بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی "پرہیزگار" بن جاتا ہے، پیغمبروں کا شیوہ یہ ہے کہ جوانی میں ظلم اور گناہ سے توبہ کی جائے)

(۳) یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے کہ جب تک تمام اولاد کی شادیاں نہ ہو جائیں، اس وقت تک حج نہیں کرنا چاہئے، یہ خیال بھی سراسر غلط ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں حقیقت یہ ہے کہ حج کی فرضیت کا اولاد کی شادیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس شخص کو بھی مذکورہ بالا معیار کے مطابق استطاعت ہو، اس کے ذمے حج فرض ہو جاتا ہے، خواہ اولاد کی شادیاں ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں۔

(۴) بعض گھرانوں میں یہ رواج بھی دیکھنے میں آیا کہ جب تک گھر کا بڑا فرد حج نہ کرلے اس وقت تک چھوٹے حج کرنا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ بعض گھرانوں میں اسکو ایک عیب سمجھا جاتا ہے کہ چھوٹا بڑے سے پہلے حج کر آئے، حالانکہ دوسری عبادتوں یعنی نماز، روزے اور زکوۃ کی طرح حج بھی ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر شخص پر انفرادی طور سے عائد ہوتا ہے، خواہ کسی دوسرے نے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو، اگر گھر کے کسی چھوٹے فرد کے پاس حج کی استطاعت ہے تو اس پر حج فرض ہے، اگر بڑے کے پاس استطاعت نہ ہو، یا

استطاعت کے باوجود وہ حج نہ کر رہا ہو تو نہ اس سے چھوٹے کا فریضہ ساقط ہوتا ہے، نہ اسے مؤخر کرنے کا کوئی جواز پیدا ہوتا ہے۔

(۵) بہت سے گھرانوں میں یہ صورت دیکھنے میں آئی کہ باپ صاحبِ استطاعت نہیں ہے مگر بیٹا صاحبِ استطاعت ہے، اس کے باوجود وہ یہ سمجھتا ہے کہ پہلے میں باپ کو حج کراؤں، پھر خود حج کروں، یا اس وقت کا انتظار کروں جب میں باپ کو اپنے ساتھ حج کو لے جاسکوں، یہ طرز عمل بھی درست نہیں ہے، اگرچہ باپ کو حج کرانا ایک بڑی سعادت مندی ہے، لیکن اس سعادت کے حصول کے لئے اپنے فریضہ کو مؤخر کرنا درست نہیں، اسکی مثال ایسی ہے جیسے رمضان کے مہینے میں باپ بیماری یا ضعیفی کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو بیٹے کے لئے اس بات کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ وہ باپ کی وجہ سے خود اپنے روزے بھی چھوڑ دے، اور یہ طے کرلے کہ جب تک باپ روزے رکھنے کے لائق نہ ہو، میں بھی روزے نہیں رکھونگا، جس طرح یہ طرز عمل غلط ہے، اسی طرح اپنے حج کو باپ کے حج پر موقوف رکھنا بھی غلط ہے، اپنا فرض ادا کرلینا چاہئے، پھر جب کبھی استطاعت ہو، اس وقت باپ کو حج کرانے کی بھی کوشش کرلینی چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حج ایک عبادت ہے، اور وہ اسی طرح ہر شخص پر انفرادی طور سے فرض ہوتی ہے، جیسے نماز روزہ، اور کسی کے ذمے دوسرے کو نہ حج کرانا فرض ہے، نہ اپنے حج کی ادائیگی دوسرے کے حج پر موقوف ہے، لہذا جن حضرات کے ذمے مذکورہ بالا معیار کے مطابق حج فرض ہوچکا ہے، انہیں حج کی درخواست ضرور دینی چاہئے۔

(۶) جن حضرات کی درخواستیں منظور ہو جائیں، انہیں جانے سے پہلے حج کے مکمل احکام و آداب سیکھنے چاہئیں، اس کے لئے ہر زبان میں کتابیں بھی موجود ہیں، اور ہمارے ملک میں مختلف حلقوں کی طرف سے حج کے تربیتی کورس بھی منعقد ہوتے ہیں ان میں شرکت کرنی چاہئے، عموماً درخواست کی منظوری اور حج کے لئے روانگی کے

درمیان خاصا طویل وقفہ ہوتا ہے جو حج کے احکام و آداب سیکھنے کے لئے بہت کافی ہے، بہت سے حضرات اس طرف توجہ دیئے بغیر حج کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں، اور اتنا خرچ اور مشقت اٹھا کر بھی صحیح طریقے کے مطابق حج کرنے سے محروم رہتے ہیں، بعض حضرات اپنی اس لاعلمی کو اپنی من گھڑت آراء کے پردے میں چھپانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، اور اپنی رائے سے حج کے طریقوں میں خود ساختہ تبدیلیاں بھی کر لیتے ہیں۔

دنیا میں ہر کام کے لئے کچھ ادب آداب ہیں، اور تو اور کھیلوں تک کے آداب اور قواعد مقرر ہیں، اور اب تو کھیلوں کے آداب و قواعد مستقل فن کی صورت اختیار کر گئے ہیں، اور کوئی شخص کھیل بھی کھیلنا چاہے تو اسے یہ قواعد سیکھنے پڑتے ہیں، اور دل مانے یا نہ مانے، ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے، حج تو پھر ایک عبادت ہے، بڑی مقدس اور عظیم الشان عبادت، لہذا اس کے آداب و آحکام سیکھنا اور انکی پابندی کرنا ضروری ہے، محض اپنی رائے کے بل پر ان قواعد و آداب میں تبدیلی کرنا اپنی محنت اور پیسے کو ضائع کرنے کے مرادف ہے، اگر اپنی من مانی کرنی ہے تو حج کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(۷) حج چونکہ تمام مسلمان اکٹھے ہو کر انجام دیتے ہیں اور حج کے موقع پر انسانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے، اس لئے اس میں ایک دوسرے سے تکلیف پہنچنے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں، اسی لئے اسلام نے حج کے احکام میں اس بات کو خاص طور پر مد نظر رکھا ہے کہ کوئی شخص کسی کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے، قدم قدم پر ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن کا مقصد لوگوں کو تکلیف سے بچانا ہے، اس غرض کے لئے بہت سے ایسے کاموں کو ترک کرنے کی ہدایت دی گئی ہے جو بذاتِ خود بہت فضیلت رکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ صحیح معلومات اور مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان احکام کو پسِ پشت ڈال کر دوسروں کے لئے جان تک کا خطرہ پیدا کر دیتے ہیں، جو کام تھوڑا سا صبر و تحمل پیدا کر کے آرام و سکون کے ساتھ ہو سکتے ہیں ان میں دھکا پیل کی جاتی ہے، اور

بلاوجہ حج جیسی عبادت کو دھینگا مشتی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات اسلامی احکام کے قطعی خلاف اور سراسر ناجائز ہے جس سے عبادت کی روح پامال ہوتی ہے، لہذا حج کے تربیتی کورسوں اور حج سے متعلق ہدایات میں یہ پہلو خاص طور سے نمایاں کر کے اس پر زور دینے کی ضرورت ہے، وزارتِ مذہبی امور کو بطور خاص اس کام پر توجہ دینی چاہئے، حج کی پروازوں میں تمام راستے ایسی تقریریں نشر کی جانی چاہیں جو عوام کو ان احکام و آداب سے نہ صرف واقف کرائیں، بلکہ انکی اہمیت ان کے ذہن میں اچھی طرح بٹھادیں۔

یکم جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
۶/ نومبر ۱۹۹۴ء

دشمن کو پہچانیئے

کراچی کے روز بروز بگڑتے ہوے حالات سے کون محبِ وطن ہے جو سہما ہوا نہ ہو، مال اور آبرو کا تو ذکر ہی کیا ہے، ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی جان پر بنی ہوئی ہے، انسانی جان مکھی مچھر سے زیادہ بے وقعت ہو چکی ہے، مکھی مچھر کو مارنے کا بھی کوئی مقصد ہوتا ہے، لیکن یہاں کسی مقصد کے بغیر انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جارہا ہے، کسی کی شادی میں شریک ہونے کے لئے آئی ہوئی بارات دولہا کا جنازہ پڑھ کر جارہی ہے، معصوم بچوں کو ماؤں کی گود میں بھی پناہ نہیں مل رہی، بے مہار چلتی ہوئی گولیاں کتنے پھول سے بچوں کے سینے چھید چکی ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں گھر ماتم کدوں میں تبدیل ہو چکے ہیں، غرض بدامنی اور افراتفری کے عفریت نے اس جگمگاتے ہوے شہر کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہے کہ ماضی میں اسکی مثال نہیں ملتی۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی تھی کہ ایک وقت قتل و غارت گری کا بازار ایسا گرم ہوگا کہ مقتول کے بارے میں یہ پتہ ہی نہیں چل سکے گا کہ اسے کس نے مارا اور کیوں مارا؟ آج کل کراچی کے حالات اس حدیث نبوی کی عملی تفسیر بن کر رہ گئے ہیں۔

مسائل کی ڈور اس طرح الجھی ہے کہ اس کا سرا پکڑنا بھی آسان نہیں، اس صورت حال کے اسباب سیاسی بھی ہیں، انتظامی بھی، دینی بھی ہیں اور اخلاقی بھی، اہل فکر و دانش یقیناً ان تمام پہلوؤں پر سوچ رہے ہیں، اور ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا بھی جارہا ہے،

لیکن ایک بات تقریباً تمام تجزیوں میں مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ کہ اس صورت حال میں کوئی نہ کوئی بیرونی ہاتھ ضرور کار فرما ہے، پچھلے دنوں بعض افراد، جنکی کسی سے دشمنی بھی بظاہر نہیں تھی، نہ وہ کسی قسم کی سیاست میں ملوث تھے، جس طرح بے دردی سے قتل ہوے، اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ قاتلوں کا مقصد کسی خاص شخص یا گروہ کو نشانہ بنانا نہیں تھا، بلکہ محض دہشت گردی، تخریب کاری اور افراتفری پیدا کرنا مقصود تھا۔

اس صورتِ حال کی وجہ سے تقریباہر محبّ وطن یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ ملک کے اس حصے کے خلاف دشمنوں کی طرف سے کوئی گہری سازش ہو رہی ہے، یہ حقیقت تو کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں کو پاکستان کبھی ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اور اس کے قیام سے لے کر آج تک وہ اسے زک پہنچانے، اسے پٹری سے اتارنے اور اسکی شکست وریخت کے لئے ہر ممکن سازشیں کرتے آئے ہیں۔

لیکن مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دشمنوں کی کوئی سازش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکی جب تک اسے اندر سے خود مسلمانوں نے تقویت نہ پہنچائی ہو، بیشتر مواقع پر اسکی صورت یہ ہوئی ہے کہ دشمنوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دے کر بھڑکایا، مسلمانوں نے اپنے حقیقی دشمن کو پہچاننے میں غلطی کی، وہ مشتعل جذبات سے مغلوب ہو کر خود آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، اور اپنے باہمی اختلافات کو خونریز تصادم میں تبدیل کر ڈالا، اس صورتِ حال کا تمامتر فائدہ ان کے مشترک دشمن کو پہنچا، اور بالآخر وہ اس کے سامنے ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

تاریخ ہمارے سامنے یہ سبق اتنی مرتبہ دہرا چکی ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے، لیکن تین نشے ایسے ہیں جو بار بار چوٹ کھانے کے باوجود ہمارے سر سے نہیں اترتے، اور ہم ہر بار اپنے آپ کو ان کے سامنے بے بس کر ڈالتے ہیں۔ ایک اقتدار کی جنگ کا نشہ ہے،

دوسرے لسانی اور قومی عصبیت کا اور تیسرے فرقہ واریت کا۔ ہم ہر مرتبہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اقتدار ہو یا گروہی اور فرقہ وارانہ مفادات، یہ سب چیزیں ملک کے وجود و بقا سے وابستہ ہیں، ملک ہوگا تو یہ مفادات حاصل ہونے کا امکان ہوگا، اور اگر خدانخواستہ ملک ہی نہ رہا تو کیسا اقتدار اور کیسے گروہی مفادات؟

جس بات سے موجودہ حالات میں ہر محبّ وطن کو بجا طور پر تشویش ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تینوں نشے اس وقت اپنے عروج پر ہیں، اور تینوں میدانوں میں انتہا پسند جذبات اشتعال کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہیں جو دشمن کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اختلافات سیاسی ہوں، یا مذہبی، یا گروہی، ان میں سے کوئی اختلاف ایسا نہیں ہے جو آج نیا پیدا ہو گیا ہو، ان میں سے بعض اختلافات ایسے ہیں جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں، بعض ایسے ہیں جو سالہا سال سے موجود ہیں، لیکن آج ایسی کونسی نئی بات پیدا ہوگئی ہے جس نے ان اختلافات کو بقائے باہمی کی فکر پیدا کرنے کے بجائے مرنے مارنے کے جذبے میں تبدیل کر دیا ہے؟ پچھلے دنوں، خاص طور سے کراچی میں، جو خونریز ہنگامے ہوئے ہیں ان میں بعض حضرات نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی ہے کہ بعض مرتبہ دو مد مقابل گروہوں میں سے ہر ایک پر فائرنگ کرنے والی گاڑی ایک ہی تھی، ایک ہی گاڑی نے پہلے ایک گروہ پر گولی چلائی، پھر اسی گاڑی نے پہلے گروہ کے مخالفین پر جا کر گولیوں کی بارش کی، تاکہ ان میں سے ہر گروہ یہ سمجھے کہ اس پر اسکے مخالفین نے حملہ کیا ہے، اور اس کے نتیجے میں دونوں گروہ مشتعل ہو کر ایک دوسرے سے گتھ جائیں۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آنی چاہئے کہ یک بیک ان اختلافات کے بھڑک اٹھنے کا ایک اہم سبب کسی ایسے عنصر کی سازش ہے جو دونوں متحارب گروہوں میں سے کسی کا دوست نہیں، بلکہ وہ ہر قیمت پر ایک گروہ کو دوسرے کے خلاف اشتعال دلا کر ان کے درمیان خانہ جنگی کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے، اور

یہی وہ نازک مرحلہ ہے جہاں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ لوگ اپنے حقیقی دشمن کو پہچانیں، اور محدود جذباتی فضا کے خول سے باہر نکل کر اس دشمن کا مقابلہ کریں جو ان کے خلاف انتہائی باریک چالیں چل رہا ہے۔

ایسے مواقع پر جب لوگوں کے دل پر جذبات کی حکمرانی ہو، سب سے زیادہ مہلک چیز ان افواہوں پر بھروسہ کرنا ہے جو تحقیق کے بغیر اڑادی جاتی ہیں۔ ان افواہوں کا بعض اوقات مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی نگاہ اصل سازش سے ہٹا کر انہیں کسی جذباتی فیصلے میں الجھادیا جائے۔ یہی ایک زندہ قوم کے صبر و تحمل کا امتحان ہے کہ آیا وہ اس قسم کی افواہوں پر کان دھرنے کے بجائے خرابی کا صحیح سرا پکڑتی ہے، یا جذبات کی رو میں بہہ کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لیتی ہے؟

یہ درست ہے کہ ملک کو اس قت چومکھی سازشوں کا سامنا ہے، لیکن اگر اہل وطن یہ تہیہ کرلیں کہ وہ اندھے جذبات سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنے حقیقی دشمن کو پہچان کر اس کا مقابلہ کریں گے، اور باہمی اختلافات کا تصفیہ خالصۃً پرامن ذرائع سے کریں گے تو دنیا کی کوئی طاقت انشاء اللہ انہیں زیر نہیں کرسکے گی، جو قوم یہ تہیہ کرلے اسکے خلاف نہ بیرونی سازشیں کامیاب ہوسکتی ہیں، نہ اندرونی صفوں میں چھپے ہوئے غدار اور منافق اس کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔

اس پس منظر میں یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہمارا ایک بہت بڑا دشمن خود ہمارے وہ نفسانی جذبات بھی ہیں جو چھوٹے چھوٹے فوائد اور لذتوں کے حصول کے لئے حلال و حرام کی فکر مٹادیتے ہیں، جو محدود مفادات کی خاطر پورے ملک و قوم کو داؤں پر لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے، جو ہمیں مرنے کے بعد کی زندگی سے غافل بنا کر دلوں سے خدا کا خوف مٹادیتے ہیں، جو ہمارے ذہنوں سے انصاف اور حقیقت پسندی کو کھرچ کر ان میں اپنوں اور غیروں کے لئے دو مختلف پیمانے نصب کرتے ہیں، اور جن کے نتیجے میں ہم

اپنے لئے وہ حقوق مانگتے ہیں جو دوسروں کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ان نفسانی جذبات سے مغلوب ہو کر ہم اپنی عملی زندگی میں شب و روز اللہ تعالیٰ کے احکام کی کھلم کھلا نافرمانی کرتے ہیں، اور دل میں ندامت کی کوئی لہر پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وہ بداعمالیاں ہیں جن کا عذاب باہمی نااتفاقی اور خانہ جنگی کی صورت میں رونما ہوتا ہے، اور ہمارے بیرونی دشمنوں کے لئے راستہ صاف کر دیتا ہے۔ جب تک ہم اپنے گناہوں اور بداعمالیوں سے توبہ کر کے اپنے اصل دشمنوں کو نہیں پہچانیں گے، ہماری بے چینیاں امن و سکون میں تبدیل نہیں ہو سکیں گی۔

۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
۲۰/ نومبر ۱۹۹۴ء

جان کی قیمت

ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا تو پورے عالمِ اسلام میں بجا طور پر ایک کہرام مچ گیا، مسجد آباد ہو یا غیر آباد اسکی ذاتی حرمت وتقدس میں کوئی فرق نہیں آتا، ایک مسلمان کے لئے اسکی بے حرمتی یقیناً ناقابلِ برداشت ہے۔ اسی طرح کشمیر میں چرار شریف کا سانحہ پیش آیا تو نہ صرف پاکستان کے مسلمانوں نے اسکی بے چینی اپنے دل میں محسوس کی، بلکہ اسلامی دنیا میں جہاں کہیں اس سانحے کی خبر پہنچی، مسلمانوں میں شدید اضطراب پیدا ہوگیا، جب ایک غیر آباد مسجد یا ایک خانقاہ کی بے حرمتی فرزندانِ توحید کے لئے اتنی ناقابل برداشت ہے تو اگر کوئی بد باطن۔ خدانہ کرے، خدانہ کرے۔ بیت اللہ شریف کی طرف بری نگاہ اٹھانے کی جرأت کرے، یا اس کی حرمت کے خلاف کوئی ذلیل اقدام کرنا چاہے، تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اشتعال اور اضطراب کا کیا عالم ہوگا؟ یہ بات پوری اسلام دشمن دنیا بھی جانتی ہے کہ اس قسم کا کوئی اقدام مسلمانوں کے کس غیظ وغضب کو دعوت دے سکتا ہے، چنانچہ اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کی عداوت میں خواہ کس مقام تک پہنچ جائیں، لیکن ایسے کسی اقدام کی بفضلہٖ تعالیٰ کبھی جرأت نہیں کرسکتیں، وہ جانتی ہیں کہ بیت اللہ شریف کی عظمت وحرمت کا کیا مقام ہے؟ اور اسکے منافی کوئی عمل انہیں کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے؟

بیت اللہ شریف کے اس مقامِ بلند کو ذہن میں رکھئے، اور پھر ایک حدیث کا مطالعہ کیجئے جو میں حدیث کی مشہور کتاب ابن ماجہ سے ترجمے کے ساتھ نقل کر رہا ہوں:

عن عبد الله بن عمرو قال: رأيت رسول الله ﷺ

يطوف بالكعبة ويقول: ما أطيبک وأطيب ريحک! ما أعظمک وأعظم حرمتک! والذی نفس محمد بيده لحرمة المؤمن أعظم عند الله حرمة منک، ماله ودمه.

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے ہیں اور (بیت اللہ سے خطاب کرتے ہوئے) یہ فرما رہے ہیں کہ ''تو کتنا پاکیزہ ہے، اور تیری ہوا کتنی پاکیزہ! تو کتنا عظیم ہے، اور تیری حرمت کتنی عظیم! (مگر) میں اس ذات کی قسم کھاتا ہوں جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! ایک مؤمن کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک یقیناً تیری حرمت سے بھی زیادہ عظیم ہے، اس کا مال بھی اور اسکا خون بھی''

(سنن ابن ماجہ ص: ۲۸۲ ابواب الفتن)

اللہ اکبر! اس روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے اپنے پروردگار کی قسم کھا کر بتایا کہ ایک مؤمن کی جان و مال کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیت اللہ شریف کی حرمت سے بھی زیادہ ہے۔

ایک ایسے ماحول میں جہاں انسانی جان کو مکھی مچھر سے بھی زیادہ بے حقیقت بنالیا گیا ہو، اور جہاں کسی کا مال زبردستی چھین لینے کو شیر مادر سمجھ لیا گیا ہو، اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے بھی دل لرزتا ہے۔ جب انسان انسانیت کے جامے سے باہر نکل آئے تو وہ درندوں اور شیطانوں سے بھی زیادہ سنگدل اور ذلیل ہو جاتا ہے، اور اس کے لئے وعظ و نصیحت کا کوئی انداز کارگر نہیں ہوتا، لیکن خیال آیا کہ بدامنی اور قتل و غارت گری کے اس طوفان میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونگے جن کے دل میں خوف خدا کی کوئی رمق باقی ہو، اور جن کا ضمیر ابھی موت کی نیند نہ سویا ہو، ایسے لوگوں کے لئے بعض اوقات کوئی ایک فقرہ بھی بیداری کا سبب بن جاتا ہے، ایسے لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ کسی ایک مسلمان کی

جان و مال پر حملہ آور ہونا اللہ تعالی کے نزدیک بیت اللہ شریف پر حملہ آور ہونے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے، اور کسی ایک بے گناہ کے خون میں ہاتھ رنگنے کا وبال (معاذ اللہ) بیت اللہ شریف کو منہدم کرنے سے بھی زیادہ ہے، اب اندازہ کیجئے کہ ہمارے ملک اور بالخصوص کراچی میں روزانہ کتنے کعبے ڈھائے جا رہے ہیں؟ اور بابری مسجد کے انہدام پر احتجاج کرنے والے کس بے فکری سے بیت اللہ پر کدالیں چلا رہے ہیں؟ خدا کی پناہ!

اسلامی تعلیمات کی رو سے انسانی جان کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے یقیناً یہی ایک حدیث کافی ہے، لیکن ذرا سا اور آگے بڑھ کر دیکھئے یہ بات تقریباً ہر مسلمان کو معلوم ہوتی ہے کہ جان بچانے کے لئے اسلام نے بڑے سے بڑے گناہ کے ارتکاب کی اجازت دی ہے، اگر جان جانے کا قوی اندیشہ ہو تو شراب اور خنزیر جیسی ناپاک اور حرام چیزوں کا استعمال بھی جان بچانے کی حد تک جائز ہے، بلکہ اگر کوئی شخص کنپٹی پر پستول رکھ کر یہ کہے کہ شراب پیو، ورنہ تمہیں قتل کردونگا، تو ایسی حالت میں جان بچانے کی خاطر شراب پینا صرف جائز ہی نہیں واجب ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص مہلک ہتھیار سے مارڈالنے کی دھمکی دے کر کسی سے کلمۂ کفر کہلوانا چاہے تو ایسی حالت میں زبان سے کفر تک کا کلمہ کہنے کی بھی شریعت نے اجازت دی ہے (بشرطیکہ دل میں ایمان صحیح و سالم ہو)۔ غرض بد سے بدتر گناہ بھی ایسی مجبوری کی حالت میں جائز ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک گناہ ایسا ہے جسے شریعت نے ایسی مجبوری کی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دیا، اور وہ ہے قتل ناحق کا گناہ، یعنی اگر کوئی شخص دوسرے پر پستول تان کر اسے کسی تیسرے شخص کو قتل کرنے پر مجبور کرے، اور یہ کہے کہ تم فلاں شخص کو قتل کرو، ورنہ میں تمہیں قتل کردونگا. تو اس مجبوری کی حالت میں بھی اس کے لئے تیسرے شخص کو قتل کرنا جائز نہیں ہوتا۔ گویا حکم یہ ہے کہ ایسی صورت میں اپنی جان دینی پڑے تو دیدو، لیکن کسی بے گناہ کی جان نہ لو، یعنی جس انتہائی حالت میں شراب پینا جائز، خنزیر کھانا جائز، یہاں تک کہ کلمۂ کفر کہنا بھی جائز

ہو جاتا ہے، قتل ناحق کا گناہ اس حالت میں بھی جائز نہیں ہوتا، اور بقول جگر مرحوم ؎

اس نفع وضرر کی دنیا میں یہ ہم نے لیا ہے درس جنوں
اپنا تو زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں

جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے، اسکا ظلم اور اسکی بربریت ایک فرد کی حد تک محدود نہیں ہوتی، وہ مقتول کے ماں باپ کی پوری زندگی اجیرن بنادیتا ہے، وہ اسکی بیوی کا سہاگ اجاڑ کر اسکے شب وروز ویران کردیتا ہے، وہ اس کے بچوں کو یتیم کر کے انہیں بے کسی کے حوالے کرتا ہے، وہ اس کے عزیزوں دوستوں کے کلیجے پر چھری چلاتا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معاشرے میں فساد کی آگ بھڑکا کر اسے بدامنی کے جہنم میں تبدیل کردیتا ہے، لہٰذا اس کا یہ جرم پورے معاشرے اور پوری انسانیت کے خلاف ایک بغاوت ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے، ایسا ہے جیسے اس نے روئے زمین کے تمام انسانوں کو بیک وقت قتل کر دیا۔

جو لوگ ہاتھ میں ہتھیار آجانے کے بعد اپنے آپ کو دوسروں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھنے لگتے ہیں وہ یہ نہ بھولیں کہ اس دنیا میں ہمیشہ کے لئے کوئی زندہ نہیں رہا، بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسے فرعونوں کی موت اکثر اس بری طرح آئی ہے کہ دنیا نے ان کی عبرتناک حالت کا تماشا دیکھا ہے، ظلم وبربریت کا ہولناک انجام بکثرت دنیا ہی میں دکھادیا جاتا ہے، اور مرنے کے بعد تو قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے ہی کہ

,,جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اسکی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہے، اور اسکی لعنت، اور اللہ نے اسکے لئے زبردست عذاب تیار کر رکھا ہے،، (سورۂ نساء: آیت نمبر: ۹۳)

۱۷/صفر ۱۴۱۶ھ

۱۶/ جولائی ۱۹۹۵ء

فتنے جو پہلے سے بتا دیئے گئے

,,فتنہ،، ایک ایسا لفظ ہے جو ہماری عام بول چال میں دن رات استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کا متعین مفہوم پوچھا جائے تو بہت کم لوگ ہیں جو بتانے کی پوزیشن میں ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ لاتعداد معنوں میں استعمال ہوتا ہے، قرآن وحدیث میں جابجا فتنوں کا ذکر بھی ہے، ان سے بچنے کی تدبیریں بھی بیان ہوئی ہیں، اور اس معاملے میں بہت سی پیشگی خبریں دے کر ان سے امت کو خبردار بھی کیا گیا ہے، حدیث کی تقریباً ہر کتاب میں ایک مستقل باب ''فتنوں'' ہی کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا یہ پہلو آج عام مسلمانوں کی نظر سے اوجھل ہے، اس لئے وہ فتنوں کی دلدل میں پھنستے ہی چلے جارہے ہیں، اور اس سے نکلنے کا راستہ سمجھ میں نہیں آرہا۔ اسلئے خیال آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا یہ پہلو اختصار کے ساتھ سامنے لایا جائے، کیا بعید ہے کہ کچھ سعید روحیں اس سے رہنمائی حاصل کر کے اپنی نجات کا سامان کرلیں۔

''فتنہ'' عربی زبان کا لفظ ہے، اور لغت میں اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ سونے کو آگ پر تپا کر یہ دیکھا جائے کہ وہ کھرا ہے یا کھوٹا؟ چونکہ اس عمل کا مقصد سونے کی آزمائش ہوتا ہے، اس لئے ہر آزمائش کو فتنہ کہدیا جاتا ہے، جب کوئی بدعملی زمانے کا فیشن بن جائے تو وہ بھی ایک فتنہ ہے، کیونکہ یہ انسان کی آزمائش کا موقع ہے کہ وہ فیشن کے آگے ہتھیار ڈالتا ہے یا اسکی حقیقی برائی کا ادراک کر کے اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھتا ہے، جب کوئی

فکری گمراہی نظر فریب دلیلوں کا ملمع چڑھا کر معاشرے میں پھیلتی ہے تو وہ بھی ایک فتنہ ہے، اس لئے کہ اس میں انسان کی بڑی آزمائش ہے کہ آیا وہ ظاہری ملمع سے مرعوب ہوکر حق کو چھوڑ بیٹھتا ہے یا گمراہی کی تہہ تک پہنچ کر اس کا مقابلہ کرتا ہے، جب مسلمانوں میں رنگ ونسل کی بنیاد پر باہم خونریزی شروع ہو جائے تو یہ بھی بڑا زبردست فتنہ ہے، اس میں انسان کی آزمائش یہ ہے کہ وہ اپنی نسل، اپنی زبان بولنے والوں اور اپنے رشتہ داروں کا ساتھ دے، یا حق کو مضبوطی سے تھام کر اپنے صحیح موقف پر ڈٹا رہے، جب مسلمانوں کے کسی بھی دو گروہوں میں اختلاف ہو، لڑائی جھگڑے کی نوبت آجائے، اور معاملہ اتنا پیچیدہ ہو جائے کہ حق اور ناحق کا پتہ چلانا دشوار ہو جائے، تو یہ سب سے بڑا فتنہ ہے جسے بعض احادیث میں ''اندھے بہرے فتنے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں انسان کی آزمائش یہ ہے کہ آیا وہ کسی ایک فریق کا ساتھ دے کر خود بھی اس اندھے بہرے فتنے کا حصہ بن جاتا ہے یا اس فتنے میں پارٹی بنے بغیر اسکے انسداد کی کوشش کرتا ہے، یا کم از کم اس سے اپنا دامن بچا کر وقت گذار دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنے کی ان تمام قسموں کے حالات بہت کھول کھول بیان فرما دیئے ہیں، اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان حالات میں ایک مسلمان کو کیا کرنا چاہئے، ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے فتنوں کی بڑی فکر تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار مسلمانوں کو ان سے خبردار کیا، اور یہاں تک ارشاد فرمایا کہ:

,,میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں فتنے تمہارے گھروں میں اس طرح آآ کر گریں گے جیسے بارش کے قطرے،،

(صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب ۴)

اور واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف فتنوں کے جو عمومی حالات احادیث میں بیان فرمائے ہیں، ان میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ ان کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے

آپ ﷺ آج کے ماحول کو واقعی آنکھوں سے دیکھ کر اسکی تصویر کھینچ رہے ہوں۔ آج ان میں سے چند باتیں مختلف احادیث سے انتخاب اور تلخیص کر کے نقل کر رہا ہوں، ان کو غور سے پڑھئے، اور یہ دیکھئے کہ یہ ہمارے گردوپیش کی تصویر ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فتنوں کے زمانے کے بارے میں بتایا ہے کہ :

„زمانہ جلدی جلدی گذرے گا"

(یعنی بڑے بڑے انقلابات تیزی سے آئیں گے)

"نیک عمل کی کمی ہو جائیگی،،

„دین سے ناواقفیت پھیل جائیگی، اور دین کا (حقیقی) علم اٹھ جائیگا،،

„بخل اور پیسے کی محبت عام ہو گی،،

„قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گا،،

(بخاری، فتن، باب ۵)

„خود قاتل کو معلوم نہیں ہو گا کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے؟ نہ مقتول کو پتہ ہو گا کہ اسے کیوں قتل کیا گیا؟،،

(صحیح مسلم، حدیث : ۲۹۰۸)

„شراب کو شربت کہکر حلال کہا جائیگا، سود کو تجارت کہکر حلال کہا جائیگا، رشوت کو ہدیہ کہکر حلال کیا جائیگا، زکوۃ کو تجارت بنا لیا جائیگا،، (کنز العمال ۱۴: ۲۲۶)

„اولاد (کی خواہش کے بجائے اس) سے کراہیت ہو گی، اور بارش سے ٹھنڈک کے بجائے گرمی کی سی تکلیف ہو گی، اور بدکار سیلاب کی طرح پھیل جائیں گے،،

„جھوٹے کو سچا کہا جائیگا، اور سچے کو جھوٹا،،

,,خائن کو امانت دار اور امانت دار کو خائن بتایا جائیگا،،

,,غیروں سے رشتہ جوڑا جائیگا، اور اپنوں سے توڑا جائیگا،،

,,ہر قبیلے اور گروہ کی سربراہی اسکے منافقوں کے ہاتھ میں ہو گی، اور ہر بازار کی سربراہی اس کے بدکاروں کے ہاتھ میں،،

,,جو شخص صحیح معنی میں مومن ہو گا وہ معاشرے میں چھوٹی چھوٹی بکریوں سے زیادہ بے وقعت سمجھا جائے گا،،

,,مسجد کی محرابیں زرکاری سے مزین ہو نگی، لیکن دل ویران ہو نگے،،

,,مرد مردوں سے جنسی خواہش پوری کریں گے، اور عورتیں عورتوں سے،،

,,مسجدوں کے احاطے بڑے بڑے اور منبر اونچے اونچے ہو نگے،،

,,دنیا کے ویران علاقے آباد ہو جائیں گے اور آباد علاقے ویران،،

,,گانے بجانے کا دور دورہ ہو گا، اور شرابیں پی جائیں گی،،

,,پولیس والوں کی کثرت ہو گی،،

,,عیب چینی کرنے والوں، چغلی کھانے والوں اور طعنہ بازوں کی بہتات ہو گی،،

(کنز العمال ۱۴: ۲۲۴)

,,لوگ نمازوں کو ضائع کریں گے اور امانتیں برباد ہوں گی،،

,,سود خوری عام ہو گی، اور جھوٹ کو حلال قرار دیدیا جائیگا،،

,,لوگ انسان کی جان کی کوئی وقعت نہ سمجھیں گے، اور اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے،،

„دین کو دنیا کے بدلے فروخت کریں گے،،

„انصاف کمزور ہو جائے گا، اور ظلم کا دور دورہ ہو گا،،

„طلاقوں کی کثرت ہو گی، اور ناگہانی اموات بڑھ جائیں گی،،

„لوگ ایک دوسرے پر جھوٹی تہمتیں بہت لگائیں گے،،

„کمینے لوگ سیلاب کی طرح امڈ پڑیں گے، اور شریف لوگ سمٹ جائیں گے،،

„امیر اور وزیر جھوٹے ہونگے، امانت رکھنے والے خائن ہونگے، قومی نمائندے ظالم ہونگے، اور قرآن کے قاری بدکار ہوں گے،،

„لوگ جانوروں کی کھالوں کا لباس پہنیں گے، اور ان کے دل مردار سے زیادہ بدبودار ہوں گے،،

„امن کم ہو جائے گا،،

„قرآن شریف کے نسخوں کو آراستہ کیا جائیگا، مسجدیں خوبصورت بنائی جائیں گی، ان کے منارے اونچے اونچے ہونگے، مگر دل ویران ہونگے،،

„قرآنی حدود معطل ہونگی،،

„ماں اپنی مالکہ کو جنیں گی،، (یعنی بیٹی ماں کے ساتھ ایسا سلوک کریگی جیسے مالکہ اپنی کنیز کے ساتھ کرتی ہے)

„جو لوگ ننگے پاؤں ننگے بدن پھرتے تھے وہ حکومتوں کے سربراہ بن جائیں گے،،

„عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ تجارت میں شریک ہوں گی،،

„مرد عورتوں کی شباہت اختیار کریں گے، اور عورتیں مردوں کی نقالی کریں گی،،

,,اللہ کے بجائے دوسری چیزوں کی قسمیں کھائی جائیں گی،،

,,مسلمان بھی بغیر کہے (جھوٹی) گواہی دیگا،،

,,دین کا علم اللہ کی خوشنودی کے بجائے کسی اور مقصد سے پڑھا جائے گا،،

,,آخرت کے کاموں سے بھی دنیا مقصود ہوگی،،

,,مالِ غنیمت (قومی خزانے) کو ذاتی سرمایہ تصور کرلیا جائیگا، اور امانت کو لوٹ کا مال سمجھا جائے گا، اور زکوۃ کو جرمانہ قرار دے لیا جائیگا،،

,,قوم کا لیڈر ان کا ذلیل ترین فرد ہوگا،،

,,انسان اپنے باپ کی نافرمانی کرے گا، ماں کے ساتھ سنگدلی کا برتاؤ کرے گا، دوست کو نقصان پہنچائیگا، اور بیوی کی فرماں برداری کرے گا،،

,,مسجدوں میں بدکاروں کی آوازیں بلند ہوں گی،،

,,گانے والی عورتیں داشتہ بنا کر رکھی جائیں گی،،

,,گانے بجانے کے آلات سنبھال سنبھال کر رکھے جائیں گے،،

,,راستوں میں شراب نوشی ہوگی،،

,,ظلم پر فخر کیا جائے گا،،

,,عدالتی فیصلوں کی خرید وفروخت ہوگی،،

,,قرآن کو موسیقی سمجھ لیا جائے گا،،

,,آخر زمانے کے لوگ اپنی امت کے پہلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے،،

(الدر المنثور ۶:۵۲)

,,قلم (یعنی قلم سے لکھی ہوئی تحریریں) پھیل جائے گا، اور حق بات چھپائی جائیگی،،

,,لوگ مسجد کے اندر آئیں گے، مگر دو رکعت پڑھنے کی توفیق نہ ہوگی،،

,,ایک چھوٹا سا بچہ بوڑھے کو صرف اسکے غریب ہونے کی وجہ سے لتاڑیگا،،

,,ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ملاقات کا آغاز ہی (سلام کے بجائے) گالی اور لعنت سے کریں گے،،

,,لوگ ٹھاٹ سے شاندار زین پوشوں پر بیٹھ کر مسجد کے دروازوں پر اتریں گے، اور انکی عورتیں لباس پہننے کے باوجود برہنہ ہوں گی، انکے سروں پر دبلے اونٹ کے کوہان کی طرح کے بال ہوں گے،،

(الدرالمنثور،۶:۵۵)

,,دین کو الٹ دیا جائے گا، یعنی حرام چیزوں کے نام بدل بدل کر انہیں حلال قرار دیا جائے گا،، (مشکوٰۃ ص:۴۶۰)

,,یہودیوں اور نصرانیوں کی پوری پوری نقالی کی جائی گی،،

(مشکوٰۃ ص ۴۵۸)

,,امانت داروں کا فقدان ہوگا، یہاں تک کہ یوں کہا جائے گا کہ فلاں مقام پر ایک امانت دار شخص رہتا ہے،،

,,ایک ایسے شخص کی عقلمندی، زندہ دلی اور بہادری کی تعریف کی جائے گی جس کے دل میں رائی برابر ایمان نہ ہوگا،،

(بخاری ۲:۱۰۵۰)

"معمولی نا اہل آدمی جمہور کے اہم معاملات میں رائے زنی کریں گے"۔ (کنز العمال ۱۴: ۲۱۶)

یہ چند مثالیں ہیں ان پیشگی خبروں کی جو آنحضرت ﷺ نے فتنوں کے دور کے بارے میں چودہ سو سال پہلے بیان فرمائی ہیں، اور صدیوں سے احادیث کی کتابوں میں لکھی چلی آرہی ہیں، میں نے یہ باتیں حدیث کی صرف چند کتابوں سے اس وقت سرسری طور پر جمع کی ہیں، ورنہ اس قسم کی احادیث کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، (برادر مکرم جناب مولانا محمد یوسف لدھیانوی نے اس موضوع پر ایک بصیرت افروز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "عصر حاضر حدیث نبوی کے آئینے میں"، اس میں انہوں نے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس قسم کی احادیث جمع فرمائی ہیں، اور آج کے دور میں یہ کتاب ہر مسلمان کی نظر سے گذرنی چاہئے) لیکن جو مثالیں میں نے سرسری طور پر ذکر کی ہیں، صرف انہی کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کیا کچھ بتا کر تشریف لے گئے ہیں؟ اور چودہ سو سال پہلے ارشاد فرمائے ہوئے الفاظ آج کس قدر حیرت انگیز طور پر موجودہ حالات کی تصویر کھینچ رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے یہ باتیں وحی الٰہی کی روشنی میں بیان فرمائی ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بذریعہ وحی آنے والے ان فتنوں کا علم عطا فرمایا تو یقیناً یہ بھی بتایا ہوگا کہ ان فتنوں کے درمیان رہنے والوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے؟ چنانچہ جہاں آپ ﷺ نے ان فتنوں سے خبردار کیا ہے، وہاں ایک مسلمان کے لئے وہ راہ عمل بھی بتائی ہے جو ایسے مواقع پر اختیار کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں ارشاداتِ نبوی ﷺ سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ میرے اس مضمون کا دوسرا حصہ ہے، جو انشاء اللہ آئندہ عرض کرونگا۔

۲۳/ صفر ۱۴۱۶ھ
۲۲/ جولائی ۱۹۹۵ء

فتنے کے دَور میں

میں نے پچھلے مضمون میں ,,فتنوں،، پر بات شروع کی تھی، اور فتنوں کی مختلف قسمیں ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے کس کس طرح خبردار کیا ہے، اور کس کس طرح کے حالات پیش آنے کی پہلے سے خبر دی ہے۔ ان بہت سی احادیث کی ایک تلخیص بھی پیش کی گئی تھی جنہیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی دوررس نگاہوں سے ہمارے موجودہ دور کے ماحول کو باقاعدہ دیکھ کر یہ باتیں ارشاد فرما رہے ہیں۔

انہی میں سے ایک حدیث آج یاد آ گئی جسے اگر کوئی شخص آج سے پچیس تیس سال پہلے پڑھتا تو اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب پوری طرح سمجھ میں نہ آتا، لیکن آج اس کی سچائی کو کھلی آنکھوں دیکھا جا سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,إذا رأيت مكة قد بعجت كظائم وساوى بناؤها رؤوس الجبال فاعلم أن الأمر قد أظلك، فخذ حذرك،،

(غریب الحدیث ۱: ۲۶۹، لسان العرب ۲: ۲۱۴، اخبار مکہ ازرقی ۱: ۸۲)

جب تم دیکھو کہ مکہ مکرمہ کا پیٹ چیر کر نہروں جیسی چیزیں بنادی گئی ہیں اور مکہ کی عمارتیں پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر اونچی ہوگئی ہیں تو سمجھ لو

کہ معاملہ تمہارے سر پر آگیا ہے، اس لئے سنبھل کر رہو۔

یہ حدیث صدیوں سے حدیث کی کتابوں میں نقل ہوتی آرہی ہے، لیکن اسکو پڑھنے والے یہ بات پوری طرح سمجھ نہیں سکتے تھے کہ مکہ مکرمہ کا پیٹ چیرنے کا کیا مطلب ہے؟ اور اسکا پیٹ چیر کر "نہروں جیسی چیزیں" کیسے بنادی جائیں گی؟ لیکن آج جس شخص کو بھی مکہ مکرمہ کی زیارت کا موقع ملا ہے، وہ دیکھ سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں واقع کتنے پہاڑوں اور چٹانوں کے پیٹ چیر کر زمین دوز راستے اور سرنگیں بنادی گئی ہیں، آج مکہ مکرمہ کے شہر میں ان سرنگوں کا کیسا جال بچھا ہوا نظر آتا ہے، اور ان میں نہروں کی طرح شفاف سڑکوں پر کس طرح ٹریفک رواں دواں ہے۔ اس کے علاوہ مکہ مکرمہ کی عمارتیں نہ صرف پہاڑ کی چوٹیوں کے برابر ہوگئی ہیں، بلکہ بعض جگہ ان سے بھی اونچی چلی گئی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بات ایک ایسے ماحول میں ارشاد فرمائی تھی جب نہ زمین دوز راستوں کا کوئی تصور تھا، نہ یہ سوچا جاسکتا تھا کہ انسان کی بنائی ہوئی عمارتیں پہاڑ کی چوٹیوں کے برابر بلند ہوسکتی ہیں، اس ماحول میں اتنے وثوق کے ساتھ یہ ناقابل تصور بات یقیناً وہ سچا پیغمبر ﷺ ہی کہہ سکتا ہے جس کی قوت بینائی زمان و مکان کی قیود سے ماوراء ہوتی ہے، صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم۔

آنحضرت ﷺ نے جہاں فتنوں کے زمانے کے حالات کی پیشگی خبر دی، وہاں مختلف قسم کے فتنوں کے برے اثرات سے بچنے کے لئے وہ بنیادی نکات بھی بیان فرمادیئے کہ اگر کوئی شخص ان کی پابندی کرلے تو کم از کم وہ اپنے آپ کو ان برے اثرات سے بچا سکتا ہے، اور اگر ان پر عمل کرنے والوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی جائے تو یہی نکتے ان فتنوں کا اجتماعی علاج بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔

بعض احادیث سے یہ اشارے ملتے ہیں کہ مسلمانوں میں قتل و غارت گری اور باہمی خونریزی کا فتنہ درحقیقت بدعملی اور گمراہی کے فتنے کا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی جب مسلمانوں

میں وہ بدعملی پھیلتی ہے جس کی کچھ تفصیل پچھلے مضمون میں احادیث کے حوالے سے بیان ہوئی تھی تو اسکا نتیجہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور نااتفاقی کی صورت میں نکلتا ہے، اسکو ان برے اعمال کا ذاتی اثر کہہ لیجئے، یا بداعمالیوں پر اللہ تعالی کی طرف سے تازیانہ، لیکن ہوتا یہی ہے کہ جب مسلمان اپنے فکر وعمل میں قرآن وسنت کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹتے ہیں تو وہ آپس کی لڑائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، مسلمانوں کی پوری تاریخ اس صورت حال کی گواہی دیتی ہے۔

جب مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی کا فتنہ کھڑا ہو، تو آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلی ہدایت یہ عطا فرمائی کہ اگر مسلمانوں کا کوئی مسلّم سربراہ موجود ہو، اس کا برحق ہونا واضح ہو، اور دوسرا فریق اس کے خلاف واضح بغاوت کر رہا ہو تو تم اس سربراہ کا ساتھ دو، اور باغی کے فتنے کو فرو کرونے کی کوشش کرو، لیکن اگر کوئی مسلّم سربراہ موجود نہ ہو، یا اس کا برحق ہونا واضح نہ ہو، اور جو فریق آپس میں لڑ رہے ہیں، ان کے بارے میں یہ طے کرنا مشکل ہو کہ کون حق پر ہے، اور کون باطل پر؟ تو ایسی صورت میں تم ہر فریق سے کنارہ کشی اختیار کر کے سب سے الگ تھلک ہو جاؤ، اور کسی فریق کا ساتھ نہ دو، بخاری اور مسلم کی ایک صحیح حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

,,دعاة على أبواب جهنم، من أجابهم إليها قذفوه فيها، فقلت يا رسول الله! صفهم لنا، قال: نعم من جلدتنا ويتكلمون بألسنتنا، فقلت: يا رسول الله فماترى؟، وفي رواية، فما تأمرني إن أدركني ذلك، قال: تلزم جماعة المسلمين وإمامهم، قلت: فإن لم يكن لهم جماعة ولا إمام؟ قال: فاعتزل تلك الفرق كلها،، (جامع الاصول،۱۰:۴۵)

,,کچھ لوگ ایسے ہونگے جو جہنم کے دروازوں کی طرف دعوت دیں گے (یعنی ان کی دعوت ایسی گمراہی پر مشتمل ہوگی جو جہنم کی طرف لے جانے والی ہے) جو شخص انکی دعوت کو قبول کرے گا، وہ اسے جہنم میں پھینک دینگے، (حدیث کے راوی کہتے ہیں) میں نے کہا یا رسول اللہ! اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کی اکثریت اور ان کے امام (سربراہ) کے ساتھ وابستہ رہنا'' میں نے عرض کیا، ''اگر مسلمانوں کی نہ کوئی اکثریتی جماعت ہو، نہ امام (یعنی برحق سربراہ) تو پھر میں کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ'' پھر ایسے میں ان تمام فرقوں ر پارٹیوں رگروہوں سے مکمل علیحدگی اختیار کرلینا،،

اسی قسم کی صورتِ حال کو بعض احادیث میں ,,اندھے بہرے فتنے،، سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس میں بھی خاص طور پر جہاں باہمی خونریزی کی بنیاد نسلی یا لسانی عصبیت ہو، اس کی آنحضرت ﷺ نے انتہائی سخت الفاظ میں مذمت فرمائی ہے،ایک حدیث میں فرمایا:

,,جو شخص کسی اندھے جھنڈے کے نیچے اس حالت میں مارا گیا کہ وہ عصبیت کی دعوت دے رہا ہو یا عصبیت کی مدد کر رہا ہو تو اسکی موت جاہلیت کی موت ہے،،

(صحیح مسلم حدیث: ۱۸۵۰)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,جو عصبیت کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں، جو عصبیت کی خاطر لڑے، وہ ہم میں سے نہیں، جو عصبیت کی حالت میں مرے وہ ہم میں سے نہیں،،

(ابوداود، حدیث: ۵۱۲۱)

آپ ﷺ نے اس عصبیت کا صحیح مطلب بھی صاف صاف بیان فرمایا جس کی مذمت فرمائی ہے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! عصبیت کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

,,عصبیت یہ ہے کہ تم ناحق کام میں اپنی قوم کی مدد کرو،،

(ابو داؤد، حدیث ۵۱۱۹)

ایک مرتبہ ایک مہاجر اور ایک انصاری کے درمیان ہاتھا پائی ہوگئی، مہاجر نے مدد کی لئے مہاجرین کو پکارا، اور انصاری نے انصار کی دہائی دی۔ آنحضرت ﷺ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

,,یہ زمانۂ جاہلیت جیسے نعرے کیوں لگاتے ہو؟ لوگوں نے جھگڑے کا سبب بتایا، کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو لات ماردی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا ان عصبیت کے نعروں کو چھوڑ دو، یہ بدبودار ہیں،،

(صحیح بخاری، حدیث: ۴۹۰۵ تفسیر سورۃ المنافقون)

اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ,,ہر شخص کو اپنے بھائی کی مدد کرنی چاہئے اگر وہ ظالم ہو تو اسے ظلم سے روک کر اور اگر مظلوم ہو تو اس سے ظلم دور کرکے،، (فتح الباری، ۸:۶۴۹) مطلب یہ تھا کہ جہاں ظلم ہو رہا ہو وہاں ظلم دور کرنے کی کوشش اور اس کے لئے لوگوں کو دعوت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اسے ایک نسلی اور گروہی نعرہ بنا کر عصبیت کی راہ ہموار کرنا قابلِ مذمت ہے، اور جو ذہنیت اسے عصبیت کا رنگ دیتی ہے وہ بدبودار ذہنیت ہے۔

اس طرح آنحضرت ﷺ نے واضح فرمایا کہ ظلم یا انصاف کسی خاص قوم، نسل یا گروہ کی خصوصیت نہیں ہوتی، ہر قوم یا نسل میں ظالم بھی ہوتے ہیں، مظلوم بھی، منصف مزاج بھی ہوتے ہیں اور ہٹ دھرم بھی، برحق بھی ہوتے ہیں اور ناحق بھی۔ آواز ظلم کے خلاف اٹھاؤ، کسی خاص قوم یا نسل کے خلاف نہیں، مدد مظلوم کی کرو، کسی خاص نسل یا قوم

کے نام سے نہیں، بلکہ اس کی مظلومیت کے عنوان سے۔ ظالم خواہ اپنی نسل کا ہو اسکے ظلم کی مذمت کرکے ظلم کو روکو، اور مظلوم خواہ دوسری نسل کا ہو، اسکی مدد کرو، لیکن جہاں حق وناحق اور ظلم وانصاف سے قطع نظر محض رنگ ونسل کی بنیاد پر نعرے لگائے جارہے ہوں، عصبیت کا اندھا جھنڈا اٹھا لیا گیا ہو، اور کسی بھی طرف حق واضح نہ ہو وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف ہدایت یہ دی ہے کہ تمام فریقوں سے کنارہ کشی اختیار کرو، یعنی نہ صرف یہ کہ کسی فریق کا ساتھ نہ دو، بلکہ گوشہ نشینی اختیار کرلو، متعدد احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایات بڑی تاکید کے ساتھ دی ہیں، اور مندرجہ ذیل الفاظ استعمال فرمائے ہیں:

"اپنے گھروں کی ٹاٹ بن جاؤ" (یعنی بلا ضرورت گھر سے ہی نہ نکلو)

"اپنی کمانیں توڑ دو، تانتیں کاٹ دو، اور گھر میں بیٹھ جاؤ"

"اپنی زبان اور ہاتھ دونوں کو سنبھال کر رکھو"

ایسے فتنے میں بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا، کھڑا شخص چلتے ہوئے سے بہتر ہوگا، اور چلتا ہوا شخص بھاگتے ہوئے سے بہتر ہوگا، جو شخص ایسے فتنے کو (محض تماشے کیلئے) جھانک کر بھی دیکھنا چاہے گا فتنہ اسے اچک کرلے جائیگا۔

(جامع الاصول ۱۰:۹ تا ۱۳)

"قتل وغارت گری کے اس دور میں (فتنے سے علیحدہ رہ کر) عبادت میں مشغول ہوجانے کا ثواب ایسا ہے جیسے کوئی شخص (دار الکفر سے) ہجرت کرکے مجھ سے آملے" (صحیح مسلم، ۲:۴۰۶)

۳۰/صفر ۱۴۱۶ھ

۲۹/ جولائی ۱۹۹۵ء

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

(۱)

ہماری روز مرہ کی بول چال میں انگریزی الفاظ، بلکہ پورے پورے جملوں کا استعمال جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، وہ ایک ایسا لمحۂ فکریہ بن چکا ہے کہ اگر اس پر ابھی سے توجہ نہ دی گئی تو ہماری زبان، اور اسکے پس منظر میں ہماری ثقافت اور ہمارے دینی، علمی اور ادبی سرمائے کا نہ جانے کیا حشر بنے گا؟ میں جب اپنے بھائیوں کو عام گفتگو میں انگریزی الفاظ کا بے محابا استعمال کرتے اور اپنی زبان کو اردو انگریزی کا ایک مضحکہ خیز ملغوبہ بناتے دیکھتا ہوں تو واقعۃً یہ تشویش لاحق ہوتی ہے کہ ہم اپنی زبان کو تباہی کے کس غار کی طرف لے جا رہے ہیں؟

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، اسلام آباد کے ایک سفر کے دوران جہاز میں میری سیٹ کے قریب دو اعلیٰ سرکاری افسر سفر کر رہے تھے، ان میں سے ایک صاحب پہلے سے سیٹ پر بیٹھے تھے، دوسرے صاحب انکے برابر کی سیٹ کا بورڈنگ کارڈ لئے ہوئے قریب آئے، اور پہلے صاحب کو اپنی سیٹ کے برابر میں بیٹھا دیکھا تو بہت خوش ہوئے، اور انکے پاس بیٹھتے ہوئے ان سے گفتگو شروع کردی۔ دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ کچھ اس قسم کی تھی:

,,اوہو، مسٹر...... السلام علیکم، وہاٹ اے پلیزنٹ سرپرائز! کیا حال چال ہیں؟ ہاؤ آر یو؟،،

,,فائن، تھینکس ! دیکھو، قسمت اس کو کہتے ہیں، مجھے کل اسلام آباد جانا تھا، بٹ آئی ہیڈ ٹو کینسل مائی سیٹ فارسم ریزنس۔ آج تمہاری کمپنی انجوائے کرنا مقدر میں تھا، وہاٹ اے لک؟،،

,,اسلام آباد کیسے جارہے ہو؟،،

,,آئی ہیو بین اپائنٹڈ ایز......،،(I have been appointed as)

,,ریلی (Really)؟،،

,,یس یس، بس اللہ کی مہربانی ہے،،

,,کانگریچولیشنز! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے،،

,,سوکائنڈ آف یو، لیکن نیا نیا معاملہ ہے، اس لئے کچھ فکر بھی ہے،،

,,ڈونٹ وری اباوٹ دیٹ، ماشاء اللہ تم بڑے انٹیلی جنٹ آدمی ہو، اینڈ آئی تھنک کہ تمہارا سلیکشن بہت مناسب ہے، اٹ از گوئنگ ٹو بی آل رائٹ،،

یہ اس گفتگو کے چند ابتدائی جملے تھے، پھر سارے راستے اسی اسلوب میں گفتگو جاری رہی جس میں کم از کم پچھتر فی صد الفاظ انگریزی کے تھے، اور پچیس فی صد اردو کے، ان صاحبان کی گفتگو کا حوالہ تو میں نے محض نمونے کے طور پر دیدیا، ورنہ ہمارے تعلیم یافتہ حلقوں میں بیشتر جگہوں پر اب بات چیت اسی انداز کی ہوتی ہے، پہلے اصل گفتگو اردو یا کسی اور مقامی زبان میں ہوتی تھی، اور بیچ بیچ میں انگریزی الفاظ یا فقرے آجایا کرتے تھے، اب معاملہ الٹ ہوگیا ہے، اب اکثریت انگریزی الفاظ اور فقروں کی ہوتی ہے، البتہ بیچ بیچ میں کہیں کہیں اردو، پنجابی یا کسی اور دیسی زبان کے فقرے فٹ کردیئے جاتے ہیں، بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ ایک ہی فقرے کا کچھ حصہ انگریزی میں اور کچھ حصہ اپنی زبان میں ہوتا ہے۔

چونکہ اونچے تعلیم یافتہ حلقوں میں اس قسم کی ملی جلی زبان کا استعمال اب ایک فیشن بن گیا ہے، اس لئے جو لوگ اپنی تعلیم یا عہدہ ومنصب کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں ہیں

وہ بھی اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا اظہار کرنے کے لئے اپنی بساط کی حد تک انگریزی کے استعمال کی باقاعدہ کوشش کرتے ہیں، اور نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص جتنے انگریزی الفاظ بول سکتا ہے، انکے بولنے میں کسر نہیں چھوڑتا، یہاں تک کہ غلط اور بے محل الفاظ بولنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

انگریزی بلاشبہ اس وقت بین الاقوامی زبان ہے، اور دنیا کے مختلف باشندوں کے درمیان رابطے کا واحد مشترک ذریعہ بھی، اس کے علاوہ اس زبان کے پاس جدید علوم وفنون کا بڑا ذخیرہ بھی ہے، اس لئے اسکو زبان کی حیثیت سے سیکھنا آج کی دنیا میں ناگزیر جیسا ہوگیا ہے، اور اگر اس غرض سے ہمارے یہاں انگریزی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، تو اس میں ہرگز کوئی عیب کی بات نہیں، لیکن کسی زبان کو ضرورۃً سیکھنا اور بات ہے، اور اس زبان کا غلام بن کر اپنی زبان کو اس کے آگے ذبح کر ڈالنا دوسری چیز، ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جس کام کے لئے واقعۃً انگریزی سیکھنا ضروری ہے اس میدان میں تو ہماری انگریزی دانی کا معیار روز بروز گر رہا ہے، انگریزی کی جو صلاحیت پہلے صرف میٹرک پاس لوگوں میں ہوا کرتی تھی، اب گریجویٹس تو کیا؟ بعض اوقات ماسٹر کی ڈگری رکھنے والوں میں بھی نہیں ہوتی، جدید درسگاہوں کے بہت سے فارغ التحصیل افراد کا حال یہ ہے کہ وہ ایک صفحہ بھی صحیح انگریزی میں نہیں لکھ سکتے، نہ کوئی انگریزی کتاب پڑھکر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن روز مرّہ کی بول چال میں انگریزی کا جا وبیجا استعمال ہے کہ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور اسے معیارِ فضیلت سمجھا جا رہا ہے۔

اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری دیسی زبانیں بیچارگی کا شکار ہیں، لوگ اپنی ا ری زبان کو بہتر بنانے کے بجائے اس کوشش میں ہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ داخل کر کے اپنا علمی قد اونچا کریں، اس کوشش سے انگریزی کی صلاحیت میں تو کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہو رہا، لیکن مادری زبان سے ناواقفیت اس درجہ عام ہوگئی ہے کہ خدا

کی پناہ! لوگوں کو اس بات تک کا احساس نہیں رہا کہ ,,تشریف لانا،، کب بولا جاتا ہے؟ اور ,,حاضر ہونا،، کب؟ چنانچہ اس قسم کے فقرے عام طور سے سننے میں آتے ہیں کہ ,,میں آپ کے پاس تشریف لایا تھا،، اور ,,آپ میرے پاس حاضر ہوے تھے،، اسی طرح ,,عرض کرنے،، اور ,,فرمانے،، کے محل استعمال میں بھی اسی قسم کی الٹ پلٹ روز مرّہ کا معمول ہے، ,,آپ نے عرض کیا تھا،، اور میں نے فرمایا تھا،، جیسے جملے بعض اوقات اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں سے بھی سننے میں آجاتے ہیں۔

میرے ایک دوست، جو ایک اعلی سرکاری افسر ہیں، سنا رہے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے دفتر کے ایک ساتھی سے کہا کہ ,,کل میں ایک تقریب میں شرکت کیلئے چلا گیا تھا،، یہ جملہ سنکر میرے ساتھی نے اعتراض کیا کہ ,,تم عربی بہت بولنے لگے ہو،، میں نے کہا ,,معاف کیجئے، میرا مطلب یہ تھا کہ میں ایک فنکشن اٹینڈ کرنے کے لئے گیا تھا،، انہوں نے فرمایا ,,ہاں، اب تم نے اردو میں بات کی،،

اندازہ کیجئے کہ جس ماحول میں ,,تقریب،، اور ,,شرکت،، جیسے الفاظ استعمال کرنے کو عربی بولنے سے تعبیر کیا جارہا ہو، وہاں دوسرے علمی اور ادبی الفاظ کو خدا جانے کیا سمجھا جاتا ہوگا؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری دینی، علمی، ادبی اور صحافتی زبان کا تقریبًا دوتہائی حصہ، نہ صرف عام لوگوں کیلئے، بلکہ ان اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کیلئے بھی اجنبی بن چکا ہے، جنکی تربیت انگریزی کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ عہد حاضر کے مشہور مورخ ٹائن بی نے اپنی کتاب ,,مطالعہ تہذیب،، میں لکھا تھا کہ پہلے زمانے میں کئی باشاہوں نے اپنے مخالفوں کا ملک فتح کرنے کے بعد ان کے کتب خانے جلائے تھے، (مثلاً اندلس میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان علمی خزانوں کو نذرِ آتش کیا تھا) مقصد یہ تھا کہ اس قوم کا رابطہ اپنے ماضی سے کٹ جائے، لیکن مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں ایک ایسا آسان راستہ اختیار کیا کہ کتب خانے جلانے کی بدنامی بھی اٹھانی نہیں

پڑی، وہ آسان راستہ یہ تھا کہ اس نے ترکی قوم کا رسم الخط بدل دیا، اب کتب خانے تو جوں کے توں محفوظ رہے، لیکن اگلے وقتوں کے چند بوڑھوں کے سوا ان سے استفادہ کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ کمال اتاترک کے راستے سے بھی زیادہ آسان راستہ اختیار کیا جارہا ہے، ہمارے کتب خانے بھی جوں کے توں محفوظ ہیں رسم الخط بھی وہی کا وہی ہے، لیکن عربی اور فارسی تو کجا، خود اردو زبان کو بھی ہمارے لئے ایسا اجنبی بنایا جارہا ہے کہ اسکے علمی اور ادبی الفاظ ہمارے لئے اچنبھے بن کر رہ جائیں، اور ہم اپنے دینی، علمی اور ادبی ذخیروں سے استفادے کے قابل نہ رہیں، چنانچہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے صرف عام لوگ ہی نہیں بلکہ بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی، جو انگریزی اردو کی ملی جلی زبان کے عادی بن گئے ہیں، اردو کی علمی کتابوں کے مطالعے میں سخت مشکل محسوس کرتے ہیں، وہ اردو کی ادبی عبارتوں سے لطف نہیں لے سکتے، غالب، ذوق اور انیس کو تو چھوڑیئے، وہ اقبال مرحوم تک کے اشعار ٹھیک ٹھیک سمجھنے پر قادر نہیں، نہ ان اشعار میں پوشیدہ افکار، تلمیحات اور مضامین کا صحیح ادراک کرسکتے ہیں۔

اسی وجہ سے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ عام بول چال میں انگریزی کا بے تحاشا استعمال اب ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ بن چکا ہے جس پر ملک وملت کے اہلِ فکر کو پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے، پہلے یہ استعمال صرف بول چال کی حد تک محدود تھا، لیکن اب رفتہ رفتہ ہماری تحریروں میں بھی تیزی سے داخل ہو رہا ہے، اور اب ایسی تحریروں میں اضافہ ہو رہا ہے جو انگریزی الفاظ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

ہمارے اہلِ فکر، اہلِ دانش اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس صورتِ حال کا پوری بیدار مغزی سے جائزہ لینا چاہئے، جب تک وہ خود اپنے عمل سے انگریزی کی اس غلامی

سے آزادی کی کوشش نہیں کریں گے یہ تشویشناک رجحان بڑھتا چلا جائے گا، اور ہم ایک ایسی قوم بن کر رہ جائیں گے جس کی اپنی کوئی زبان نہیں، بیشک انگریزی کے کچھ الفاظ ایسے ہیں جنہیں اردو زبان نے اپنے مزاج کے مطابق قبول کر کے انہیں اپنے اندر سمولیا ہے، ایسے الفاظ کے استعمال سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، مختلف زبانوں میں الفاظ کا یہ تبادلہ ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان مقامات پر بھی انگریزی الفاظ اور جملے استعمال کریں، جہاں مطلب اردو یا اپنی کسی دوسری مقامی زبان میں آسانی سے ادا ہو سکتا ہو، یا وہ الفاظ استعمال کریں جو زبان میں جذب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تعلیمی اغراض کیلئے انگریزی دنیا کے بیشتر ملکوں میں پڑھائی جارہی ہے، لیکن جو دیوانگی ہم نے اختیار کی ہے، وہ شاید کہیں اور اختیار نہیں کی گئی۔ برطانیہ کے سوا یورپ کے کسی ملک میں انگریزی نہیں بولی جاتی، وہ انگریزی جاننے کے باوجود انگریزی نہیں بولتے، بلکہ بعض مرتبہ بد اخلاقی کی حد تک غیر ملکیوں کے سامنے اپنی زبان بولے چلے جاتے ہیں، خاص طور پر فرانس میں مجھے اسکا تجربہ ہوا، اور اسکی وجہ سے خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ انگریزی وہ بھی پڑھاتے ہیں، مگر انہوں نے اسے اپنے اوپر سوار ہونے نہیں دیا۔

چونکہ جا و بیجا انگریزی بولنے کی عادت پڑ چکی ہے، اور انگریزی تعبیرات زبان پر چڑھ چکی ہیں، اس لئے شاید شروع شروع میں اس طریقے کو چھوڑنے میں کچھ دشواری ہوگی، لیکن یہ یاد رکھیئے کہ اس ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل پر اصرار اپنی نسلوں کو مادری زبان اور اسمیں موجود شاندار علمی اور ادبی سرمائے سے سراسر محروم کرنے کے مترادف ہوگا۔ زبان صرف ایک اتفاقی ذریعۂ اظہار نہیں ہے، بلکہ یہ کسی عقیدہ وفکر اور تہذیب وثقافت کے ساتھ رشتہ جوڑنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے، لہٰذا اپنی زبان سے دست برداری کا مطلب اپنے پورے ماضی سے، اپنے عقیدے اور اپنی فکر سے، اور اپنی تہذیب

اور ثقافت سے منہ موڑنا ہے، اگر ہمیں اپنی نسلوں کو اس ہولناک اقدام سے بچانا ہے تو ہمیں اپنی یہ عادت بدلنی ہوگی۔

۶ ؍ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
۳/ ستمبر ۱۹۹۵ء

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

(۲)

میں نے پچھلے مضمون میں عام بول چال میں انگریزی کے بے تحاشا استعمال کی طرف توجہ دلائی تھی، آج اسی مسئلے کا ایک اور پہلو پیش خدمت ہے، ہمارے موجودہ دستور کی دفعہ ۲۵۱ میں پوری صراحت کے ساتھ یہ بات درج ہے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے، اور حکومت پر لازم ہے کہ وہ ایسے انتظامات کرے کہ دستور کے یومِ آغاز (۱۹۷۳ء) سے پندرہ سال کے اندر اندر اردو ملک کی سرکاری زبان بن جائے اور سرکاری اور دوسرے مقاصد کیلئے استعمال ہونے لگے، تاہم اسی دفعہ کی ذیلی شق نمبر ۲ میں یہ گنجائش دیدی گئی ہے کہ جب تک مذکورہ طریقہ پر اردو کے استعمال کے پورے انتظامات نہیں ہوتے، انگریزی کو سرکاری مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آئین پاکستان کی ان دفعات کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دستور میں صرف پندرہ سال تک سرکاری دفتروں میں انگریزی کے استعمال کی محض ایک عارضی گنجائش پیدا کی گئی تھی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اردو کو سرکاری مقاصد میں استعمال کرنے کے لئے ساتھ ساتھ انتظامات جاری رہیں۔ ۱۹۸۸ء میں پندرہ سال کی یہ مدت گذر گئی، اور اب اسے گذرے ہوئے بھی ساڑھے سات سال ہونے والے ہیں، یعنی اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے پندرہ سال کی جو مدت مقرر کی گئی تھی، وہ پوری ہونے کے بعد اسکی نصف

مدت مزید گذر چکی ہے، لیکن نہ صرف یہ کہ اردو کی سرکاری حیثیت کہیں نظر نہیں آتی، بلکہ وہ انتظامات دوربین لگا کر بھی دکھائی نہیں دیتے جو پندرہ سال میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے دستور نے لازم کئے تھے۔

اس کے برعکس اس دستور کے نفاذ کے بعد جو بائیس سال سے زیادہ کی مدت گذری ہے، اسکی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومتی سطح پر یہ مسئلہ شاید کبھی زیرغور ہی نہیں آیا کہ دستور کی دفعہ ۲۵۱ پر عمل کس طرح کرنا چاہئے؟ وہ کیا انتظامات ہیں جو پندرہ سال کے اندر اندر کرنے ضروری ہیں، اور ان کو کس طرح بروئے کار لایا جائیگا؟

اگر قومی زبان کو رائج کرنے کی سنجیدہ نیت ہو تو پندرہ سال کی مدت نہ صرف کافی بلکہ ضرورت سے زائد اور محض احتیاط پر مبنی تھی، جن قوموں کو اپنی زبان پیاری تھی، انہوں نے اس سے بھی بہت کم مدت میں اپنی زبان کو رواج دیدیا، ہم بھی اگر چاہتے تو آج ہر جگہ اردو کا عمل دخل ہوتا، لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ فنی اور تکنیکی معاملات تو ایک طرف رہے، آج تک ہم سرکاری دعوت نامے بھی اردو میں مرتب اور شائع نہیں کرسکے، بیشتر دفتروں کے مقررہ فارم تک اردو میں منتقل نہیں کرسکے، غرض قیام پاکستان سے اڑتالیس سال، اور موجودہ دستور کے نفاذ سے بائیس سال گذرنے کے بعد بھی ہمارا کوئی قابل ذکر قدم اس سمت میں آگے نہیں بڑھ سکا، اردو کی ترویج کے لئے کچھ ادارے ضرور قائم ہوے، اور انہوں نے علمی حد تک اپنا بہت سا کام مکمل بھی کرلیا، اصطلاحات کے ترجمے ہوگئے، مختلف علوم کی لغات شائع ہوگئیں، ٹائپ رائٹر کے لئے کلیدی تختے وجود میں آگئے، لیکن اس علمی کام سے فائدہ اٹھانے اور اسے عمل کی صورت دینے کے لئے جو انتظامات درکار تھے، ان کا معاملہ صفر ہی نظر آتا ہے، اور ایسا لگتا ہے کہ ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں اڑتالیس سال پہلے تھے، بلکہ اس دوران اردو کی فہم اور عام بول چال میں اسکا استعمال مزید کم ہوگیا ہے۔

اس طرز عمل سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں زبان کے مسئلے کی اہمیت ہی کا احساس نہیں اور ہم نے سنجیدگی سے قومی زبان کو رواج دینے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

اس بات پر دلائل دینے کی ضرورت نہیں کہ کسی بھی قوم و ملک کی صحت مند ترقی اس بات پر موقوف ہے کہ اسکی حکومت اور عوام کے درمیان مفاہمت کی فضا ہو، اور عوام یہ محسوس نہ کریں کہ ان پر بدیسی حکمران حکومت کر رہے ہیں اس مقصد کے حصول کے لئے کم سے کم بات یہ ہے کہ عوام اور سرکاری اداروں کی زبان مشترک ہو، ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اول تو ناخواندگی کی شرح تشویشناک حد تک زیادہ ہے، اور جو لوگ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انکی اکثریت انگریزی حروف تک سے نابلد ہے، اور انگریزی جاننے والوں کا اوسط شاید ایک فی ہزار بھی مشکل سے ہو، اسکے باوجود ہمارے قانون اور قاعدوں ضابطوں سے لے کر دفتری کارروائی تک انگریزی میں ہوتی ہے، جسے سمجھنے اور اسکے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی کسی انگریزی داں کی مدد کا محتاج ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ عوام کے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے، بلکہ بعض جگہ خود سرکاری اداروں کا کام بڑھا ہوا ہے۔ اسکی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ نچلی عدالتوں میں گواہیاں عموماً اردو یا کسی مقامی زبان میں ہوتی ہیں، اور اسی زبان میں ریکارڈ بھی کی جاتی ہیں، لیکن گواہیوں کا یہ ریکارڈ جب اوپر کی عدالتوں میں جاتا ہے تو نیچے کی عدالت اسکا انگریزی میں ترجمہ کر کے اوپر بھیجتی ہے، یہ طریق کار دراصل اس وقت اختیار کیا گیا تھا جب اوپر کی عدالتوں کے جج صاحبان انگریز تھے، اور وہ اردو زبان کی شہادتوں کو سمجھ نہیں سکتے تھے، آج اعلیٰ عدالتوں میں ایک جج بھی انگریز نہیں ہے، اور تمام جج صاحبان اردو سمجھ سکتے ہیں، لیکن طریق کار آج بھی یہی چلا آتا ہے کہ نچلی عدالتیں اردو شہادتوں کا انگریزی ترجمہ ضرور کراتی ہیں، اور اس طرح ان کو شہادتیں ریکارڈ کرنے میں دوہرا کام انجام دینا پڑتا ہے۔

اسی طرح قانون کی اصل زبان چونکہ انگریزی ہے، اس لئے خود حکومت کو بہت سے قوانین کا اردو ترجمہ کرانا پڑتا ہے، اسمبلی میں جب بل پیش ہوتے ہیں تو انگریزی نہ جاننے والوں کے لئے ان کا ترجمہ کرانے کا مسئلہ ہمیشہ درپیش رہتا ہے، پھر جن تعلیم گاہوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہے، ان کے لئے کتابیں اردو میں لکھوائی جاتی ہیں،اور طلبہ انہی اردو کتابوں کی مدد سے تعلیم حاصل کرتے ہیں،لیکن جب عملی میدان میں پہنچتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان اردو کتابوں کی بنیاد پر وہ کوئی عملی کام نہیں کرسکتے، لہٰذا انہیں دوبارہ اصل انگریزی کتابوں پر محنت کرنی پڑتی ہے،غرض اس طرح کے بہت سے عملی مسائل صرف عوام ہی کیلئے نہیں خود سرکاری اداروں کے لئے بکثرت کھڑے رہتے ہیں۔

ان عملی مسائل کے علاوہ عوام اور سرکاری دفاتر کے درمیان زبان کی جو دیوار مستقل کھڑی ہوئی ہے اسکے نتیجے میں عوام کے دلوں میں حکومت کے لئے اپنائیت کا احساس ترقی نہیں کر پاتا،عوام آج بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان پر کوئی دوسرا حکومت کر رہا ہے، جس کی زبان، جسکی اصطلاحات اور جس کی سوچ ان کی اپنی زبان اور سوچ سے مختلف ہے، چنانچہ ان کے دل میں قانون کے ساتھ کوئی ہمدردی کا جذبہ یا اس کا خاطرخواہ احترام پرورش نہیں پاتا، وہ قانون کو صرف ایک مجبوری سمجھتے ہیں، اوراس سے فرار حاصل کرنے کو ایک ہنر گرداننے لگتے ہیں۔

اس جیسے بیشمار مسائل صرف اس لئے پیدا ہورہے ہیں کہ ہم نے بدیسی حکمرانوں کے نہ صرف نظامِ حکمرانی کو، بلکہ ان کی زبان تک کو اپنے اوپر لادا ہوا ہے، اور جب تک ہم اس بدیسی نظام سے نجات حاصل کرکے اسے اپنے عقیدے، اپنی فکر، اپنی ضروریات اوراپنے مزاج کے مطابق نہیں ڈھالینگے، یہ مسائل بحیثیت قوم ہماری ترقی میں رکاوٹ بنے رہیں گے، اورعوام اور حکومت کے درمیان وہ فاصلہ برقرار رہے گا جو قومی یکجہتی کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے،سوال یہ ہے کہ آزادی کے بعد تقریباً نصف صدی گذارنے

کے باوجود کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم ایک زندہ، خوددار اور غیرت مند قوم کی طرح اپنے ان اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لئے سنجیدگی سے سوچیں؟

میں یہ سطور لکھ چکا تھا کہ شہر میں ایک ضرورت سے ایک دوکان پر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں ایک چھوٹی سی بچی آئی جسکی عمر بمشکل دس گیارہ سال ہوگی، اس نے دوکاندار سے ایک بیٹری طلب کی، اور اسکی قیمت پوچھی، دوکاندار نے کہا بیس روپے، بچی بولی، آپ انگلش میں بتایئے، کتنے روپے ہوئے؟ دوکاندار نے کہا ٹونٹی روپیز، تب بچی نے بیس روپے نکال کر دیدیئے، اندازہ لگایئے کہ بات کہاں تک پہنچ چکی ہے؟ اب اردو کی گنتی تک بچوں کو یاد نہیں رہی۔

۱۵/ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ
۱۲/ستمبر ۱۹۹۵ء

پڑوسی

ابوحمزہ سکّریؒ حدیث کے ایک راوی گذرے ہیں، ,,سکّر،،عربی زبان میں چینی کو کہتے ہیں، اور ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہیں ,,سکّری،، اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان کی باتیں ان کا لہجہ اور ان کا انداز گفتگو بڑا دلکش اور شیریں تھا، جب وہ بات کرتے تو سننے والا ان کی باتوں میں محو ہو جاتا تھا، وہ بغداد شہر کے ایک محلے میں رہتے تھے، کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنا مکان بیچ کر کسی دوسرے محلے میں منتقل ہونے کا ارادہ کیا، خریدار سے معاملہ بھی تقریباً طے ہو گیا۔ اتنے میں ان کے پڑوسیوں اور محلّہ داروں کو پتہ چلا کہ وہ اس محلے سے منتقل ہو کر کہیں اور بسنے کا ارادہ کر رہے ہیں، چنانچہ محلّہ والوں کا ایک وفد ان کے پاس آیا، اور ان کی منّت سماجت کی کہ وہ یہ محلّہ نہ چھوڑیں، جب ابوحمزہ سکریؒ نے اپنا عذر بیان کیا تو تمام محلّہ والوں نے متفقہ طور پر انہیں یہ پیشکش کی کہ آپ کے مکان کی جو قیمت لگی ہے، ہم وہ قیمت آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کو تیار ہیں، لیکن آپ ہمیں اپنے پڑوس سے محروم نہ کیجئے، جب انہوں نے محلّہ والوں کا یہ خلوص دیکھا تو منتقل ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ابوحمزہ سکریؒ کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی سحر انگیز شخصیت بھی ہوگی، لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ایک مثال قائم کی تھی، قرآن کریم نے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید فرمائی ہے اور

رسول کریم ﷺ نے اپنے بہت سے ارشادات میں پڑوسی کے حقوق کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں، یہاں تک کہ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل امین علیہ السلام آئے، اور مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید وہ پڑوسی کو ترکے میں وارث بھی قرار دیدیں گے۔

قرآن وسنت کی ان تعلیمات کے سائے میں جو معاشرہ پروان چڑھا، اس میں پڑوسی کی حیثیت ایک قریبی رشتہ دار سے کم نہ تھی، ایک ساتھ رہنے والے نہ صرف ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے، بلکہ ایک دوسرے کے لئے ایثار وقربانی کرکے خوشی محسوس کرتے تھے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں سعودی عرب گیا تو وہاں کے ایک باشندے نے مجھے اپنا واقعہ خود سنایا کہ ایک مرتبہ میں کپڑا خریدنے کے لئے بازار گیا، ایک دوکان میں داخل ہوکر بہت سے کپڑے دیکھے، دوکاندار پوری خوش اخلاقی سے مجھے مختلف کپڑے دکھاتا رہا، بالآخر میں نے ایک کپڑا پسند کرلیا دوکاندار نے مجھے قیمت بتادی میں نے دوکاندار سے کہا کہ ”مجھے یہ کپڑا اتنے گز کاٹ کر دیدو“، اسپر دوکاندار ایک لمحے کے لئے رکا، اور اس نے مجھ سے کہا، آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا جی ہاں، کہنے لگا قیمت بھی آپ کی رائے میں مناسب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں، اس پر اس نے کہا کہ اب آپ میرے برابر والی دوکان پر چلے جائیے، اور وہاں سے یہ کپڑا اسی قیمت پر لے لیجئے، میں بڑا حیران ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ میں اس دوکان پر کیوں جاؤں؟ میرا معاملہ تو آپ سے ہوا ہے، کہنے لگا آپ کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کو جو کپڑا چاہئے، وہ وہاں موجود ہے، اور آپ کو اسی قیمت میں مل جائیگا، جاکر وہاں سے لے لیجئے میں نے کہا کہ پہلے مجھے وجہ بتایئے، کیا وہ آپ ہی کی دوکان ہے؟ اس نے کہا نہیں، اب میں بھی اڑ گیا، اور میں نے اصرار کیا کہ جب تک آپ مجھے وجہ نہیں بتائیں گے میں اس دوکان پر نہیں جاؤں گا، آخر

کاراس نے زچ ہوکر کہا کہ آپ خواہ مخواہ بات لمبی کررہے ہیں بات صرف اتنی ہے کہ میرے پاس صبح سے اب تک بہت سے گاہک آچکے ہیں، اور میری اتنی بکری ہوچکی ہے کہ میرے لئے آج کے دن کے حساب سے کافی ہوسکتی ہے، لیکن میں دیکھ رہاہوں کہ میرا پڑوسی دوکاندار صبح سے خالی بیٹھا ہے، اس کے پاس کوئی گاہک نہیں آیا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی بھی کچھ بکری ہوجائے، آپ کے وہاں جانے سے اس کا بھلا ہوجائے گا، آپ کا اس میں کیا حرج ہے؟

یہ اس اسلامی معاشرے کی ایک بچی کھچی جھلک تھی جس میں مسرت اور کامیابی محض پیسوں کی گنتی کا نام نہیں تھا، بلکہ روح کے اس سکون اور قلب وضمیر کے اس اطمینان کا نام تھا جو اپنے کسی بھائی بہن کا دکھ دور کر کے یا اس کے چہرے پر مسکراہٹ لاکر حاصل ہوتا ہے، جب قرآن کریم نے انصار مدینہ کی تعریف کرتے ہوے یہ فرمایا تھا کہ چاہے وہ خود مفلسی کا شکار ہوں، مگر دوسروں کے ساتھ ایثار کا معاملہ کر کے انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، تو درحقیقت ان کی اسی صفت کی مثال دیگر مسلمانوں کو انکی پیروی کی ترغیب دی تھی، یوں تو ایثار کا یہ معاملہ ہرشخص کے ساتھ قابل تعریف ہے، لیکن خاص طور پر پڑوسی اس کا زیادہ حقدار ہے اسی لئے قرآن وسنت نے اسکی زیادہ ترغیب دی ہے۔

جدید شہری زندگی نے جہاں ہماری بہت سی قدریں بدل ڈالی ہیں وہاں پڑوس کی اہمیت کا تصور بھی بری طرح دھندلا دیا ہے، اول تو کوٹھی بنگلوں کے مکین پڑوس کا مفہوم ہی بھولتے جارہے ہیں، بعض دفعہ مدتوں پاس پاس رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے ناواقف رہتے ہیں، اور اگر کہیں پڑوس کی اہمیت کا تصور موجود ہے تو عام طور سے اسے انہی پڑوسیوں کے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے، جو رتبے یا معاشی حالت کے اعتبار سے اپنے برابر یا قریب قریب ہوں، چنانچہ کوٹھی بنگلے میں رہنے والا کسی دوسری کوٹھی کے مکین ہی کو اپنا پڑوسی سمجھتا ہے، اور اگر اس کے پاس کچھ لوگ جھونپڑیوں یا معمولی مکانات میں رہ

رہے ہوں تو انہیں عام طور سے نہ پڑوسی سمجھا جاتا ہے، نہ پڑوسی جیسے حقوق دیئے جاتے ہیں، ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی عالی شان بنگلے میں رہنے والا اپنے قریب کسی جھونپڑی والے کی خبر گیری، اسکی بیمار پرسی یا محض ملاقات کے لئے جاتا ہو، حالانکہ ایسے پڑوسی ایثار و محبت کے زیادہ مستحق ہیں۔

دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ علمی اور دینی اعتبار سے تو بلند مقام کے حامل تھے ہی، اپنی خاندانی وجاہت کے اعتبار سے بھی ممتاز تھے، لیکن ان کا روزانہ معمول یہ تھا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے دار العلوم جانے سے پہلے اپنے قریب معمولی مکانات میں بسنے والی بیواؤں اور بے سہارا خواتین کے پاس جاتے، ہر ایک سے پوچھتے کہ انہیں بازار سے کیا سودا سلف منگانا ہے؟ اور بہت سی خواتین کے بتائے ہوے سودے کی ایک فہرست لے کر خود بازار جاتے، ہر خاتون کا سودا خریدتے، اور ہر ایک کو پہنچاتے، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی خاتون کہتی مفتی صاحب! آپ یہ چیز غلط لے آئے، میں نے تو فلاں چیز منگائی تھی، یا اتنی تعداد میں منگائی تھی، مفتی صاحب خندہ پیشانی سے فرماتے معاف کرنا بی بی مجھ سے غلطی ہو گئی، میں ابھی بدل کر وہ چیز لے آتا ہوں، اور اس طرح وہ نہ جانے کتنے ٹوٹے دلوں کی دعائیں سمیٹ کر اور ان کی خدمت کے سرور سے دل آباد کر کے اپنے دن کی مصروفیات کا آغاز کرتے تھے۔ آج تقریباً ہر شخص اسباب راحت کی فراوانی کے باوجود ایک انجانی سی بے چینی اور دل کی ایک بے نام سی کسک میں مبتلا ہے، اور بقول جناب نظر امروہوی ؎

کوئی الجھن نہیں، لیکن کسی الجھن میں رہتا ہے
عجب دھڑکا سا ہر دم دل کی ہر دھڑکن میں رہتا ہے

اس انجانی بے چینی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے روپے پیسے کی گنتی ہی کو زندگی کا مقصد سمجھ لیا ہے، اور مال و دولت کی دوڑ سے آگے کچھ سوچنے کے لئے تیار نہیں، چنانچہ

ہم روح کے اس اطمینان اور دل کے اس سرور سے محروم ہوتے جارہے ہیں جو اپنے کسی بھائی بہن کی خدمت کرکے اور اس کے لئے کوئی قربانی دے کر حاصل ہوتا ہے، جو زندگی کو اپنے خالق و مالک کے تابع فرمان بنانے اور اس کے حکم کے آگے اپنی ناجائز خواہشات کو کچلنے کا نقد انعام ہوتا ہے، قلبی سکون کا یہ نقد انعام بسا اوقات کچے مکان اور دال روٹی کی معمولی معیشت میں بھی حاصل ہو جاتا ہے، اور اگر اسکی شرائط پوری نہ ہوں تو عالی شان کوٹھیوں اور چمکدار کاروں میں بھی حاصل نہیں ہوتا، اس صورت میں کوٹھی بنگلوں کی چمک دمک دل میں چھپی ہوئی بے چینیوں کا علاج نہیں کر سکتی۔

کوئی شک نہیں کہ آج کی شہری زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے، لیکن یہ مصروفیت زیادہ تر روپے پیسے کی گنتی بڑھانے ہی کے لئے ہے، لہذا اگر سکونِ قلب بھی کوئی حقیقی نعمت ہے جسے حاصل کرنے کی فکر کی جائے تو انہی مصروفیتوں میں تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے بھی نکالنا پڑیگا جس میں اپنے آس پاس بسنے والوں کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جا سکے، اور ان کے دکھ دور کرنے کی کوئی امکانی سبیل تلاش کی جا سکے۔ چوبیس گھنٹے کی مصروفیات میں سے نکالے ہوے یہ چند لمحات جو اس کام میں خرچ ہونگے، انشاء اللہ وہ کام کر جائیں گے جو دن بھر کی بھاگ دوڑ سے حاصل ہونے والی روپے کی ریل پیل انجام نہیں دے سکتی۔

۵ / جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ
یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء

تھوڑی دیر کا ساتھی

زندگی میں انسان کو قدم قدم پر دوسروں سے واسطہ پیش آتا ہے، بعض تعلقات دائمی نوعیت کے ہوتے ہیں، جیسے رشتہ دار، بعض دائمی نہ سہی لیکن لمبی مدت کے لئے ہوتے ہیں جیسے پڑوسی، اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ صرف چند گھنٹوں یا اس سے بھی کم مدت کے لئے کسی کا ساتھ ہو جاتا ہے، جیسے ہم سفر جو کسی بس، ریل یا ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے نہایت باریک بینی سے ان تینوں قسم کے تعلقات کے کچھ حقوق رکھے ہیں، اور ان حقوق کی نگہداشت کی تاکید فرمائی ہے، پہلی دو قسموں یعنی رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق کو لوگ پھر بھی کچھ نہ کچھ اہمیت دیتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجے میں انسان بدنام ہو جاتا ہے، اور چونکہ یہ تعلقات دیرپا قسم کے ہیں اس لئے یہ بدنامی بھی دیرپا ہو جاتی ہے، لیکن تیسری قسم یعنی وہ لوگ جو مختصر وقفے کے لئے ساتھ ہو گئے ہوں بہت کم انسان ان کے حقوق کا خیال رکھنے پر آمادہ ہوتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ عموماً اجنبی ہوتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے بعد جب جدا ہوتے ہیں تو بعض اوقات تمام عمر ان سے کوئی واسطہ پیش نہیں آتا، اس لئے ان کے ساتھ اگر کوئی بداخلاقی یا بدسلوکی ہو جائے تو اس کی وجہ سے کسی دیرپا بدنامی کا اندیشہ نہیں ہوتا، لوگ عموماً یہ سوچتے ہیں کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس شخص پر میرے بارے میں

کوئی غلط تأثر قائم ہو بھی گیا تو کیا ہوا؟ بعد میں تو کبھی اس سے ملنا نہیں ہے، اس لئے اس تأثر سے میری زندگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑیگا۔ چنانچہ بسوں، ریلوں دوسری عوامی سواریوں، اور اب تو ہوائی جہازوں میں بھی جو دھکا پیل اور نفسی نفسی کا جو عالم نظر آتا ہے، کہ ہر شخص دوسرے کو کہنی مار کر آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا ہے، وہ درحقیقت اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔

اسی لئے قرآن کریم نے جہاں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی، وہاں تھوڑی دیر کے ساتھیوں کے حقوق ادا کرنے کو بطور خاص ذکر فرمایا، تھوڑی دیر کے ساتھی کیلئے قرآن کریم نے ﴿الصاحب بالجنب﴾ کا لفظ استعمال کیا ہے، (سورۂ نساء آیت نمبر ۳٦) اس کا اردو ترجمہ ,,ہم پہلو،، کے لفظ سے کیا جا سکتا ہے، اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو مختصر مدت کے لئے کسی کے ساتھ ہو گیا ہو، خواہ کسی سفر میں، یا کسی عمومی مجلس میں، بس یا ریل میں سفر کرتے ہوئے جو شخص ہمارے قریب بیٹھا ہے، وہ ہمارا ,,صاحب بالجنب،، ہے، کسی دعوت جلسے یا اجتماع عام میں جو شخص ہمارے پہلو میں ہے، وہ ہمارا ,,صاحب بالجنب،، ہے، اور قرآن کریم نے خاص طور پر اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اس لئے فرمائی ہے کہ انسان کی شرافت اور خوش اخلاقی کا اصل امتحان ایسے ہی مواقع پر ہوتا ہے، بڑے بڑے تعلیم یافتہ، بظاہر مہذب اور شائستہ لوگوں کو دیکھا کہ اپنے روزمرہ کے حالات میں وہ بظاہر بڑے خوش اخلاق اور شائستہ نظر آتے ہیں، لیکن جب کبھی سفر کی نوبت آئی تو ان کی ساری تہذیب اور خوش اخلاقی دھری کی دھری رہ گئی، اور انہوں نے اپنے ہم سفروں کے ساتھ پرلے درجے کی خود غرضی اور سنگدلی کا برتاؤ شروع کر دیا۔

. اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ کسی شخص کی نیکی کی حتمی گواہی اس وقت دو جب یا تو تمہارا اس سے روپے پیسے کا کوئی لین دین

ہو چکا ہو جس میں تم نے اسے کھر اپایا ہو، یا اس کے ساتھ تم نے کوئی سفر کیا ہو، اور اس سفر میں تم نے اسے واقعی خوش اخلاق دیکھا ہو۔

بات دراصل یہ ہے کہ خوش اخلاقی کا جو برتاؤ صرف بدنامی کے خوف سے کیا جائے، وہ خوش اخلاقی ہی کہاں ہے؟ وہ تو ایک دکھاوا ہے، چنانچہ جب بدنامی کا خوف ٹلیگا، انسان کی بداخلاق اصلیت ظاہر ہو جائیگی، خوش اخلاقی تو ایک اندرونی صفت کا نام ہے جو نیک نامی اور بدنامی سے بے نیاز ہو کر کوئی اچھا عمل اس لئے کرتی ہے کہ وہ اچھا ہے، اور اللہ تعالی کی خوشنودی کا سبب ہے، جب یہ صفت کسی شخص کو حاصل ہو جائے تو اس کا رویہ ہر جگہ اس صفت کے مطابق ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس جگہ بھی جہاں اسے کوئی دیکھ نہ رہا ہو، وہ اپنی پاکیزہ فطرت کے تحت وہی طرز عمل اختیار کرتا ہے جو اسے کرنا چاہئے، اور یہ حقیقت اس کے سامنے رہتی ہے کہ کوئی اور دیکھے یا نہ دیکھے، وہ ضرور دیکھ رہا ہے جس کے دیکھنے پر جنت اور جہنم کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اسلام نے ,,صاحب بالجنب،، یعنی تھوڑی دیر کے ساتھی کے حقوق کی جس باریک‌بینی سے دیکھ بھال کی ہے، اسکا اندازہ چند مثالوں سے لگایئے:

(۱) جمعہ کے دن جب مسجد میں لوگ خطبے اور نماز کے لئے جمع ہوں تو نووارد کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ اجتماع کے آخری حصے میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنے کی کوشش کو سختی سے منع فرمایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے اس عمل پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

(۲) جمعہ کے دن نہادھو کر، اچھے کپڑے پہنکر اور خوشبو لگا کر مسجد میں جانے کی ترغیب دی گئی ہے، تاکہ اس بڑے اجتماع میں ہر شخص دوسرے کے لئے تکلیف کے بجائے فرحت اور راحت کا سبب بنے۔

(۳) فقہاء کرام نے کہا ہے کہ جو شخص کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس سے کسی

پاس والے کو تکلیف ہو سکتی ہو، یا گھن آ سکتی ہو، اس کیلئے جماعت کی نماز معاف ہے، اور اسے اپنے گھر ہی میں نماز پڑھنے پر انشاء اللہ مسجد کی جماعت کا ثواب ملے گا۔

(۴) جب چند افراد ساتھ بیٹھ کر کوئی چیز کھا رہے ہوں تو حکم یہ ہے کہ دوسروں کا خیال رکھ کر کھاؤ، حدیث میں ہے کہ جب دوسرے لوگ ایک ایک کھجور لے کر کھا رہے ہوں تو تم دو دو کھجوریں مت لو، اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ صرف اپنی اپنی فکر کرنا اور جو ہاتھ لگے لے اڑنا ایک مومن کا شیوہ نہیں، یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کچھ اور لوگ بھی تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہیں، تمہارا حصہ پوری طرح ناپ تول کر نہ سہی، لیکن دوسروں کے ساتھ کسی توازن ہی میں ہونا چاہئے، (آج کل بوفے قسم کی دعوتوں میں بعض مرتبہ جو چھینا جھپٹی نظر آتی ہے، اور جس طرح بعض لوگ یکبارگی ضرورت سے زیادہ چیزیں اپنے برتن میں انڈیل لیتے ہیں وہ ان احکام کی صریح خلاف ورزی ہے)

یہ چند مثالیں میں نے صرف یہ بتانے کے لئے دی ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں ,,صاحب بالجنب،، یا تھوڑی دیر کے ساتھی کی کتنی اہمیت ہے، اس اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے معاشرے کے چند جزوی مسائل پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

جہاں بہت سے لوگوں کو باری باری کوئی کام انجام دینا ہوا، وہاں فطری طریقہ یہی ہے کہ آنے والوں کی ترتیب سے ایک قطار بنالی جائے، اور ہر شخص نمبر وار اپنا کام انجام دیتا رہے، اس طرح سب کا فائدہ ہے، اور سب کا کام آسانی سے ہو جاتا ہے، ایسے موقع پر (کسی معقول عذر کے بغیر) لائن توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا یا اسکے لئے دھینگا مشتی کرنا دوسروں کی شدید حق تلفی ہے، جو بد اخلاقی اور ناشائستگی ہونے کے علاوہ گناہ بھی ہے۔

افسوس ہے کہ آج غیر مسلم قومیں اس بات کا لحاظ رکھتی ہیں، بلکہ ان کا مزاج ہی یہ بن چکا ہے کہ جہاں دو آدمی جمع ہونگے فوراً آگے پیچھے ہو کر قطار بنالیں گے، لیکن ہم جو ,,صاحب بالجنب،، کے بارے میں قرآن وسنت کی مذکورہ ہدایات کی روشنی رکھتے ہیں لائن

توڑ کر آگے بڑھنے کو بہادری اور جی داری کا ایک ہنر سمجھتے ہیں، اور یہ خیال تو شاید ہی کسی کو آتا ہو کہ میں کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں۔

بس یا ریل میں ہر شخص نشست کا اتنا حصہ استعمال کرنے کا حق دار ہے جتنا ایک مسافر کے لئے گاڑی والوں کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، اس میں ہمارے یہاں دو طرح کی شدید بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔

پہلی بے اعتدالی تو یہ ہے کہ جن گاڑیوں میں بکنگ نہیں ہوتی، ان میں جو شخص پہلے پہنچ گیا وہ بیک وقت کئی کئی نشستوں کی جگہ گھیر کر اس پر قبضہ جما لیتا ہے اور دوسرے مسافر کھڑے کھڑے سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اب یہ کتنی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ ایک ٹکٹ لے کر آرام سے لیٹے ہیں، اور دوسرا شخص اتنی ہی رقم کا ٹکٹ لے کر بیٹھنے سے بھی محروم ہے۔ میں نے اپنے بعض بزرگ علماء کے بارے میں تو یہاں تک سنا ہے کہ اگر گاڑی بالکل خالی پڑی ہوتی، اور دوسرے مسافر نہ ہوتے تب بھی وہ اپنی نشست سے زیادہ جگہ استعمال نہیں کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں نے ایک نشست کا کرایہ دیا ہے، میں ایک ہی نشست کے استعمال کا حق دار ہوں، اس سے زیادہ کا نہیں۔ یقیناً یہ احتیاط و تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے، لیکن چونکہ گاڑی والوں کی طرف سے ایسے مواقع پر خالی جگہوں کے استعمال کی عموماً اجازت ہوتی ہے، اس لئے اسکو ناجائز نہیں کہا جا سکتا، مگر جہاں دوسرے مسافر کھڑے ہونے پر مجبور ہوں، وہاں زائد جگہ گھیرنے کا کوئی جواز نہیں۔

دوسری بے اعتدالی اس کے برعکس یہ ہوتی ہے کہ جو سیٹ چار آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے مخصوص ہے اس میں پانچواں آدمی زبردستی اپنے آپ کو ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے، اور پہلے سے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ سمٹ کر اسے ضرور جگہ دیں، اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ پہلے سے جائز اور بجا طور پر اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، وہ تنگی اور دشواری کے ساتھ اپنا سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ایسے میں اگر وہ لوگ خود

ایثار سے کام لیں، اور نو وارد کو جگہ دیدیں تو بے شک یہ ان کی عالی ظرفی ہے، اور باعث ثواب ہے، لیکن کسی نووارد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انہیں اس عالی ظرفی پر مجبور کرے۔

چونکہ ہم نے دین کو صرف نماز روزے ہی کی حد تک محدود کر لیا ہے اسلئے اس قسم کی حرکتیں کرتے وقت یہ خیال بھی دل میں نہیں آتا کہ ہم کسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، حالانکہ جس عمل سے بھی کسی دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہو، یا اسے بیجا تکلیف پہنچتی ہو، وہ حرام ہے، ایسا حرام کہ اسکا گناہ صرف توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جب تک خود وہ شخص معاف نہ کرے جس کی حق تلفی کی گئی ہے۔

دیکھنے میں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن در حقیقت انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے افراد اور قوموں کا مزاج بگڑتا ہے، اور جب کسی معاشرے کا مزاج بگڑ جائے تو وہی کچھ ہوتا ہے جس کا رونا آج ہم سب رو رہے ہیں، پھر فائدہ کسی کا نہیں ہوتا، نقصان سب کا ہوتا ہے، راحت کسی کو نصیب نہیں ہوتی، تکلیف میں سب مبتلا رہتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ سوچ لیں کہ جس شخص کے ساتھ ہمیں کچھ دیر کی رفاقت میسر آئی ہے، اسکو آرام پہنچانے کی خاطر اگر ہم خود تھوڑی سی تکلیف اٹھالیں تو یہ تکلیف تو زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کی ہے، جو بہت جلد ختم ہو جائیگی، لیکن ہمارے ایثار کا نقش ہمارے ساتھی کے دل سے جلدی نہیں مٹیگا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا، اور ہماری یہ تھوڑی سی محنت انشاء اللہ وہاں جاکر کیش ہوگی، جہاں روپے پیسے کا کیش بیکار ہو چکا ہوگا، تو رفتہ رفتہ ہمارے معاشرے کا مزاج بھی بدل سکتا ہے، اور ہم ایک دوسرے کے لئے سراپا رحمت بن سکتے ہیں۔

۱۲ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
۸ / اکتوبر ۱۹۹۵ء

شادی بیاہ کی رسمیں

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو آنحضرت ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی تھی، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے انہیں دیکھا تو ان کے کپڑوں پر ایک پیلا سا نشان نظر آیا، آپ نے پوچھا کہ یہ کیسا نشان ہے؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جواب دیا کہ میں نے ایک خاتون سے نکاح کیا ہے، (مطلب یہ تھا کہ نکاح کے موقع پر کپڑوں پر خوشبو لگائی تھی، اسکا یہ نشان باقی رہ گیا) آنحضرت ﷺ نے انہیں برکت کی دعا دی، اور فرمایا کہ ولیمہ کرنا چاہے ایک بکری ہی کا ہو۔

اندازہ لگایئے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ آنحضرت ﷺ کے اتنے قریبی صحابی ہیں کہ دس منتخب صحابہ کرامؓ میں ان کا شمار ہوتا ہے، لیکن انہوں نے نکاح کیا تو نکاح کی مجلس میں آنحضرت ﷺ تک کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، آپ ﷺ نے کپڑوں پر لگی ہوئی خوشبو کا نشان دیکھ کر سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے نکاح کیا ہے، آنحضرت ﷺ نے بھی کوئی شکایت نہیں فرمائی کہ تم اکیلے اکیلے نکاح کر بیٹھے اور ہمیں پوچھا بھی نہیں، شکایت کے بجائے آپ ﷺ نے انہیں دعا دی، البتہ ساتھ ہی یہ ترغیب بھی دی کہ ولیمہ کریں۔

دراصل اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اور اتنا سادہ بنایا کہ جب دونوں فریق راضی

ہوں، وہ کسی بے جا رکاوٹ کے بغیر یہ رشتہ قائم کر سکیں، شریعت نے یہ شرط بھی نہیں لگائی کہ کوئی قاضی یا عالم ہی نکاح پڑھائے، شریعت کی طرف سے شرط صرف اتنی ہے کہ نکاح کی مجلس میں دو گواہ موجود ہوں، اگر دولہا دلہن عاقل و بالغ ہوں تو ان میں سے کوئی دوسرے سے کہدے کہ میں نے تم سے نکاح کیا، دوسرا جواب دیدے کہ میں نے قبول کیا، بس نکاح ہوگیا نہ اس کے لئے کسی عدالت میں جانے کی ضرورت ہے نہ کسی تقریب کی کوئی شرط ہے، نہ دعوت ضروری ہے، نہ جہیز لازمی ہے، ہاں! دلہن کے اکرام کے لئے مہر ضروری ہے، اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ مہر کا تعین بھی نکاح ہی کے وقت کرلیا جائے، لیکن اگر بالفرض نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا ہو تب بھی نکاح ہوجاتا ہے، اور مہر مثل لازم سمجھا جاتا ہے، نکاح کے وقت خطبہ بھی ایک سنت ہے، اور حتی الامکان اس سنت کی برکات ضرور حاصل کرنی چاہییں، لیکن نکاح کی صحت اس پر موقوف نہیں، لہٰذا اگر خطبہ کے بغیر ہی ایجاب وقبول کرلیا جائے، تب بھی نکاح صحیح ہوجاتا ہے، نکاح میں کوئی نقص نہیں آتا۔

ولیمہ، جس کی ترغیب آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث میں دی ہے وہ بھی سنت ہے، لیکن اول تو وہ بھی ایسا فرض یا واجب نہیں کہ اس کے بغیر نکاح نہ ہوسکتا ہو، دوسرے اس کی کوئی مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی، نہ مہمانوں کی کوئی تعداد لازمی قرار دی ہے، ہر شخص اپنی مالی استطاعت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرسکتا ہے، اور اس کے لئے قرض ادھار کرنے کی بھی نہ صرف کوئی حاجت نہیں، بلکہ ایسا کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، کوئی شخص جتنے مختصر پیمانے پر ولیمہ کر سکتا ہے، اتنے ہی مختصر پیمانے پر کرلے، اور نہ کرسکے تب بھی اس سے نکاح میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اس لئے کیا تھا کہ نکاح انسانی فطرت کا ایک ضروری تقاضا جائز طریقے سے پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اور اگر اس جائز ذریعے پر رکاوٹیں

عائد کی جائیں، یا اسکو مشکل بنایا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بے راہ روی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، جب کوئی شخص اپنی فطری ضرورت پوری کرنے کے لئے جائز راستے بند پائیگا، تو اس کے دل میں ناجائز راستوں کی طلب پیدا ہوگی، اور اس طرح پورا معاشرہ بگاڑ کا شکار ہوگا۔

لیکن اسلام نے نکاح کو جتنا آسان بنایا تھا، ہمارے موجودہ معاشرتی ڈھانچے نے اسے اتنا ہی مشکل بنا ڈالا ہے، نکاح کے بابرکت معاہدے پر ہم نے لامتناہی رسموں، تقریبات اور فضول اخراجات کا ایسا بوجھ لاد رکھا ہے کہ ایک غریب، بلکہ متوسط آمدنی والے شخص کے لئے بھی وہ ایک ناقابل عبور پہاڑ بن کر رہ گیا ہے، اور کوئی شخص اس وقت تک نکاح کا تصور نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس (گری سے گری حالت میں بھی) لاکھ دو لاکھ روپے موجود نہ ہوں۔ یہ لاکھ دو لاکھ روپے نکاح کی حقیقی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے نہیں، بلکہ صرف فضول رسموں کا پیٹ بھرنے کے لئے درکار ہیں، جنہیں خرچ کرنے سے زندگی کی حقیقی ضروریات پوری کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

شریعت کی طرف سے نکاح کے موقع پر لے دے کر صرف ایک دعوت ولیمہ مسنون تھی، اور وہ بھی ہر شخص کی استطاعت کے مطابق، لیکن اب تقریبات اور دعوتوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے، منگنی کی تقریب ایک مستقل شادی کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، اور عین نکاح کے موقع پر مہندی ابٹن سے لے کر چوتھی بھوڑے تک تقریباً ہر روز کسی نہ کسی تقریب کا اہتمام لازمی سمجھ لیا گیا ہے، جس کے بغیر شادی بیاہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تقریبات میں بھی زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئے اخراجات کا اضافہ ہو رہا ہے، نئے نئے مطالبے سامنے آ رہے ہیں، نئی نئی رسمیں وجود میں آ رہی ہیں غرض فضولیات کا ایک طومار ہے جس نے شادی کو خاص طور سے غریب اور متوسط آدمی کے لئے ایک ایسی ذمہ داری میں تبدیل کر دیا ہے جو عام طور پر صرف حلال

آمدنی سے پوری نہیں ہو سکتی، لہذا اسے پورا کرنے کے لئے کہیں نہ کہیں ناجائز ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے، اور اس طرح نکاح کا یہ کار خیر نہ جانے کتنی بد عنوانیوں اور کتنے گناہوں کا ملغوبہ بن کر رہ جاتا ہے، اور جس نکاح کا آغاز ہی بد عنوانی یا گناہ سے ہو، اس میں خیر و برکت کہاں سے آئیگی؟

خوشی کے مواقع پر اعتدال کے ساتھ خوشی منانے پر شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی، لیکن خوشی منانے کے نام پر ہم نے اپنے آپ کو جن بے شمار رسموں میں جکڑ لیا ہے، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ خوشی، جو دل کی فرحت کا نام تھا، وہ تو پیچھے چلی گئی ہے، اور رسموں کے لگے بندھے قواعد آگے آگئے ہیں، جن کی ذرا خلاف ورزی ہو تو شکوے شکایتوں اور طعن و تشنیع کا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے، لہذا شادی کی تقریبات رسموں کی خانہ پری کی نذر ہو جاتی ہیں، جس میں پیسہ تو پانی کی طرح بہتا ہی ہے، دل و دماغ ہر وقت رسمی قواعد کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں، شادی کے انتظامات کرنے والے تھک کر چور ہو جاتے ہیں پھر بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی شکایت کا سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بعض اوقات لڑائی جھگڑوں تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

زبان سے اس صورت حال کو ہم سب قابل اصلاح سمجھتے ہیں، لیکن جب عمل کی نوبت آتی ہے تو عموماً پرنالہ وہیں گرتا ہے، اور ایک ایک کر کے ہم تمام رسموں کے آگے ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کا کوئی حل اسکے سوا نہیں ہے کہ اول تو بااثر اور خوش حال لوگ بھی اپنی شادیوں کی تقریبات میں حتی الامکان سادگی اختیار کریں، اور ہمت کر کے ان رسموں کو توڑیں جنہوں نے شادی کو ایک عذاب بنا کر رکھ دیا ہے، دوسرے اگر دولت مند افراد اس طریق کار کو نہیں چھوڑتے تو کم از کم محدود آمدنی والے افراد یہ طے کر لیں کہ وہ دولت مندوں کی حرص میں اپنا پیسہ اور توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے اپنی چادر

کے مطابق پاؤں پھیلائیں گے، اور اپنی استطاعت کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے۔

اس سلسلے میں اگر ہم مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر اہتمام کرلیں تو امید ہے کہ مذکورہ بالاخرابیوں میں انشاءاللہ نمایاں کمی واقع ہوگی:۔

(۱) خاص نکاح اور ولیمہ کی تقریبات کے علاوہ جو تقریبات منگنی، مہندی ابٹن اور چوتھی وغیرہ کے نام سے رواج پاگئی ہیں، ان کو یکسر ختم کیا جائے، اور یہ طے کرلیا جائے کہ ہماری شادیوں میں یہ تقریبات نہیں ہوں گی، فریقین اگر واقعی محبت اور خوش دلی سے ایک دوسرے کو کوئی تحفہ دینا یا بھیجنا چاہتے ہیں وہ کسی باقاعدہ تقریب اور لاؤ لشکر کے بغیر سادگی سے پیش کردیں گے۔

(۲) اظہار مسرت کے کسی بھی مخصوص طریقے کو لازمی اور ضروری نہ سمجھا جائے، بلکہ ہر شخص اپنے حالات اور وسائل کے مطابق بے تکلفی سے جو طرز عمل اختیار کرنا چاہے کرلے، نہ وہ خود کسی کی حرص کا شکار یا رسموں کا پابند ہو، نہ دوسرے اسے مطعون کریں۔

(۳) نکاح اور ولیمے کی تقریبات بھی حتی الامکان سادگی سے اپنے وسائل کی حد میں رہتے ہوئے منعقد کی جائیں، اور صاحبِ تقریب کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے خاندانی یا مالی حالات کے مطابق جس کو چاہے دعوت دے، اور جس کو چاہے، دعوت نہ دے، اس معاملے میں بھی کسی کو کوئی سنجیدہ شکایت نہیں ہونی چاہئے۔

(۴) نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ ہمارے سامنے رہے کہ ,,سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں زیر باری کم سے کم ہو،، یعنی جس میں انسان نہ مالی طور پر زیر بار ہو، اور نہ بیجا مشقت و محنت کے کسی بوجھ میں مبتلا ہو۔

۱۹/جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ

۱۵/اکتوبر ۱۹۹۵ء

سورج گرہن

ماہرینِ فلکیات نے اعلان کیا ہے کہ ۲۴ر اکتوبر کو پاکستان میں سورج گرہن ہوگا، ملک کے بعض علاقوں میں یہ گرہن مکمل ہوگا، اور بعض علاقوں میں جزوی۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں اتنا بڑا گرہن تقریباً دوسو سال بعد ہو رہا ہے، سورج کو گہن لگنے کا ظاہری سبب یہ ہے کہ زمین اور سورج کے درمیان چاند حائل ہو جاتا ہے، اور اسکی وجہ سے سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ پاتی، گویا چاند کا سایہ زمین پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے تاریکی چھا جاتی ہے، اگر سورج گرہن مکمل ہو تو دن کے وقت بالکل رات کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات آسمان پر ستارے نظر آنے لگتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ گہن کی حالت میں چاند کا جو سایہ زمین پر پڑتا ہے، وہ تقریباً ڈیڑھ سو میل میں پھیلا ہوا ہوتا ہے، اور تقریباً بیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کی مسافت طے کرتا ہے، زمین کے جو حصے اس سائے کی زد میں آتے جاتے ہیں، وہاں گہن نظر آتا ہے، یہاں تک کہ جب چاند سورج کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو اسکا سایہ غائب ہو جاتا ہے، گہن کھل جاتا ہے، اور سورج کی روشنی معمول کے مطابق زمین تک پہنچنی شروع ہو جاتی ہے۔

یہ بھی اللہ تعالی کی حکمتِ بالغہ کا کرشمہ ہے کہ سورج اپنی جسامت میں چاند سے چار سو گنا زیادہ ہے، لہذا عام حالات میں چاند سورج کو ڈھانپ نہیں سکتا، لیکن ساتھ ہی زمین سے چاند کا فاصلہ سورج کے مقابلے میں چار سو گنا کم ہے، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ دونوں جسم سائز میں برابر نظر آتے ہیں، اور جب چاند سورج کی محاذات میں پہنچتا ہے تو وہ اسے

پوری طرح ڈھانپ لیتا ہے، پوری طرح ڈھانپنے کی اسی کیفیت کو مکمل گرہن کہتے ہیں، یہ مکمل گرہن عموماً چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں ہوتا، اور ماہرین کے مطابق تاریخ میں مکمل گرہن کی حالت زیادہ سے زیادہ سات منٹ ریکارڈ کی گئی ہے، لیکن مکمل گرہن سے نکلنے کے بعد بھی جزوی گرہن کی حالت بہت دیر تک قائم رہ سکتی ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کے لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ یا تو کسی بڑے آدمی کے انتقال کے موقع پر چاند یا سورج کو گہن لگتا ہے، یا پھر چاند اور سورج کا گہن اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ کسی بڑے آدمی کا انتقال ہونے والا ہے، یا کوئی اور خطرناک واقعہ پیش آنے والا ہے، آنخضرت ﷺ نے اس توہم پرستی کی سختی سے تردید فرمائی، اتفاق سے ۱۰ھ میں جب آنخضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات ہوئی تو اسی دن مدینہ منورہ میں سورج کو گرہن لگ گیا، بعض لوگ اپنے قدیم خیال کے مطابق یہ سمجھنے لگے کہ یہ گہن آپ ﷺ کے صاحبزادے کی وفات کی وجہ سے لگا ہے، اس موقع پر آنخضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور اس غلط خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ,,چاند اور سورج کو کسی شخص کی موت یا زندگی کی وجہ سے گہن نہیں لگتا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں،،۔

ہمارے اوپر چھائی ہوئی اس پر اسرار کائنات میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں، ان میں سے بہت سے واقعات وہ ہیں جن کے اسباب و نتائج ہمیں سائنس کی محیر العقول ترقی کے باوجود آج تک معلوم نہیں ہو سکے، (بلکہ اکثریت ایسے ہی واقعات کی ہے) اور بہت سے واقعات ایسے ہیں کہ ان کے کم از کم ظاہری اسباب ہمارے علم میں آچکے ہیں، لیکن جو کچھ سائنس کے ذریعے ہمارے علم میں آیا ہے، وہ ان واقعات کا ظاہری سبب ہے، مگر ان ظاہری اسباب کے پیچھے ان تمام واقعات کی اصل علت و حکمت کیا ہے؟ اسکا پتہ ہم اپنی دوربینوں اور مشاہدۂ کائنات کے جدید ترین آلات کے ذریعہ نہیں لگا سکتے۔ اگر زمین سے

چاند کا فاصلہ چار سو گنے سے زائد ہو تا تو بھی سورج کو مکمل گرہن نہ لگتا یا اگر سورج کا سائز چاند کے مقابلے میں چار سو گنے سے زائد ہو تا، تب بھی چاند اسے نہ ڈھانپ سکتا، سوال یہ ہے کہ سورج کو چاند سے چار سو گنا بڑا بنا کر زمین سے اس کے فاصلے کا تناسب بھی سورج کے مقابلے میں وہی چار سو گنا کم کس نے رکھا؟ اور کیوں رکھا؟ پھر چاند زمین اور دوسرے سیاروں کی گردش کا ایسا حساب کس نے اور کیوں بنایا کہ ایک مخصوص تاریخ اور وقت پر کسی مخصوص خطے میں گہن واقع ہو تا ہے، دوسری جگہوں اور دوسرے اوقات میں یہ واقعہ پیش نہیں آتا؟ قرآن کریم نے سورۂ الرحمٰن میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ ,, سورج اور چاند ایک حساب کے ماتحت ہیں،، یہی وجہ ہے کہ اگر حساب لگانے میں کوئی غلطی نہ ہو تو سالہا سال پہلے یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ پر سورج کو گہن لگے گا، (چین کے بادشاہ چنگ کیانگ نے ۲۱۳ق م میں دو شاہی نجومیوں کو اس لئے قتل کرادیا تھا کہ وہ گہن کی صحیح پیش گوئی نہیں کر سکتے تھے) وہ کون ہے جس نے یہ جچا تلا حساب مقرر کر کے ان محیر العقول اجرام فلکی کو اس حساب کے تابع بنادیا؟ وہ کون ہے جس نے گردشوں کا یہ نظام اس طرح طے کیا کہ فلاں وقت پر فلاں جگہ ہی گہن نظر آئے؟ اور ان مخصوص مقامات یا مخصوص اوقات کے انتخاب میں کیا راز پنہاں ہے؟

ان سوالات کا ایک سطحی جواب عام طور سے یہ دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاق (Coincidence) کا کرشمہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں غیر شعوری اتفاق کوئی چیز نہیں، کائنات کا کوئی ذرّہ اللہ تعالی کی حکمتِ بالغہ کے بغیر حرکت نہیں کرتا، ہمیں چونکہ اپنی محدود عقل کے سہارے اس حرکت کی حکمت و مصلحت کا علم نہیں ہوتا، اس لئے ہم اپنی لاعلمی کو اتفاق کے پردے میں چھپا لیتے ہیں، ورنہ ان تمام اتفاقی واقعات کی کوئی نہ کوئی حکمت وہاں موجود ہے جہاں سے پوری کائنات کا نظام کنٹرول ہو رہا ہے، اب جن لوگوں کی نگاہیں ان واقعات کے صرف ظاہری اسباب تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں، ان کے لئے تو

کائنات کے یہ نظارے ایک دلچسپ تماشے سے زائد کچھ نہیں، لیکن جس شخص کی نگاہ ان ظاہری اسباب سے اوپر بھی جاتی ہے، وہ ان واقعات کو اللہ تعالی کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کا دھیان تازہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے، ان واقعات کے جو ظاہری اسباب تجربے اور مشاہدے سے معلوم ہو جاتے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام انہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، کیونکہ ان اسباب تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالی نے انسان کو عقل تجربے اور مشاہدے کا سرمایہ عطا کیا ہے، جو اسے استعمال کرنا چاہیئے اس کے لئے وحی کی رہنمائی ضروری نہیں، لیکن انبیاء کرام علیہم السلام ان ظاہری اسباب سے اوپر کی ان باتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں، جن تک پہنچنے میں عقلِ انسانی ناکام رہتی ہے، اور اس ناکامی کو اتفاق کا نام دے کر مطمئن ہو جاتی ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس غلط عقیدے کی تو تردید فرمائی کہ چاند سورج کو کسی شخص کے مرنے جینے سے کوئی تعلق ہے، لیکن اسکی یہ سائنسی وجہ بیان فرمانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ چاند کے بیچ میں حائل ہونے سے سورج گرہن ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا تعلق خالصۃً تجربے اور مشاہدے سے تھا، اس کے بجائے آپ ﷺ نے ظاہری سبب سے اوپر کی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جسے انسان ایسے موقع پر فراموش کر جاتا ہے، اور وہ یہ کہ یہ اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔

اللہ تعالی کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کے اسی استحضار واعتراف کی ایک عملی صورت آنحضرت ﷺ نے یہ بتائی کہ جب سورج گرہن ہو تو نمازِ کسوف ادا کی جائے۔

"کسوف" عربی میں سورج گرہن کو کہتے ہیں، اور "نمازِ کسوف" کے معنی ہیں گرہن کی نماز۔ ۱۰ھ میں جب مدینہ منورہ میں سورج گرہن ہوا تو آنحضرت ﷺ نے اعلان کرا کر لوگوں کو نماز کیلئے جمع فرمایا، پھر شاید اپنی مبارک زندگی کی سب سے لمبی نماز باجماعت کی امامت فرمائی جس میں قیام، رکوع اور سجدہ غرض ہر رکن معمول سے کہیں زیادہ طویل تھا، نماز کے بعد آپ ﷺ نے جو خطبہ دیا اس میں یہ ہدایت بھی دی کہ آئندہ

جب کبھی سورج کو گرہن لگے تو مسلمانوں کو نمازِ کسوف ادا کرنی چاہیئے۔

"نمازِ کسوف"، سنت مؤکدہ ہے، بلکہ بعض فقہاء نے اسے واجب کہا ہے، لہذا ۲۴ر اکتوبر کو اس نماز کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے یہ نماز ہر اس جگہ باجماعت ادا کی جاسکتی ہے جہاں جمعہ ہوتا ہے، اس کے لئے اذان یا اقامت مسنون نہیں، البتہ لوگوں کو جمع کرنے کے لئے عام لفظوں میں اعلان کیا جاسکتا ہے، آنحضرت ﷺ نے نمازِ کسوف کے موقع پر جو اعلان فرمایا تھا، اس کے الفاظ یہ تھے، "الصلاۃ جامعۃ"، (نماز با جماعت ہونے والی ہے) لیکن اس اعلان کے یہ الفاظ شرعاً مقرر نہیں، دوسرے لفظوں میں بھی اعلان کیا جاسکتا ہے۔

نماز کسوف کی دو رکعتیں ہوتی ہیں، اور عام نمازوں ہی کی طرح پڑھی جاتی ہیں، ان کا کوئی الگ طریقہ مقرر نہیں ہے، البتہ سنت یہ ہے کہ امام اس میں طویل قراءت کرے، طویل رکوع کرے، اور طویل سجدے کرے، آنحضرت ﷺ نے ایک رکعت میں تقریباً پوری سورۂ بقرہ کی تلاوت فرمائی تھی، یہ قراءت دن کی دوسری نمازوں کی طرح آہستہ بھی ہوسکتی ہے، اور اگر مقتدیوں کی اکتاہٹ کا اندیشہ ہو تو رات کی نمازوں کی طرح بلند آواز سے بھی ہوسکتی ہے، نماز کے بعد سورج کے گہن سے نکلنے تک دعا اور ذکر و تسبیح کرتے رہنا مستحب ہے، نیز گہن کے دن آنحضرت ﷺ نے صدقہ کثرت سے دینے کی بھی ترغیب دی ہے۔

اگر کوئی شخص کسی وجہ سے نمازِ کسوف کی جماعت میں شامل نہ ہوسکے تو گھر میں یا جہاں کہیں ہو، تنہا بھی یہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور خواتین کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے گھروں میں تنہا یہ نماز ادا کریں، دو رکعتیں نمازِ کسوف کی نیت سے پڑھیں، اور اس میں جتنی لمبی سورتیں یاد ہوں، وہ پڑھیں، لمبے رکوع کریں، لمبے سجدے کریں، اور باقی وقت زیادہ سے زیادہ دعا اور ذکر و تسبیح میں صرف کریں۔

۲۶ر جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ
۲۲/ اکتوبر ۱۹۹۵ء

مہرِ شرعی کی حقیقت

پچھلے دنوں ایک نکاح نامہ میری نظر سے گذرا جس میں ,,مہر،، کے خانے میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی ,,مبلغ بتیس روپیہ مہر شرعی،، اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لوگوں سے بات چیت کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ وہ خدا جانے کس وجہ سے بتیس روپے کو مہر شرعی سمجھتے ہیں اور یہ تأثر تو بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے کہ مہر جتنا کم سے کم رکھا جائے، شریعت کی نگاہ میں اتنا ہی مستحسن ہے، اس کے علاوہ بھی مہر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں، جن کا ازالہ ضروری ہے۔

,,مہر،، دراصل ایک اعزازیہ (Honorarium) ہے جو ایک شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے، اور اسکا مقصد عورت کا اعزاز واکرام ہے، نہ تو یہ عورت کی قیمت ہے جسے ادا کر کے یہ سمجھا جائے کہ وہ شوہر کے ہاتھوں بک گئی، اور اب اسکی حیثیت ایک کنیز کی ہے، اور نہ یہ محض ایک فرضی کاروائی ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے عملاً ادا کرنے کی ضرورت نہیں، شوہر کے ذمے بیوی کا مہر لازم کرنے سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو اپنے گھر میں لائے تو اس کا مناسب اکرام کرے، اور اسے ایک ایسا ہدیہ پیش کرے جو اس کے اعزاز واکرام کے مناسب ہوا، لہٰذا شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی رقم نہ تو اتنی کم رکھی جائے جس میں اعزاز واکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو، اور نہ اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اسے ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور بالآخر یا تو مہر ادا کئے بغیر دنیا

سے رخصت ہو جائے یا آخر میں بیوی سے معاف کرانے پر مجبور ہو۔

شرعی نقطہ نظر سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے "مہر مثل" ادا کیا جائے، "مہر مثل" کا مطلب مہر کی وہ مقدار ہے جو اس عورت کے خاندان میں عام طور سے اس جیسی خواتین کے نکاح کے وقت مقرر کی جاتی رہی ہو، اور اگر اس عورت کے خاندان میں دوسری عورتیں نہ ہوں تو خاندان سے باہر اس کے ہم پلہ خواتین کا جو مہر عام طور سے مقرر کیا جاتا ہو، وہ اس عورت کا مہر مثل ہے، اور شرعی اعتبار سے بیوی مہر مثل وصول کرنے کی حق دار ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو، یا مہر کا ذکر کئے بغیر نکاح کر لیا گیا ہو تو مہر مثل خود بخود لازم سمجھا جاتا ہے، اور شوہر کے ذمے شرعاً ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بیوی کو اس کا مہر مثل ادا کرے، البتہ اگر بیوی خود مہر مثل سے کم پر خوش دلی سے راضی ہو جائے یا شوہر خوش دلی سے مہر مثل سے زیادہ مہر مقرر کر لے تو باہمی رضامندی سے مہر مثل سے کم یا زیادہ مہر مقرر کر لینا بھی شرعاً جائز ہے، لیکن یہاں بھی شریعت نے زیادہ سے زیادہ مہر کی تو کوئی حد مقرر نہیں کی، البتہ کم سے کم مہر کی حد مقرر کر دی ہے، اور وہ حد (حنفی موقف کے مطابق) دس درہم ہے، دس درہم کا مطلب دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے جو آج کل کی قیمتوں کے لحاظ سے دو سو روپے کے لگ بھگ بنتی ہے، اس کم سے کم مقدار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنا مہر رکھنا شرعاً پسندیدہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے کم مہر پر اگر خود عورت بھی راضی ہو جائے تو شریعت راضی نہیں ہے، کیونکہ اس سے مہر کا مقصد، یعنی عورت کا اعزاز واکرام پورا نہیں ہوتا، یہ کم سے کم حد بھی ان لوگوں کا خیال کر کے رکھی گئی ہے جو مالی اعتبار سے کمزور ہیں، اور زیادہ رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں، ان کے لئے یہ گنجائش پیدا کر دی گئی ہے کہ اگر عورت راضی ہو تو کم از کم اس مقدار پر نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ شریعت کو منظور ہی یہ ہے کہ مہر کی مقدار دو

سو روپے رکھی جائے، اور اسے اس معنی میں مہر شرعی قرار دیا جائے، جن لوگوں نے آج کے دور میں بتیس روپیہ مہر باندھ کر اسے مہر شرعی قرار دیا، انہوں نے دو غلطیاں کیں، ایک غلط تو یہ کی کہ دس درہم کی قیمت کسی زمانے میں بتیس روپیہ رہی ہو گی، انہوں نے اسے ہمیشہ کے لئے بتیس روپیہ ہی سمجھ لیا، دوسری غلطی یہ کی کہ شریعت نے مہر کی جو کم سے کم مقدار مقرر کی تھی، اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ شرعاً پسندیدہ ہی یہ ہے کہ اس سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، حالانکہ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم مقرر فرمایا تھا، جو ۱۳۱ تولہ تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے، اور آج کل کے لحاظ سے اسکی قیمت نو دس ہزار روپیہ کے قریب بنتی ہے، خود آپ ﷺ نے اپنی متعدد ازواجِ مطہرات کا مہر بھی اس کے قریب قریب ہی مقرر فرمایا، جو اوسط درجے کے لحاظ سے ایک قابل لحاظ مقدار ہے۔

بعض حضرات اس مہر فاطمی ہی کو مہر شرعی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور غالباً ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنا پسندیدہ نہیں، یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فریقین مہر فاطمی کے برابر مہر مقرر کریں اور نیت یہ ہو کہ آنحضرت ﷺ کی مقرر کی ہوئی مقدار بابرکت اور معتدل ہو گی، نیز یہ کہ اس سے اتباع سنت کا اجر ملنے کی توقع ہے، تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے، لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ مقدار اس معنی میں مہر شرعی ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مقرر کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں یہ اصول مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز و اکرام بھی ہو، اور وہ شوہر کی استطاعت سے باہر بھی نہ ہو، جن بزرگوں نے بہت زیادہ مہر باندھنے سے منع کیا، ان کا مقصد یہی تھا کہ اگر استطاعت سے

زیادہ مہر مقرر کرلیا جائے تو وہ محض ایک کاغذی کارروائی ہو کر رہ جاتی ہے، حقیقت میں اسے دینے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی، اور مہر ادا نہ کرنے کا گناہ شوہر کی گردن پر رہ جاتا ہے، دوسرے بعض اوقات بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کے پیچھے دکھاوے کا جذبہ بھی کار فرما ہوتا ہے، اور لوگ محض اپنی شان و شوکت کے اظہار کے لئے غیر معمولی مہر مقرر کر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہیں، اس لئے متعدد بزرگوں نے غیر معمولی مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے، لیکن اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے، حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ تقریر کے دوران لوگوں سے کہا کہ وہ نکاح میں بہت زیادہ مہر نہ باندھا کریں اس پر ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ قرآن کریم نے ایک جگہ مہر کے لئے ,,قنطار،، (سونے یا چاندی کا ڈھیر) کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاندی کا ڈھیر بھی مہر ہو سکتا ہے، پھر آپ زیادہ مہر مقرر کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے خاتون کی بات سن کر فرمایا کہ واقعی خاتون کا استدلال درست ہے اور زیادہ مہر باندھنے سے کلی طور پر منع کرنا درست نہیں۔ مطلب یہی تھا کہ اگر دکھاوا مقصود نہ ہو، اور ادائیگی کی نیت بھی ہو اور استطاعت بھی، تو زیادہ مہر مقرر کرنا بھی جائز ہے، البتہ ان میں سے کوئی بات مفقود ہو تو ناجائز۔

جب مہر کا ذکر چل نکلا تو ایک اور نکتے کی وضاحت بھی ہو جائے، مہر کی دو قسمیں مشہور ہیں: ,,مہر معجل،، اور ,,مہر مؤجل،، یہ الفاظ چونکہ صرف نکاح کی مجلس ہی میں سنائی دیتے ہیں اس لئے بہت سے لوگوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا، شرعی اعتبار سے ,,مہر معجل،، اس مہر کو کہتے ہیں جو نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمے لازم ہو جاتا ہے، اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ یا تو نکاح کے وقت ہی بیوی کو ادا کر دے، یا اس کے بعد جتنی جلد ممکن ہو، عورت کو بھی ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس کا مطالبہ کر لے، چونکہ

ہمارے معاشرے میں خواتین عام طور سے مطالبہ نہیں کرتیں، اس لئے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اسکی ادائیگی ہمارے لئے ضروری نہیں، بلکہ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کا انتظار کئے بغیر بھی جس قدر جلد ممکن ہو اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

,,مہر مؤجل،، اس مہر کو کہا جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لئے فریقین نے آئندہ کی کوئی تاریخ متعین کر لی ہو، جو تاریخ اس طرح متعین کر لی جائے، اس سے پہلے اسکی ادائیگی شوہر کے ذمے لازم نہیں ہوتی، نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے، لہذا مہر کے موبل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اسکی ادائیگی کیلئے کوئی تاریخ نکاح کے وقت ہی مقرر کر لی جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور سے کوئی تاریخ مقرر کئے بغیر صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنا مہر مؤجل ہے، اور ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہر کی یہ مقدار اس وقت واجب الاداء ہوگی جب نکاح ختم ہوگا، چنانچہ اگر طلاق ہو جائے تب مہر مؤجل کی ادائیگی لازم ہوگی، یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تب اسکی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ قابل ذکر ہے کہ ہمارے معاشرے میں شوہر کی طرف سے دلہن کو جو زیور چڑھایا جاتا ہے اس کا بذات خود مہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق یہ زیور دلہن کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ اسے عارضی استعمال کے لئے دیا جاتا ہے، چنانچہ بیوی اسے شوہر کی اجازت کے بغیر نہ فروخت کر سکتی ہے نہ کسی کو تحفے میں دے سکتی ہے، نہ کسی اور کام میں لگا سکتی ہے نیز یہی وجہ ہے کہ اگر خدانخواستہ طلاق کی نوبت آجائے تو شوہر یہ زیور واپس لے لیتا ہے، لہذا اس زیور سے مہر ادا نہیں ہوتا، ہاں اگر شوہر بیوی سے صراحتاً یہ کہہ دے کہ یہ زیور میں نے بطور مہر تمہاری ملکیت میں دیدیا، تو پھر اسے مہر میں شمار کر سکتے ہیں، اس صورت میں بیوی اس زیور کی مالک بن کر اس میں ہر

طرح کا تصرف کر سکتی ہے، اور اسے کسی بھی حالت میں اس سے واپس نہیں لیا جا سکتا۔

بہر صورت! یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مہر کا تعین محض ایک فرضی یا رسمی کارروائی نہیں ہے، جو سوچے سمجھے بغیر کر لی جائے، بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جو پوری سنجیدگی کا متقاضی ہے، یہ ایک معاملے کی بات ہے، شرعاً اس کے تمام پہلو صاف اور واضح ہونے چاہییں، اور اس کی معاملے کے مطابق ادائیگی کی فکر کرنی چاہئے، یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اس حق کی ادائیگی سے ساری عمر بے فکر رہنے کے بعد بسترِ مرگ پر بیوی سے اسکی معافی حاصل کر لی جائے، جب ماحول کے جبر سے اس کے پاس معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

۱۸/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
۱۲/ نومبر ۱۹۹۵ء

کچھ جہیز کے بارے میں

چند سال پہلے شام کے ایک بزرگ شیخ عبدالفتاح ہمارے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک مقامی دوست بھی اسی وقت آگئے، اور جب انہوں نے ایک عرب بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو ان سے دُعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ میری دو بیٹیاں شادی کے لائق ہیں دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شادی کے اسباب پیدا فرمادے۔ شیخ نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے لئے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ رشتہ تو دونوں کا ہو چکا ہے، لیکن میرے پاس اتنے مالی وسائل نہیں ہیں کہ ان کی شادی کرسکوں، شیخ نے یہ سن کر انتہائی حیرت سے پوچھا وہ آپ کی لڑکیاں ہیں یا لڑکے ہیں؟ کہنے لگے کہ: لڑکیاں ہیں، شیخ نے سراپا تعجب بن کر کہا لڑکیوں کی شادی کے لئے مالی وسائل کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے پاس انہیں جہیز میں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے، شیخ نے پوچھا جہیز کیا ہوتا ہے؟ اس پر حاضرینِ مجلس نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ رواج ہے کہ باپ شادی کے وقت اپنی بیٹی کو زیورات، کپڑے، گھر کا اثاثہ اور بہت سا ساز و سامان دیتا ہے اسے جہیز کہتے ہیں، اور جہیز دینا باپ کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، جس کے بغیر لڑکی کی شادی کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا، اور لڑکی کی سسرال والے بھی اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شیخ نے یہ تفصیل سنی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے، اور کہنے لگے کہ کیا بیٹی کی شادی کرنا کوئی جرم ہے جس کی یہ سزا باپ کو دی جائے؟ پھر انہوں نے

بتایا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی کوئی رسم نہیں ہے، اکثر جگہوں پر تو یہ لڑکے کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ اپنے گھر میں دلہن کو لانے سے پہلے گھر کا اثاثہ اور دلہن کی ضروریات فراہم کر کے رکھے، لڑکی کے باپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا، اور بعض جگہوں پر رواج یہ ہے کہ لڑکی کی ضروریات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے سامان تو باپ ہی خریدتا ہے، لیکن اسکی قیمت لڑکا ادا کرتا ہے، البتہ باپ اپنی بیٹی کو رخصت کے وقت کوئی مختصر تحفہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن وہ بھی کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس واقعے سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ ہمارے معاشرے میں جہیز کو جس طرح بیٹی کی شادی کا ایک ناگزیر حصہ قرار دے لیا گیا ہے، اسکے بارے میں عالم اسلام کے دوسرے علاقوں کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

جیسا کہ شیخ کے حوالے سے پیچھے بیان کیا گیا، شرعی اعتبار سے بھی جہیز کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اسے کوئی تحفہ اپنی استطاعت کے مطابق دینا چاہے تو دیدے، اور ظاہر ہے کہ تحفہ دیتے وقت لڑکی کی آئندہ ضروریات کو مدّ نظر رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے، لیکن نہ وہ شادی کے لئے کوئی لازمی شرط ہے، نہ سسرال والوں کو کوئی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں، اور اگر کسی لڑکی کو جہیز نہ دیا جائے یا کم دیا جائے تو اس پر برا منائیں یا لڑکی کو مطعون کریں، اور نہ یہ کوئی دکھاوے کی چیز ہے کہ شادی کے موقع پر اس کی نمائش کر کے اپنی شان وشوکت کا اظہار کیا جائے، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے میں جو غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

(۱) جہیز کو لڑکی کی شادی کیلئے ایک لازمی شرط سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب تک جہیز دینے کے لئے پیسے نہ ہوں، لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی، ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی لڑکیاں اسی وجہ سے بن بیاہی رہتی ہیں کہ باپ کے پاس انہیں دینے کے لئے جہیز

نہیں ہوتا، اور جب شادی سر پر آہی جائے تو جہیز کی شرط پوری کرنے کے لئے باپ کو بعض اوقات روپیہ حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں، اور وہ رشوت، جعلسازی، دھوکہ فریب اور خیانت جیسے جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی باپ اتنا باضمیر ہے کہ ان ناجائز ذرائع کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم اپنے آپ کو قرض ادھار کے شکنجے میں جکڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

(۲) جہیز کی مقدار اور اسکے لئے لازمی اشیاء کی فہرست میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، اب جہیز محض ایک بیٹی کے لئے باپ کا تحفہ نہیں ہے جو وہ اپنی خوش دلی سے اپنی استطاعت کی حد میں رہ کر دے، بلکہ معاشرے کا ایک جبر ہے، چنانچہ اس میں صرف بیٹی کی ضروریات ہی داخل نہیں، بلکہ اسکے شوہر کی ضروریات پوری کرنا اور اسکے گھر کو مزین کرنا بھی ایک لازمی حصہ ہے، خواہ لڑکی کے باپ کا دل چاہے یا نہ چاہے، اسے یہ تمام لوازم پورے کرنے پڑتے ہیں۔

(۳) بات صرف اتنی نہیں ہے کہ لڑکی کی ضروریات پوری کر کے اس کا دل خوش کیا جائے، بلکہ جہیز کی نمائش کی رسم نے یہ بھی ضروری قرار دیدیا ہے کہ جہیز ایسا ہو جو ہر دیکھنے والے کو خوش کر سکے، اور ان کی تعریف حاصل کر سکے۔

(۴) جہیز کے سلسلے میں سب سے گھٹیا بات یہ ہے کہ لڑکی کا شوہر یا اس کی سسرال کے لوگ جہیز پر نظر رکھتے ہیں، بعض جگہ تو شاندار جہیز کا مطالبہ پوری ڈھٹائی سے کیا جاتا ہے، اور بعض جگہ اگر صریح مطالبہ نہ ہو، تب بھی توقعات یہ باندھی جاتی ہیں کہ دلہن اچھا سا جہیز لے کر آئیگی، اور اگر یہ توقعات پوری نہ ہوں تو لڑکی کو طعنے دے دے کر اس کا ناک میں دم کر دیا جاتا ہے۔

جہیز کے ساتھ اس قسم کی جو رسمیں اور تصورات نتھی کر دیئے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں جنم لیتی رہی ہیں، ان کا احساس ہمارے معاشرے کے اہل فکر

میں مفقود نہیں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے، بعض تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں، بلکہ سرکاری سطح پر بعض قوانین بھی بنائے گئے ہیں، اور ان کوششوں کا یہ اثر بحمد للہ ضرور ہوا ہے کہ اب جہیز کے بارے میں لوگوں کے بہت سے تصورات میں تبدیلی آئی ہے، جہیز کی نمائش کا سلسلہ کم ہوا ہے، بین الممالک شادیوں میں جہیز کی پابندی حالات کے جبر نے ترک کرادی ہے، لیکن ابھی تک معاشرے کے ایک بڑے حصے میں ان غلط تصورات کی حکمرانی ختم نہیں ہوئی۔

بعض حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جہیز کو قانوناً بالکل ممنوع قرار دیدیا جائے، لیکن دراصل یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے اور اس قسم کے مسائل صرف قانون کی جکڑ بند سے حل نہیں ہوتے، اور نہ ایسے قوانین پر عمل کرنا ممکن ہوتا ہے، اس کے لئے تعلیم وتربیت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک مناسب ذہنی فضا تیار کرنی ضروری ہے، بذاتِ خود اس بات میں کوئی شرعی یا اخلاقی خرابی بھی نہیں ہے، کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنے دل کے تقاضے سے اسے ایسی چیزوں کا تحفہ پیش کرے جو اس کے لئے آئندہ زندگی میں کارآمد ہوں، خود حضور اقدس ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سادگی کے ساتھ کچھ جہیز عطا فرمایا تھا، شرعی اعتبار سے اس قسم کے جہیز کے لئے کوئی مقدار بھی مقرر نہیں ہے، اگر دوسرے مفاسد نہ ہوں تو باپ اپنے دلی تقاضے کے تحت جو کچھ دینا چاہے دے سکتا ہے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ اول تو اسے نمود ونمائش کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اور دوسرے لڑکے والے عملاً اسے اپنا حق سمجھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ جہیز کی امیدیں باندھتے ہیں، اور انتہائی گھٹیا بات یہ ہے کہ اسکی کمی کی وجہ سے لڑکی اور اسکے گھر والوں کو مطعون کرتے ہیں، جہیز کی ان خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے معاشرے کے تمام طبقات کو ان تصورات کے خلاف جہاد کرنا پڑیگا، تعلیم وتربیت، ذرائع ابلاغ اور وعظ ونصیحت کے ذریعے ان تصورات کی قباحتیں مختلف

انداز واسلوب سے متواتر بیان کرنے اور کرتے رہنے کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ یہ گھٹیا باتیں ہر کس وناکس کی نظر میں ایک ایسا عیب بن جائیں جسکی اپنی طرف نسبت سے لوگ شرمانے لگیں، کسی بھی معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات یا بری عادتیں اسی طرح رفتہ رفتہ دور ہوتی ہیں کہ اس معاشرے کے اہل اقتدار، اہل علم ودانش اور دوسرے بارسوخ طبقے مل جل کر ایک ذہنی فضا تیار کرتے ہیں، یہ ذہنی فضا رفتہ رفتہ فروغ پاتی ہے، اور لوگوں کی تربیت کرتی ہے، لیکن اس کے لئے دردمند دل اور انتھک جدوجہد درکار ہے، افسوس ہے کہ ہمارے ان طبقوں کے بیشتر افراد کچھ ایسے مسائل میں الجھ گئے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح وتربیت کا کام، جو کسی بھی قوم کی تعمیر کے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، کسی شمار قطار میں نظر نہیں آتا، ذہنی تربیت اور کردار سازی کا کام سیاست اور فرقہ واریت کی ہاؤہُو میں ایسا گم ہوا ہے کہ اب اس کا نام بھی ایک مذاق معلوم ہونے لگا ہے، لیکن اس صورت حال میں مایوس ہو کر بیٹھ جانا بھی درست نہیں ایک داعیٔ حق کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے سے نہ اکتائے، اپنے دائرے کی حد تک کام کرنے سے نہ تھکے۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے جب حق وصداقت کی کشش دوسروں کو بھی اپنی طرف کھینچنا شروع کردیتی ہے، اور قوموں کی نہ صرف سوچ میں بلکہ عمل میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔

۲۵/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ

۱۹/ نومبر ۱۹۹۵ء

شادی کی دعوت اور بارات

میں پچھلے مضمون میں جہیز کے بارے میں کچھ گذارشات لکھ چکا تھا، بعد میں ایسٹن برسٹل (برطانیہ) سے ایک صاحب کا خط مجھے موصول ہوا جس میں وہ لکھتے ہیں:

,,میں آپ کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس کی ابتدا کا زمانہ متعین کرنا تو ایک تاریخ داں کا کام ہے، مگر اسکی برائی ہر شخص کے سامنے ہے، وہ ہے جہیز، جہیز کی رسم چونکہ ہندو پاک میں بسنے والے مسلمانوں میں اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ جاری ہے، اس لئے جو مسلمان وہاں سے نقل مکانی کر کے مغرب آئے تو وہ یہ رسم بھی اپنے ساتھ لائے، چنانچہ اب یہ رسم مغرب میں بھی پھیل گئی ہے، آپ سے گذارش ہے کہ ایک تو آپ اسکی شرعی حیثیت بیان فرمائیں، تاکہ یورپ میں مسلمانوں کی نئی نسل اس سے آگاہ ہو سکے، اور شاید ان ہزاروں غریب لڑکیوں کی قسمت پر بھی اس کا کچھ اثر پڑے جو صرف جہیز نہ ہونے کی بنا پر دلہن نہیں بن سکتیں، کیا جہیز ضروری ہے؟ اگر ہے تو اسکی مقدار کیا ہے؟ کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟ عموماً عورتیں اپنے حقِّ وراثت سے اسلئے دست بردار

ہو جاتی ہیں کہ انکو جہیز مل گیا ہے، اور غمی خوشی میں ان کی ماں باپ کی طرف سے مدد متوقع ہوتی ہے، اور انکی شادی پر بھی خاصا خرچ ہو چکا ہوتا ہے، مگر یہ ساری باتیں تو لڑکے پر بھی صادق آتی ہیں، پھر وہ وراثت کا کیونکر حقدار ہوگا؟

دوسرے لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟ عرب ممالک میں لڑکی کے والدین جو خرچ کرتے ہیں اسکی ادائیگی دولہا کرتا ہے، مگر ہمارے یہاں یہ تمام اخراجات والدین پر ہی کیوں ڈالے جاتے ہیں؟

تیسرے بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لڑکی کا باپ دولہا سے شادی کے اخراجات کے علاوہ بھی کچھ رقم کا تقاضا کرتا ہے، اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بلا شبہ آپ کی کتابوں سے ان گنت لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں لیکن ,,جنگ،، میں آپ نے مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ مختصر اور عام فہم ہونے کی وجہ سے زیادہ مؤثر ہے، اگر آپ میرے مذکورہ سوالات کی وضاحت ,,جنگ،، ہی کے صفحات میں فرمادیں تو امید ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا،، عبد المجید ایسٹن برسٹل برطانیہ

مکتوب نگار کے بعض سوالات کا جواب تو میرے پچھلے مضمون میں آچکا ہے، مثلاً یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جہیز ہرگز نکاح کا کوئی ضروری حصہ نہیں ہے، اور اس کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کو نکاح کے بغیر بٹھائے رکھنا ہرگز جائز نہیں، کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنی استطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے خوشی سے بیٹی کو کوئی تحفہ دینا چاہے تو وہ بے شک دے سکتا ہے، لیکن نہ اسکو نکاح کی لازمی شرط

سمجھنے کی گنجائش ہے، نہ اس میں نام و نمود کا کوئی پہلو ہونا چاہئے، اور نہ شوہر یا اسکے گھر والوں کے لئے جائز ہے کہ وہ جہیز کا مطالبہ کریں، یا اسکی توقعات باندھیں۔

اب مکتوب نگار نے جو نئی بات ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ ,, کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟،، واقعی یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں خاصی عام ہے، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جہیز کا وراثت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کسی باپ نے اپنی بیٹی پر جہیز کی صورت میں اپنی ساری کائنات بھی لٹادی ہو، تب بھی لڑکی کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا، باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنے باپ کے ترکے میں ضرور حصہ دار ہوگی، اور اس کے بھائیوں کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ سارا ترکہ خود لے بیٹھیں، اور اپنی بہن کو اس بنیاد پر محروم کردیں کہ اسے جہیز میں بہت کچھ مل چکا ہے، لڑکا ہو یا لڑکی، ان کے باپ نے اپنی زندگی میں انہیں جو کچھ دیا ہو، اس سے ان کے وراثت کے حصے میں کوئی کمی نہیں آتی، البتہ باپ کو حتی الامکان اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اپنی زندگی میں وہ اپنی اولاد کو جو کچھ دے، وہ قریب قریب برابر ہو، اور کسی ایک لڑکے یا لڑکی پر دولت کی بارش برسا کر دوسروں کو محروم نہ کرے،، لیکن یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ کسی اور موقع پر عرض کروں گا، بہر حال! یہ بات طے شدہ ہے، اور اس میں شرعی اعتبار سے کوئی ادنی شبہ نہیں، کہ لڑکی کو جہیز دینے سے اس کا حقِ وراثت ختم نہیں ہوتا، بلکہ جہیز میں دی ہوئی مالیت کو اسکے حصہ وراثت سے منہا بھی نہیں کیا جاسکتا، اسے بہر صورت ترکے سے اپنا پورا حصہ ملنا ضروری ہے۔

مکتوبِ نگار نے دوسرا مسئلہ یہ اٹھایا ہے کہ ,, لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟،، اس معاملے میں بھی ہمارے معاشرے میں افراط و تفریط پر مبنی تصورات پھیلے ہوے ہیں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح لڑکے کیلئے نکاح کے بعد ولیمہ کرنا سنت ہے، اسی طرح لڑکی کے باپ کے لئے بھی نکاح کے وقت

دعوت کرنا سنت یا کم از کم شرعی طور پر پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے، لڑکی والوں کی طرف سے کسی دعوت کا اہتمام نہ سنت ہے، نہ مستحب، بلکہ اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو صرف جائز ہے، یہی معاملہ بارات کا ہے، نکاح کے وقت دولہا کی طرف سے بارات لے جانا کوئی سنت نہیں، نہ نکاح کو شریعت نے اس پر موقوف کیا ہے، لیکن اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو بارات لے جانا کوئی گناہ بھی نہیں، لہذا بعض حضرات جو بارات لے جانے اور لڑکی والوں کی طرف سے انکی دعوت کو ایسا گناہ سمجھتے ہیں جیسے قرآن و سنت نے اس سے خاص طور پر منع کیا ہو، ان کا یہ تشدد بھی مناسب نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتدال کے ساتھ کچھ لوگ نکاح کے موقع پر لڑکی کے گھر چلے جائیں، (جس میں لڑکی کے باپ پر کوئی بار نہ ہو) اور لڑکی کے والدین اپنی بچی کے نکاح کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی خوشی میں اپنی دلی خواہش سے ان کی اور اپنے دوسرے عزیزوں دوستوں کی دعوت کر دیں تو اس میں بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن ان تمام چیزوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ان تقریبات کو نکاح کا لازمی حصہ سمجھ لیا جاتا ہے، اور جو شخص انہیں انجام دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ بھی خواہی نخواہی ان پر مجبور ہوتا ہے، اور اس غرض کے لئے بعض اوقات ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، اور بعض اوقات قرض ادھار کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے مالی حالات کی وجہ سے یہ کام نہ کرے تو اسے معاشرے میں مطعون کیا جاتا ہے۔

کسی شخص کو کوئی ہدیہ تحفہ دینا یا اسکی دعوت کرنا اگر دل کے تقاضے اور محبت سے ہو تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں، بلکہ باعث برکت ہے، بالخصوص جب نئے رشتے قائم ہو رہے ہوں تو ایسا کرنے سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ سب کچھ خلوص سے ہو، اور اپنی استطاعت کی حدود میں رہ کر ہو، لیکن جب یہ چیز نام و نمود اور دکھاوے کا ذریعہ بن جائے یا اسمیں بدلے کی طلب شامل ہو جائے، یا یہ کام خوش دلی کے

بجائے معاشرے اور ماحول کے جبر کے تحت انجام دیئے جائیں، یعنی اندر سے دل نہ چاہ رہا ہو، لیکن ناک کٹنے کے خوف سے زبردستی تحفے دیئے جائیں یا دعوتیں کی جائیں تو یہی کام جو باعثِ برکت ہو سکتے تھے الٹے گناہ، بے برکتی اور نحوست کا سبب بن جاتے ہیں، اور ان کی وجہ سے معاشرہ طرح طرح کی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ساختہ رسموں میں جکڑ کر اچھے کاموں کو بھی اپنے لئے ایک عذاب بنالیا ہے، اگر یہی کام سادگی بیساختگی اور بے تکلفی سے کئے جائیں تو ان میں کوئی خرابی نہیں، لیکن اگر رسموں کی پابندی، نام و نمود اور معاشرتی جبر کے تحت انجام دیئے جائیں تو یہ بہت بڑی برائی ہیں۔

لہذا اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کے نکاح کے وقت اپنی خوش دلی سے اسکی سسرال کے لوگوں کو، یا اپنے اعزہ اور احباب کو جمع کر کے ان کی دعوت کر دیتا ہے اور اسے نکاح کا لازمی حصہ یا سنت نہیں سمجھتا تو اسمیں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کی شکایت کی جائے یا جس کی وجہ سے اسے مطعون کیا جائے، بلکہ اس کا عمل سادگی کی سنت سے زیادہ قریب ہے، اس لئے اسکی تعریف کرنی چاہئے۔

اسکی مثال یوں سمجھئے کہ بعض لوگ اپنی اولاد کے امتحان میں کامیاب ہونے پر یا انہیں اچھی ملازمت ملنے پر خوشی کے اظہار کے لئے اپنے خاص خاص ملنے والوں کی دعوت کر دیتے ہیں، اس دعوت میں ہرگز کوئی حرج نہیں، دوسری طرف بہت سے لوگوں کے بچے امتحان میں پاس ہوتے رہتے ہیں، یا انہیں اچھی ملازمتیں ملتی رہتی ہیں لیکن وہ اس خوشی میں کوئی دعوت نہیں کرتے، ان لوگوں پر بھی معاشرے کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، نہ انہیں اس بنا پر مطعون کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دعوت کیوں نہیں کی؟ اگر یہی طرز عمل نکاح کی دعوت میں بھی اختیار کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

یعنی جس کا دل چاہے دعوت کرے اور جس کا دل نہ چاہے، نہ کرے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ نکاح میں اگر کوئی دعوت نہ کرے تو سسرال والوں کی طرف سے باقاعدہ مطالبہ ہوتا ہے، اور یوں سمجھا جاتا ہے جیسے شادی ہوئی ہی نہیں، جن بزرگوں نے بارات لے جانے اور اسکی دعوت کے اہتمام سے روکا، درحقیقت ان کے پیش نظر یہی خرابیاں تھیں، انہوں نے اس بات کی ترغیب دی کہ کم از کم کچھ بارسوخ افراد ان دعوتوں کے بغیر نکاح کریں گے تو ان لوگوں کو حوصلہ ہوگا جو انکی استطاعت نہیں رکھتے، اور صرف معاشرے کی مجبوری سے انہیں یہ کام کرنے پڑتے ہیں۔

مکتوب نگار نے آخری بات یہ پوچھی ہے کہ بعض علاقوں میں لڑکی کا باپ دولہا سے نکاح کے اخراجات کے علاوہ مزید کچھ رقم کا بھی مطالبہ کرتا ہے، اور اسکے بغیر اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتا، بے شک یہ بے بنیاد رسم بھی ہمارے معاشرے کے بعض حصوں میں خاصی رائج ہے، اور یہ شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز رسم ہے، اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کے لئے دولہا سے رقم لینے کو ہمارے فقہاء کرامؒ نے رشوت قرار دیا ہے، اور اسکا گناہ رشوت لینے کے گناہ کے برابر ہے، بلکہ اس میں ایک پہلو بے غیرتی کا بھی ہے، اور یہ عمل اپنی لڑکی کو فروخت کرنے کے مشابہ ہے، اور بعض جگہ جہاں یہ رسم پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے شوہر اسکے ساتھ زر خرید کنیز جیسا سلوک کرتا ہے، لہذا یہ رسم شرعی اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی غلط رسم ہے جو واجب الترک ہے۔

۳/ رجب ۱۴۱۶ھ

۲۶/ نومبر ۱۹۹۵ء

نکاح اور ولیمہ...... چند سوالات کا جواب

میں نے پچھلے مضامین میں شادی بیاہ اور اس کے رسم و رواج کے بعض پہلو پر کچھ گذارشات پیش کیں تو میرے پاس قارئین کی طرف سے سوالات اور تجاویز کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا، جن سے ایک تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ شادی بیاہ میں ہونے والی فضول رسموں سے کتنے پریشان ہیں اور ان کا کوئی حل چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شادی بیاہ کے بارے میں دینی معلومات سے ناواقفیت کتنی عام ہوگئی ہے کہ وہ معمولی باتیں جو مسلمان گھرانے کے ہر فرد کو معلوم ہوا کرتی تھیں اب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم نہیں ہیں، اور ان کی جگہ بہت سے بے بنیاد اور غلط مفروضوں نے لے لی ہے، تیسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان مسائل کی صحیح شرعی حیثیت جاننا چاہتے ہیں۔

ان میں سے بعض سوالات تو ایسے تھے کہ میں نے انہیں شائع کرنے کے بجائے ان کا انفرادی جواب دینا زیادہ مناسب سمجھا، لیکن ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں کہ ان کی وضاحت ان کالموں میں مناسب معلوم ہوتی ہیں تاکہ وہ وسیع پیمانے پر پڑھی جاسکیں۔ تاہم ہر خط کو اس کے الفاظ میں نقل کرنے کے بجائے میں مجموعی مضمون کے ذیل میں انشاء اللہ مطلوبہ سوالات کا جواب عرض کردونگا۔

شادی کی تقریبات میں ،،ولیمہ،، ایک ایسی تقریب ہے جو باقاعدہ سنت ہے، اور

آنحضرت ﷺ نے اس کی صراحۃً ترغیب دی ہے، لیکن اول تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دعوت کوئی فرض یا واجب نہیں جس کے چھوڑنے سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہو، ہاں یہ سنت ہے اور حتی الامکان اس پر ضرور عمل کرنا چاہیئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سنت کی ادائیگی کے لئے شرعاً نہ مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر ہے نہ کھانے کا کوئی معیار، بلکہ ہر شخص اپنی استطاعت کی حد میں رہتے ہوئے جس پیانے پر چاہے ولیمہ کر سکتا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک ولیمہ ایسا کیا جس میں صرف دو سیر جو خرچ ہوئے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر ولیمہ سفر میں ہوا، اور اس طرح ہوا کہ دستر خوان بچھادیا گیا اور اس پر کچھ کھجوریں، کچھ پنیر اور کچھ گھی رکھ دیا گیا، بس ولیمہ ہو گیا، البتہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر روٹی اور بکری کے گوشت سے دعوت کی گئی، لہذا ولیمہ کے بارے میں یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس میں مہمانوں کی کوئی بڑی تعداد ضروری ہے، یا کوئی اعلیٰ درجے کا کھانا ضرور ہونا چاہئے، اور اگر کسی شخص کے پاس خود گنجائش نہ ہو تو وہ قرض ادھار کر کے ان چیزوں کا اہتمام کرے، بلکہ شرعی اعتبار سے مطلوب یہی ہے کہ جس شخص کے پاس خود اپنے وسائل کم ہوں، وہ اپنی استطاعت کے مطابق اختصار سے کام لے، ہاں اگر استطاعت ہو تو زیادہ مہمان مدعو کرنے اور اچھے کھانے کا اہتمام کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ مقصد نام و نمود اور دکھاوا نہ ہو۔

ان حدود میں رہتے ہوئے ولیمہ بیشک مسنون ہے، اور اس لحاظ سے کار ثواب بھی، لہذا اس کے تقدس کو طرح طرح کے گناہوں سے مجروح کرنا اس کی ناقدری، بلکہ توہین کے مترادف ہے، محض شان و شوکت کے اظہار اور نام و نمود کے اقدامات، تقریب کی مصروفیات میں نمازوں کا ضیاع، سجے بنے مردوں عورتوں کا بے حجاب میل جول ان کی فلم بندی، اور اس قسم کے دوسرے منکرات اس تقریب کی برکتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں جن سے اس بابرکت تقریب کو بچانا چاہئے۔

ولیمہ کے بارے میں ایک اور غلط فہمی خاصی پھیلی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ پریشان رہتے ہیں، ایک صاحب نے خاص طور پر اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت چاہی ہے وہ غلط فہمی یہ ہے کہ اگر دولہا دلہن کے درمیان تعلقات زن وشو قائم نہ ہو پائے ہوں تو ولیمہ صحیح نہیں ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ولیمہ نکاح کے وقت سے لے کر رخصتی کے بعد تک کسی بھی وقت ہوسکتا ہے، البتہ مستحب یہ ہے کہ رخصتی کے بعد ہو، اور رخصتی کا مطلب رخصتی ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی یہ کہ دلہن دولہا کے گھر آ جائے اور دونوں کی تنہائی میں ملاقات ہو جائے، اور بس۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تعلق زن وشو قائم نہ ہوا ہو تو اس سے ولیمے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ ولیمہ ناجائز ہوتا ہے، نہ نفلی قرار پاتا ہے، اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اس طرح ولیمہ کی سنت ادا نہیں ہوتی، بلکہ اگر ولیمہ رخصتی ہی سے پہلے منعقد کرلیا جائے تب بھی ولیمہ ادا ہوجاتا ہے، صرف اس کا مستحب وقت حاصل نہیں ہوتا، (یہاں دلائل کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، جو حضرات دلائل سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ علامہ ابن حجرؒ کی فتح الباری میں صفحہ ۲۳۱ ج ۹ پر باب الولیمہ کے تحت حدیث نمبر ۵۱۶۶ کی تشریحات ملاحظہ فرمالیں)۔

ایک صاحب نے ایک اور سوال کیا ہے اور وہ یہ کہ نکاح کے وقت جب لڑکی کے گھر والے لڑکی سے ایجاب وقبول کراتے ہیں تو کیا لڑکی کا اپنی زبان سے منظوری کا اظہار کرنا ضروری ہے یا نکاح نامے پر دستخط کردینا کافی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہمارے یہاں شادیاں عموماً اس طرح ہوتی ہیں کہ دلہن خود نکاح کی محفل میں موجود نہیں ہوتی، بلکہ دلہن کے گھر والوں میں سے کوئی نکاح سے پہلے اس سے اجازت لیتا ہے، جو دلہن کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے، اور نکاح نامے میں بھی اس کا نام وکیل کے خانے میں درج ہوتا ہے، جب یہ وکیل لڑکی سے اجازت لینے جاتا ہے تو یہ نکاح کا ایجاب وقبول

نہیں ہوتا، بلکہ محض لڑکی سے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے، اس میں اجازت لینے والے کو لڑکی سے یہ کہنا چاہئے کہ میں تمہارا نکاح فلاں ولد فلاں سے اتنے مہر پر کرنا چاہتا ہوں، کیا تمہیں یہ منظور ہے؟ اگر لڑکی کنواری ہے تو اس کا زبان سے منظور ہے کہنا ضروری نہیں بلکہ اتنا بھی کافی ہے کہ وہ انکار نہ کرے، البتہ زبان سے منظوری کا اظہار کردے تو اور اچھا ہے، اور اگر صرف نکاح نامے پر دستخط کردے تو بھی اجازت ہو جاتی ہے، البتہ اگر کوئی عورت پہلے شادی شدہ رہ چکی ہے اور اب یہ اس کی دوسری شادی ہے تو اس کا زبان سے منظوری کا اظہار ضروری ہے بصورت دیگر اسے منظوری نہیں سمجھا جائے گا۔

جب لڑکی سے اس طرح اجازت لے لی جائے تو جس شخص نے اجازت لی ہے وہ بحیثیت وکیل نکاح کرنے کا اختیار نکاح خواں کو دیدیتا ہے، اور پھر نکاح خواں جو الفاظ دولہا سے کہتا ہے وہ نکاح کا ایجاب ہے، اور دولہا جو جواب دیتا ہے قبول اور ان دونوں کلمات سے نکاح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

۱۱/رجب ۱۴۱۶ھ

۴/دسمبر ۱۹۹۵ء

خطبۂ نکاح کا پیغام

ہم میں سے شاید کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو جس نے کبھی کسی نکاح کی تقریب میں حصہ نہ لیا ہو، آئے دن شادی کی تقریبات اور نکاح کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، اور تقریباً ہر محفل میں سینکڑوں افراد شریک ہوتے ہیں، ان محفلوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایجاب وقبول سے پہلے نکاح خواں ایک خطبہ پڑھتا ہے، اسکے بعد نکاح کی کارروائی ہوتی ہے، اگرچہ نکاح کی صحت کے لئے خطبہ کوئی لازمی شرط نہیں ہے، اسکے بغیر بھی دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرنے سے نکاح صحیح ہوجاتا ہے، لیکن یہ آنحضرت ﷺ کی سنت ہے کہ نکاح سے پہلے آپ ﷺ مختصر خطبہ دیتے تھے، اور اس کے ابتدائی الفاظ آپ ﷺ نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سکھائے تھے، یہی وہ الفاظ ہیں جو ہم تقریباً ہر نکاح کی محفل میں نکاح خواں کی زبانی سنتے ہیں، عام طور سے خطبے کے یہ الفاظ، ان کا مقصد اور ان کی معنویت شادی کے طربیہ ہنگاموں میں گم ہوکر رہ جاتی ہے،، انہیں بے توجہی کے ساتھ سنا جاتا ہے، اور اگر نکاح کی محفل بڑی ہو، اور لاؤڈ اسپیکر کا انتظام نہ ہو تو اکثر لوگ انہیں سن بھی نہیں پاتے، اور عین خطبہ کے وقت بھی باتیں کرتے نظر آتے ہیں، (اور یہ بھی اسی بے توجہی کا شاخسانہ ہے کہ جو لوگ نکاح کی تقریب پر ہزاروں، بلکہ بعض اوقات لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں، وہ بعض اوقات اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ تھوڑے سے پیسے مزید خرچ کرکے لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کردیں، تاکہ خطبہ اور ایجاب وقبول

جو پوری تقریب کی اصل روح ہے، وہ پرسکون اور باوقار طریقے سے انجام پا سکے، اور حاضرین ان بابرکت کلمات کو ہاؤ ہو کے بجائے تقدس کی فضا میں سن سکیں)

بہرکیف! اگر خطبہ سننے میں آ بھی جائے تو عموماً اسے محض ایک تبرک سمجھا جاتا ہے، اور عام لوگوں کے ذہن میں اسکا مقصد صرف برکت کا حصول ہوتا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں، لہذا شاید ہی کوئی صاحب ایسے ہوں جنہوں نے یہ جاننے سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ وہ کیوں اس موقع پر پڑھے جاتے ہیں؟ اور ان کا نکاح سے کیا تعلق ہے؟ چونکہ خطبے کے یہ الفاظ خود آنحضرت ﷺ سے ثابت ہیں، بلکہ آپ نے باقاعدہ سکھائے ہیں، اس لئے ہمیں ان کا مفہوم، مقصد اور پس منظر ضرور سمجھنا چاہئے، تاکہ ہم اس بابرکت سنت کی معنویت سے واقعی آگاہ ہوسکیں۔

ان الفاظ کی ابتدا تو اللہ تعالی کی حمد وثنا سے ہوتی ہے، اور بحیثیتِ مسلمان ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ہر اہم کام کا آغاز اللہ تعالی کی حمد سے کیا جائے، اس لئے کہ اس کائنات میں کوئی بھی کام اس کی توفیق کے بغیر انجام نہیں پا سکتا، نکاح دو افراد کی زندگی کا اہم ترین دوراہا ہے، جس کے ذریعہ یہ دو افراد زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں، اس موقع پر ہمیں بطور خاص یہ سکھایا گیا ہے، کہ اللہ تعالی کی حمد اور دعا سے یہ سفر شروع کریں، حمد وثنا اور دعا کے لئے جو الفاظ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے تلقین فرمائے ہیں وہ کتنے خوبصورت اور کتنے جامع ہیں، اس کا اندازہ ان کے ترجمے سے ہوسکتا ہے، اصل عربی الفاظ تو یہ ہیں:۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضلَّ له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له ونشهد أنَّ محمَّدا عبده ورسوله، صلى الله عليه وسلم

وعلى آله وأصحابه أجمعين.

اور ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اسکی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، اسی پر ایمان لاتے اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں، ہم اپنی نفسانیت کے شر سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اسی کی پناہ مانگتے ہیں، جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور ہم یہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کے تمام آل واصحاب پر اپنی رحمتیں اور سلامتی نازل فرمائے''

نکاح کے موقع پر دولہا دلہن ہی نہیں ان کے دونوں خاندان اپنی زندگی کے بڑے نازک دوراہے پر ہوتے ہیں، اگر دل مل جائیں تو زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے، اور اگر خدانہ کرے دلوں میں ملاپ نہ ہو تو دونوں خاندانوں کے لئے ایک مستقل دردسر کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس سے مدد مانگنے کی تلقین کی گئی ہے، اور چونکہ بسا اوقات ازدواجی زندگی کے فتنے خود اپنی بدطینتی یا بداعمالیوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی بداعمالیوں کے شر سے اسی کی پناہ مانگی گئی ہے، اور اسی سے اس بات کی توفیق طلب کی گئی ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائے اور گمراہی سے محفوظ رکھے۔ اور یہ ساری حمد وثنا اور دعائیں چونکہ توحید ورسالت پر مستحکم ایمان کے بغیر بے معنی ہیں، اس لئے توحید اور آنحضرت ﷺ کی گواہی

کی تجدید کرائی گئی ہے، اور آخر میں آنحضرت ﷺ پر درود و سلام بھیجا گیا ہے، کیونکہ آپ ﷺ ہی ہمارے لئے ہدایت کا یہ نور لے کر تشریف لائے۔

یہ ہیں خطبۂ نکاح کے تمہیدی الفاظ، اس کے بعد عموماً خطبے میں قرآن کریم کی تین آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہیں، پہلی آیت سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ ہے:۔

﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت اسلام ہی کی حالت میں آنی چاہئے''

دوسری آیت سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے:۔

﴿یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَاءً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا﴾

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (یعنی آدم) سے پیدا کیا، اور اسی سے اسکی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے، اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں کا پاس کرو، بے شک اللہ تمہاری نگرانی کرنے والا ہے''

تیسری آیت سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۷۰، ۷۱ ہے:۔

﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ☆ یُصْلِحْ لَکُمْ أَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا﴾

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سیدھی بات کہا کرو، اللہ تمہارے کام سنوار دے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا، اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرلی اس نے بڑی عظیم کامیابی حاصل کی“

۱۷/رجب ۱۴۱۶ھ

۱۰/دسمبر ۱۹۹۵ء

احسان اور ازدواجی زندگی

حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) ہمارے زمانے کی ان درخشاں شخصیتوں میں سے تھے جو عمر بھر شہرت، پبلسٹی اور نام ونمود سے دامن بچا کر زندگی گذارتے ہیں، لیکن ان کی سیرت وکردار کی خوشبو خود بخود دلوں کو کھینچتی اور ماحول کو معطر کرتی ہے، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اور تصوف وسلوک میں ان کے خلیفۂ مجاز تھے، چنانچہ لوگ اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لئے ان سے رجوع کرتے اور ان کی ہدایات سے فیض یاب ہوتے تھے، ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے، اور اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ,,الحمد للہ، مجھے احسان کا درجہ حاصل ہوگیا ہے،، (احسان ایک قرآنی اصطلاح ہے جس کی تشریح حدیث میں یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالی کی عبادت اس دھیان کے ساتھ کی جائے جیسے عبادت کرنے والا اللہ تعالی کو دیکھ رہا ہے، یا کم ازکم اس دھیان کے ساتھ کہ اللہ تعالی اسے دیکھ رہے ہیں) ان صاحب کا مطلب یہ تھا کہ عبادت کی ادائیگی کے دوران بحمداللہ مجھے یہ دھیان حاصل ہوگیا ہے، جسے حدیث کی اصطلاح میں احسان کہا جاتا ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے جواب میں انہیں مبارکباد دی، اور فرمایا کہ ,,احسان واقعی بڑی نعمت ہے، جس کے حاصل ہونے پر شکرادا کرنا چاہئے، لیکن میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں

کہ احسان کا یہ درجہ صرف نماز ہی میں حاصل ہوا ہے یا جب آپ اپنے بیوی بچوں سے یا دوست احباب سے کوئی معاملہ کرتے ہیں اس وقت بھی یہ دھیان باقی رہتا ہے؟،، اس پر وہ صاحب کہنے لگے کہ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ احسان کا تعلق نماز اور دوسری عبادتوں کے ساتھ ہے، لہذا میں نے تو اسکی مشق نماز ہی میں کی ہے، اور بفضلہٖ تعالی نماز کی حد تک یہ مشق کامیاب رہی ہے، لیکن نماز سے باہر زندگی کے عام معاملات میں کبھی احسان کی مشق کا خیال ہی نہیں آیا، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے آپ سے یہ سوال کیا تھا، بے شک نماز اور دوسری عبادتوں میں یہ دھیان مطلوب ہے، کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہے ہیں، لیکن اس دھیان کی ضرورت صرف نماز ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ زندگی کے ہر کام میں اسکی ضرورت ہے، انسان کو لوگوں کے ساتھ زندگی گذارتے اور ان کے ساتھ مختلف معاملات انجام دیتے ہوے بھی یہ دھیان رہنا چاہئے کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہے ہیں، خاص طور پر میاں بیوی کا تعلق ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے دم دم کے ساتھی ہوتے ہیں، اور ان کی رفاقت میں بے شمار اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، بہت سی ناگواریاں بھی پیش آتی ہیں، اور ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب انسان کا نفس اسے ان ناگواریوں کے جواب میں ناانصافیوں پر ابھارتا ہے، ایسے موقع پر اس دھیان کی ضرورت کہیں زیادہ ہے کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہے ہیں، اگر یہ احساس ایسے وقت دل میں جاگزین نہ ہو تو عموما اس کا نتیجہ ناانصافی اور حق تلفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے فرمایا کہ آنخضرت ﷺ کی سنت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تمام عمر کبھی اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ طبعی غصے اور ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ نہیں فرمایا، اور اس سنت پر عمل کی کوشش میں میں نے بھی یہ مشق کی ہے کہ میں اپنے گھر والوں پر غصہ نہ اتاروں، چنانچہ میں اللہ تعالی کے شکر کے طور پر کہتا ہوں کہ آج مجھے اپنی اہلیہ کے ساتھ رفاقت کو اکیاون سال ہو چکے ہیں لیکن اس عرصے میں الحمد للہ، میں نے کبھی ان سے لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔ بعد میں ایک مرتبہ حضرت ڈاکٹر

صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ نے ازخود حضرتؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ تمام عمر مجھے یاد نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کبھی ناگواری کے لہجے میں بات کی ہو، اور نہ کبھی مجھے یہ یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے براہِ راست اپنا کوئی کام کرنے کو کہا ہو، میں خود ہی اپنے شوق سے ان کے کام کرنے کی کوشش کرتی تھی، لیکن وہ مجھ سے نہیں کہتے تھے۔

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کی یہ باتیں آج مجھے اس لئے یاد آگئیں کہ میں نے پچھلے ہفتے خطبہ نکاح کے پیغام کی تشریح کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ پر مسرت اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے تقویٰ ضروری ہے، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ عمل (جو ہوا میں اڑنے اور پانی پر چلنے کی کرامتوں سے ہزار درجہ اونچے درجے کی کرامت ہے) درحقیقت اسی تقویٰ کا نتیجہ اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی عملی تصویر تھا کہ:

"تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کیلئے بہتر ہوں"

بے شک قرآنِ کریم نے مردوں کو عورتوں پر قوام (نگران) قرار دیا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات اور اپنے عمل سے یہ بات واضح فرمادی ہے کہ نگران ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد ہر وقت عورتوں پر حکم چلایا کرے، بیوی کے ساتھ خادمہ جیسا معاملہ کرے، یا اسے اپنی آمریت کے شکنجے میں کس کر رکھے، حقیقت یہ ہے کہ خود قرآنِ کریم نے ہی ایک دوسری جگہ میاں بیوی کے رشتے کو مودّت (دوستی) اور رحمت سے تعبیر فرمایا ہے۔

نیز اسی آیت میں شوہر کے لئے بیوی کو سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے، (سورۃ الروم آیت: ۲۱) جسکا خلاصہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان اصل رشتہ دوستی اور محبت کا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے لئے سکون اور راحت کا ذریعہ ہیں، لیکن اسلام ہی کی ایک تعلیم یہ ہے کہ جب کبھی کوئی اجتماعی کام کیا جائے تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ کسی کو اپنا امیر بنالیں، تاکہ کام نظم وضبط کے ساتھ انجام پائے، یہاں تک کہ اگر دو شخص کسی سفر پر

جار ہے ہوں تب بھی مستحسن یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں، خواہ وہ دونوں آپس میں دوست ہی کیوں نہ ہوں، اب جس شخص کو بھی امیر بنایا جائے وہ ہر وقت دوسرے پر حکم چلانے کے لئے نہیں، بلکہ سفر کے معاملات کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے امیر بنایا گیا ہے، اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھی یا ساتھیوں کی خبر گیری کرے، سفر کا ایسا انتظام کرے جو سب کی راحت وآرام کے لئے ضروری ہو، اور جب وہ یہ فرائض انجام دے تو دوسروں کا کام یہ ہے کہ وہ ان امور میں اسکی اطاعت اور اسکے ساتھ تعاون کریں۔

جب اسلام نے ایک معمولی سے سفر کے لئے بھی یہ تعلیم دی ہے تو زندگی کا طویل سفر اس تعلیم سے کیسے خالی رہ سکتا تھا؟ لہذا جب میاں بیوی اپنی زندگی کا مشترک سفر شروع کر رہے ہوں تو ان میں سے شوہر کو اس سفر کا امیر یا نگران بنایا گیا ہے، کیونکہ اس سفر کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے جو جسمانی قوت اور جو صفات درکار ہیں وہ قدرتی طور پر مرد میں زیادہ ودیعت کی گئی ہیں، لیکن اس انتظام سے یہ حقیقت ماند نہیں پڑتی کہ دونوں کے درمیان اصل تعلق دوستی، محبت اور رحمت کا تعلق ہے، اور ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کے ساتھ ایک نوکر کا سا معاملہ کرے، یا شوہر اپنے امارت کے منصب کی بنیاد پر یہ سمجھے کہ بیوی اس کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے پیدا ہوئی ہے، یا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیوی سے اپنی ہر جائز یا ناجائز خواہش کی تکمیل کرائے، بلکہ اللہ تعالی نے مرد کو جو قوت اور جو صفات عطا کی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اس منصب کو جائز حدود میں رہتے ہوئے بیوی کی دلداری میں استعمال کرے، اور اسکی جائز خواہشات کو حتی الامکان پورا کرے، اسی طرح اللہ تعالی نے بیوی کو جو مقام بخشا ہے، اور اسے جو حقوق عطا کئے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتیں اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ تعاون اور اسے خوش رکھنے میں صرف کرے، اگر دونوں یہ کام کرلیں تو نہ صرف یہ کہ گھر

دونوں کے لئے دنیوی جنت بن جاتا ہے بلکہ ان کا یہ طرز عمل مستقل عبادت کے حکم میں ہے جو آخرت کی حقیقی جنت کا وسیلہ بھی ہے، اسی لئے دونوں کو نکاح کے خطبے میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے، اور اسی لئے حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ احسان کا موقع صرف نماز ہی نہیں بلکہ میاں بیوی کے تعلقات بھی ہیں۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں سے آنحضرت ﷺ نے نکاح کے خطبے کے لئے خاص طور پر انہی تین آیات کا جو انتخاب فرمایا یقیناً اس میں کوئی بڑی مصلحت ہوگی، غور کیا جائے تو ان تینوں آیتوں میں جو بات مشترک طور پر کہی گئی ہے، وہ تقویٰ کا حکم ہے، تینوں آیتیں اسی حکم سے شروع ہو رہی ہیں، کہ تقویٰ اختیار کرو، کوئی نادان یہ کہہ سکتا ہے کہ تقویٰ کا شادی بیاہ سے کیا جوڑ؟ لیکن جو شخص حالات کے نشیب و فراز اور میاں بیوی کے تعلقات کی نزاکتوں کو جانتا ہے، اور جسے ازدواجی الجھنوں کی تہہ تک پہنچنے کا تجربہ ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات اور ایک دوسرے کے حقوق کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے لئے تقویٰ ایک لازمی شرط ہے، میاں بیوی کا رشتہ نازک ہوتا ہے، ان دونوں کے سینے میں چھپے ہوئے جذبات اور انکی حقیقی سرشت ایک دوسرے کے سامنے اتنی کھل کر آتی ہے کہ کسی اور کے سامنے اتنی کھل کر نہیں آسکتی، دوسروں کے سامنے ایک شخص اپنی بد طینتی کو ظاہری مسکراہٹوں کے پردے میں چھپا سکتا ہے، اپنے اندر کے انسان پر خوبصورت الفاظ اور اوپری خوش اخلاقی کا ملمع چڑھا سکتا ہے، لیکن بیوی کے ساتھ اپنے شب و روز کے معاملات میں وہ یہ ملمع باقی نہیں رکھ سکتا، اسے اپنی ظاہر داری کے خول سے کبھی نہ کبھی باہر نکلنا ہی پڑتا ہے، اور اگر اندر کا یہ انسان تقویٰ سے آراستہ نہ ہو تو اپنے شریک زندگی کا جینا دوبھر کر دیتا ہے، ایک بیوی کو اپنے شوہر سے جو تکلیفیں پہنچتی ہیں، ان کا ازالہ ہمیشہ عدالت کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، ان میں سے بے شمار تکلیفیں ایسی ہیں جو وہ عدالت تو کجا اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے سامنے بھی

بیان نہیں کر سکتی، اسی طرح ایک شوہر کو بیوی سے جو شکایتیں ہو سکتی ہیں بسا اوقات شوہر کے پاس ان کا کوئی حل نہیں ہوتا، نہ کسی اور کے ذریعے وہ انہیں دور کرنے کا کوئی سامان کر سکتا ہے، اس قسم کی تکلیفوں اور شکایتوں کا کوئی علاج دنیا کی کوئی طاقت فراہم نہیں کر سکتی، ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دونوں کے دل میں تقوی ہو، یعنی وہ اس احساس کی دولت سے مالا مال ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے لئے امانت ہیں، اور اس امانت کی جواب دہی انہیں اپنے اللہ کے سامنے کرنی ہے، اپنے شریک زندگی کو اپنے کسی طرزِ عمل سے ستا کر وہ شاید دنیا کی جواب دہی سے بچ جائیں، لیکن ایک دن آئیگا جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے، اور انہیں اپنی ایک ایک حق تلفی کا بھگتان بھگتنا پڑے گا، اسی احساس کا نام تقوی ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل پر ان تنہائیوں میں بھی پہرہ بٹھاتی ہے، جہاں اسے کوئی اور دیکھنے والا نہیں ہوتا، آنحضرت ﷺ یہ چاہتے ہیں کہ جب دو مرد و عورت زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے ساتھی بنیں تو وہ روانہ ہونے سے پہلے اپنے دلوں پر یہ غیبی پہرہ بٹھالیں، تاکہ انکی دوستی پائیدار ہو، اور ان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت محض وقتی نفسانیت کی پیداوار نہ ہو، جو نئی نویلی زندگی کا جوش ٹھنڈا ہونے کے بعد فنا ہو جائے، بلکہ وہ تقوی کے سائے میں پلی ہوئی پائیدار محبت ہو جو خود غرضی سے پاک اور ایثار، وفا اور خیر خواہی کے سدا بہار جذبات سے مزین ہوتی ہے، اور جسم سے گذر کر واقعی قلب وروح کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتی ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے نکاح کے خطبے میں ان تین آیات کا انتخاب فرمایا جن میں سے ہر آیت تقوی کے حکم سے شروع ہو رہی ہے، اور وہی اسکا بنیادی پیغام ہے۔

۲۵/ رجب ۱۴۱۶ھ

۱۸/ دسمبر ۱۹۹۵ء

خاندانی نظام

عائلی زندگی معاشرے کا وہ بنیادی پتھر ہے جس پر تہذیب وتمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر معاشرے میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ توڑ پھوڑ اور افراتفری کا شکار ہو، تو خواہ زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل وجواہر برآمد ہو رہے ہوں، زندگی سکون سے محروم ہو جاتی ہے۔ آج یورپ اور امریکہ کی وہ دنیا جو سیاسی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے لئے قابلِ رشک سمجھی جاتی ہے، خاندانی نظام کی توڑ پھوڑ کی وجہ سے اسی سنگین مسئلے سے دوچار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت کی ریل پیل اور تیز رفتار مادی ترقی کے باوجود لوگ ایک انجانے اضطراب کا شکار ہیں، اپنی اندرونی بے چینی سے گھبرا کر کوئی یوگا کے دامن میں پناہ لے رہا ہے، کوئی منشیات اور خواب آور دواؤں میں سکون ڈھونڈ رہا ہے، اور بالآخر جب ان میں سے کوئی چیز اس بے چینی کا علاج نہیں کر پاتی، تو آخری چارۂ کار کے طور پر لوگ خودکشی کر رہے ہیں، اور خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے میں سوئٹزرلینڈ میں تھا، میرے میزبانوں نے آمد ورفت کے لئے جس گاڑی کا انتظام کیا تھا، اس کا ڈرائیور ایک اطالوی نسل کا تعلیم یافتہ آدمی تھا، اور انگریزی روانی سے بول لیتا تھا، وہ چند روز میرے ساتھ رہا، اسکی عمر تقریباً چالیس سال کو پہنچ رہی تھی، لیکن ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی، میرے وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا

کہ ہمارے معاشرے میں شادی اکثر اس لئے بے مقصد ہو جاتی ہے کہ شادی کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان زندگی کی پائیدار رفاقت کا تصور بہت کمیاب ہے، اس کے بجائے شادی ایک رسمی تعلق کا نام رہ گیا ہے، جس کا مقصد بڑی حد تک ایک دوسرے سے مالی فوائد حاصل کرنا ہوتا ہے، بہت سی خواتین شادی کے بعد جلد ہی طلاق حاصل کر لیتی ہیں، اور یہاں کے قوانین کے مطابق شوہر کی جائیداد کا بڑا حصہ ہتھیا کر اسے دیوالیہ کر جاتی ہیں، اور یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ کونسی عورت صرف شوہر کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے شادی کر رہی ہے، اور کون وفاداری سے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے، اس نے حسرت بھرے انداز میں یہ بات کہہ کر ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی کیا کہ آپ کے ایشیائی ممالک میں شادی واقعی بامقصد ہوتی ہے، اس سے ایک جما ہوا خاندان وجود میں آتا ہے، جس کے افراد آپس میں دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں، ہم ایسے خاندانی ڈھانچے سے محروم ہوتے جارہے ہیں، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین یا بہن بھائی تمہیں اچھی بیوی کی تلاش میں مدد نہیں دیتے؟ اس نے یہ سوال بڑے تعجب کے ساتھ سنا، اور کہنے لگا کہ "میرے والدین تو رخصت ہو چکے، بہن بھائی ہیں، لیکن ان کا میری شادی سے کیا تعلق؟ ہر شخص اپنے مسائل کو خود ہی حل کرتا ہے، میری تو ان سے ملاقات کو بھی سال گذر جاتے ہیں"

یہ ایک ڈرائیور کے تأثرات تھے، (واضح رہے کہ یورپ کے سفید فام ڈرائیور بھی اکثر پڑھے لکھے اور بعض اوقات خاصے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، جس ڈرائیور کا میں نے ذکر کیا اسکا نام آرلینڈو تھا، وہ گریجویٹ تھا، اور تاریخ، جغرافیہ اور بہت سے سماجی معاملات پر اسکا مطالعہ خاصا تھا) ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے ذاتی حالات کی وجہ سے کچھ مبالغے سے بھی کام لیا ہو، لیکن مغرب میں خاندانی ڈھانچے کی ٹوٹ پھوٹ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر زیادہ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بات پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے

مغرب کے اہل فکر اس پر ماتم کر رہے ہیں، اور جوں جوں اسکا علاج کرنا چاہتے ہیں اتنی ہی تیز رفتاری سے خاندان کا ڈھانچہ مزید تباہی کی طرف جا رہا ہے۔

سابق سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف اب دنیا کے سیاسی منظر سے تقریباً غائب ہو چکے، لیکن ان کی کتاب Perestroika جو انہوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں لکھی تھی، نہ صرف سوویت یونین، بلکہ پورے مغرب کے سماجی اور معاشی نظام پر ایک جرأت مندانہ تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے بعض حصوں میں آج بھی غور و فکر کا بڑا سامان ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے خواتین اور خاندان (Women and Family) کے عنوان سے خاندانی نظام کی شکست و ریخت پر بھی بحث کی ہے، انہوں نے شروع میں لکھا ہے کہ تحریکِ آزادیٔ نسواں کا یہ پہلو تو بے شک قابلِ تعریف ہے کہ اس کے ذریعے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملے، عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے قابل ہوئیں، اور اس کے نتیجے میں ہماری معاشی پیداوار میں اضافہ ہوا، لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"But over the years of out difficult and heroic history, we failed to pay attention to women's specific rights and needs arising from their role as mother and home- maker, and their indispensable educational function as regards children. Engaged in scientific research, working on construction sites, in production and in the services, and involved in creative activities, women no longer have enough

time to perform their everyday duties at home housework, the upbringing of children and the creation of a good family atmosphere. We have discovered that many of our problems in children's and young people's behavior, in our morals, culture and in production are partially caused by the weakening of family ties and slack attitude to family responsibilities. This is a paradoxical result of our sincere and politically justified desire to make women equal with man in every thing. Now, in the course of perestroika, we have begun to overcome this shortcoming. That is why we are now holding heated debates in the press, in public organizations at work and at home, about the question of what we shaould do to make it possible for women to return to their purely womanly mission.

ف ”لیکن اپنی مشکل اور جرأت مندانہ تاریخ کے پچھلے سالوں میں ہم خواتین کے ان حقوق اور ضروریات کی طرف توجہ دینے میں ناکام رہے جو ایک ماں اور گھر ستین کی حیثیت میں، نیز بچوں کی تعلیم

وتربیت کے سلسلے میں ان کے ناگزیر کردار سے پیدا ہوتے ہیں، خواتین چونکہ سائنسی تحقیق میں مشغول ہوگئیں، نیز زیرتعمیر عمارتوں کی دیکھ بھال میں، پیداواری کاموں اور خدمات میں اور دوسری تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہیں، اس لئے ان کو اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ خانہ داری کے روزمرہ کے کام انجام دے سکیں، بچوں کی پرورش کرسکیں، اور ایک اچھی خاندانی فضا پیدا کرسکیں، اب ہمیں اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ ہمارے بہت سے مسائل جو بچوں اور نوجوانوں کے رویے، ہماری اخلاقیات، ثقافت اور پیداواری عمل سے تعلق رکھتے ہیں، اس وجہ سے بھی کھڑے ہوے ہیں کہ خاندانی رشتوں کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے، اور خاندانی فرائض کے بارے میں ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پروان چڑھا ہے، ہم نے عورتوں کو ہر معاملے میں مردوں کے برابر قرار دینے کی جو مخلصانہ اور سیاسی اعتبار سے درست خواہش کی تھی، یہ صورت حال اس کا تضاد آفرین نتیجہ ہے، اب اپنی تعمیر نو کے دوران ہم نے اس خامی پر قابو پانے کا عمل شروع کردیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم پریس میں، عوامی تنظیمات میں، کام کے مقامات میں، اور خود گھروں میں ایسے گرما گرم مباحثے منعقد کررہے ہیں جن میں اس سوال پر بحث کی جارہی ہے کہ عورت کو اس کے خالص نسوانی مشن کی طرف واپس لانے کے لئے ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہییں؟''

(Perestroica, p.117 ed. 1987)

یہ ایک ایسے سیاسی لیڈر کا تبصرہ ہے جس کے معاشرے میں خاندان سے متعلق یا

مرد وعورت کے حقوق وفرائض کے بارے میں کسی قسم کی مذہبی اقدار کا کوئی تصور یا تو موجود نہیں ہے، یا اگر ہے تو اسکی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، لہذا خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ پر اس کا اظہارِ افسوس کسی اعلیٰ آسمانی ہدایت کے زیر اثر نہیں، بلکہ اس کے صرف ان نقصانات کی بنا پر ہے جو ٹھیٹھ مادی زندگی میں اسے آنکھوں سے محسوس ہوئے، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم صرف ظاہری اور مادی یا دنیوی نفع ونقصان کے نہیں، بلکہ ان آسمانی ہدایات کے بھی پابند ہیں، جو قرآن وسنت کے واسطے سے ہمارے لئے واجب العمل ہیں، لہذا خاندانی نظام کی ابتری صرف ہمارا سماجی اور معاشرتی نقصان ہی نہیں ہے، بلکہ ہمارے عقیدے ہمارے نظریۂ حیات اور ہمارے دین کے لحاظ سے ایک بہت بڑا فساد ہے جو ایک مسلم معاشرے میں کسی بھی طرح قابل برداشت نہیں۔

جب سے ہمارے درمیان مغربی افکار کا ایک سیلاب اٹدا ہے، اور بالخصوص جب سے ٹی وی، وڈیو اور انگریزی فلموں کی بہتات نے ہمارے معاشرے پر ثقافتی یلغار شروع کی ہے، اس وقت سے ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر انہی معاشرتی تصورات کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کی داغ بیل مغرب نے ڈالی تھی۔ الحمد للہ! ابھی ہمارا خاندانی نظام درہم برہم نہیں ہوا، لیکن جس رفتار سے مغربی ثقافت ہمارے درمیان پھیل رہی ہے، انگریزی فلموں کے سیلاب نے مغربی طرز زندگی کو جس طرح گھر گھر اور گاؤں گاؤں پھیلا دیا ہے، جس طرح بے سوچے سمجھے خواتین کو گھروں سے نکالنے اور انہیں ایک عامل معیشت (Factor of production) بنانے پر زور دیا جا رہا ہے، اور گھر اور خاندان کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے جس تیزی کے ساتھ دوری اختیار کی جا رہی ہے، وہ مستقبل میں ہمارے خاندانی نظام کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے جس کی روک تھام آج ہی سے ضروری ہے، اور اس روک تھام کا طریقہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات کی ٹھیک ٹھیک پیروی کے سوا کچھ نہیں جو نہ مشرقی ہیں نہ مغربی، جن کا مأخذ ومنبع وحی الٰہی ہے، اور وہ

ایک ایسی ذات کی وضع کردہ تعلیمات ہیں جو انسان کے حال و مستقبل کی تمام ضروریات سے بھی پوری طرح باخبر ہے، اور انسانی نفس کی ان چوریوں کو بھی خوب جانتی ہے جو زہر ہلاہل پر قند و شکر کی تہیں چڑھانے میں مہارتِ تامہ رکھتی ہے، لہٰذا ہمارا کام وقت کے ہر چلتے ہوئے نعرے کے پیچھے چل پڑنا نہیں ہے، بلکہ اسے قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ہمارے مزاج و مذاق کے مطابق ہے یا نہیں؟ جب تک ہم میں یہ جرأت اور یہ بصیرت پیدا نہ ہوگی، ہم باہر کی ثقافتی یلغار کے لئے ایک تر نوالہ بنے رہیں گے، اور ہماری اجتماعی زندگی کی ایک ایک چول رفتہ رفتہ ہلتی چلی جائیں گی۔

۱۹/ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ

۸/ مئی ۱۹۹۶ء

نکاح اور برادری

شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ ابھی تک اپنے خود ساختہ خیالات کے بندھن میں کس بری طرح جکڑے ہوے ہیں، اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات سے غفلت اور ناواقفیت کتنی عام ہوچکی ہے؟ اس کا اندازہ ان مختلف قضیوں سے ہوتا رہتا ہے جو لوگ شرعی حل معلوم کرنے کے لئے بکثرت میرے سامنے لاتے رہتے ہیں، ابھی ایک خاتون نے امریکہ سے مجھے ایک طول طویل خط میں اپنی درد بھری داستان لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والد ایک کروڑ پتی آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں، لیکن ان کو یہ اصرار تھا کہ وہ اپنی کسی بیٹی کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے، خاتون نے لکھا ہے کہ میں ان کی بڑی بیٹی ہوں، اور شروع میں مجھ سے شادی کرنے کے لئے کئی رشتے آئے، لیکن میرے والد نے ہر رشتہ کو یہ کہ کر انکار کردیا کہ یہ برادری سے باہر کا رشتہ ہے، اس لئے ان کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ یہاں تک کہ میری عمر زیادہ ہوتی چلی گئی، اور بالآخر رشتے آنے بند ہوگئے، یہاں تک کہ ایک روز میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ اب میرے لئے تمہارا کوئی رشتہ اپنی برادری سے حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لہذا اب تم میرے سامنے یہ حلف اٹھاؤ کہ عمر بھر شادی نہیں کروگی، میں چونکہ مالدار آدمی ہوں، لہذا جیتے جی تمہاری کفالت کروں گا، لیکن مجھے یہ کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے کہ تمہاری شادی برادری سے باہر ہو، خاتون کہتی ہیں کہ والد صاحب نے مجھے یہ اقرار کرنے پر اتنا

مجبور کیا کہ بالآخر میں نے یہ وعدہ کر لیا کہ تمام عمر شادی نہیں کروں گی، اور اسکے بعد واقعۃ میں نے یہ تہیہ بھی کر لیا کہ اپنے والد کی خواہش کے احترام میں زندگی اسی طرح گذار دوں گی، لیکن میری چھوٹی بہن، ایک بھائی اور والدہ اس فیصلے پر راضی نہیں ہوئے، ایک صاحب جنہوں نے عرصہ دراز پہلے میرے لئے رشتہ مانگا تھا، اور والد صاحب نے انہیں سختی سے انکار کر دیا تھا، ابھی تک مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ تھے، میرے بھائی بہن نے ان سے بات کی، اور والد صاحب کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی، آخر کار والد صاحب نے اتنا تو کہدیا کہ اگر تم لوگ یہ نکاح کرنا ہی چاہتے ہو تو میں نکاح کرادونگا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اسکے بعد لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، بہن نے مجھ سے والد صاحب کی یہ بات چھپائی اور صرف اتنا کہا کہ وہ ناراض تو ہیں، مگر نکاح پر آمادہ ہوگئے ہیں، چنانچہ یہ نکاح ہو گیا، اور میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی آئی، لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ والد صاحب نے عمر بھر کے لئے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے، نہ وہ مجھ سے فون پر بات کرنے کے لئے تیار ہیں نہ مجھے اپنی بیٹی تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

یہ واقعہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات اکثر دیکھنے سننے میں آتی رہتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہیں، یہ درست ہے کہ شریعت نے نکاح کے معاملے میں ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے، لیکن اسکا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے اس لئے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو، ان کے رہن سہن، ان کے طرزِ فکر اور ان کے مزاج میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آئے، لیکن اول تو کفو کی اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کفو میں کوئی رشتہ نہ ملے تو یہ قسم کھالی جائے کہ اب زندگی بھر شادی ہی نہیں ہو سکے گی، دوسرے کفو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خاص اپنی برادری ہی میں رشتہ کیا جائے، اور برادری کے باہر سے

جو بھی رشتے آئیں، انہیں غیر کفو قرار دیا جائے، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں:

(۱) ہر وہ شخص کسی لڑکی کا کفو ہے جو اپنے خاندانی حسب نسب، دین داری اور پیشے کے لحاظ سے لڑکی اور اس کے خاندان کا ہم پلہ ہو، یعنی کفو میں ہونے کے لئے اپنی برادری کا فرد ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص کسی اور برادری کا ہے، لیکن اسکی برادری بھی لڑکی کی برادری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے، تو وہ بھی لڑکی کا کفو ہے، کفو سے باہر نہیں ہے، مثلاً سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی بلکہ تمام قریشی برادریاں آپس میں ایک دوسری کیلئے کفو ہیں، اسی طرح جو مختلف عجمی برادریاں ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں مثلاً راجپوت، خان وغیرہ وہ بھی اکثر ایک دوسری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہیں، اور ایک دوسری کے لئے کفو ہیں۔

(۲) بعض احادیث وروایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھاسکیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے، یا یہ کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً درست نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اسکے اولیاء کفو سے باہر نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو کفو سے باہر کیا ہوا نکاح بھی شرعاً منعقد ہوجاتا ہے، اور اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ کوئی ناجائز بات، لہذا اگر کسی لڑکی کا رشتہ کفو میں میسر نہ آرہا ہو، اور کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہاں شادی کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

(۳) شریعت نے یہ ہدایت ضرور دی ہے کہ لڑکی کو نکاح بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہئے (خاص طور سے اگر کفو سے باہر نکاح کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر

ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی یہ چاہئے کہ وہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی عمر بھر شادی سے محروم ہو جائے، اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد اور لغو حرکت ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ایک حدیث میں حضور سرور کونین ﷺ کا ارشاد ہے:

,,إذا جاء كم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه الا تفعلوا تكن فتنة في الارض وفساد كبير،،

جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کر دو، اگر تم ایسا نہیں کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا۔

(۴) اسی ضمن میں یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں میں عام ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید گھرانے میں نہیں ہوسکتا، یہ بات بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، ہمارے عرف میں ''سید'' ان حضرات کو کہتے ہیں جن کا نسب بنی ہاشم سے جا ملتا ہو، چونکہ حضور سرور کونین ﷺ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے بلاشبہ اس خاندان سے نسبی وابستگی ایک بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن شریعت نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی کہ اس خاندان کی کسی لڑکی کا نکاح باہر نہیں ہوسکتا، بلکہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا، نہ صرف شیوخ، بلکہ تمام قریشی نسب کے لوگ بھی شرعی اعتبار سے سادات کے کفو ہیں، اور ان کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ قریش سے باہر کے خاندانوں میں بھی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے۔

۲۶/ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ

۱۵/مئی ۱۹۹۶ء

طلاق کا صحیح طریقہ

میرا مختلف حیثیتوں میں عام مسلمانوں کے خاندانی، بالخصوص ازدواجی تنازعات سے کافی واسطہ رہا ہے، اور یہ دیکھ کر دکھ ہوتا رہا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ جو سامنے کی باتیں پہلے بچے بچے کو معلوم ہوتی تھیں، اب بڑے بڑوں کو بھی معلوم نہیں ہوتیں، اسی لئے چند ماہ پہلے میں نے اس کالم میں شادی بیاہ کے مسائل اور اس سے متعلق بنیادی شرعی احکام کی وضاحت شروع کی تھی، جو مختلف عنوانات کے تحت کئی ہفتے جاری رہی، جب نکاح کا ذکر چھڑا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ,,طلاق،، کے بارے میں کچھ گذارشات پیش کر دی جائیں، کیونکہ طلاق کے بالکل ابتدائی احکام سے بھی عام لوگ ناواقف ہو چکے ہیں، اور اس بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں عام ہو چکی ہیں۔

سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے طلاق کو غصہ نکالنے کا ایک ذریعہ سمجھا ہوا ہے، جہاں میاں بیوی میں کوئی اختلاف پیش آیا، اور نوبت غصے اور اشتعال تک پہنچی، شوہر نے فوراً طلاق کے الفاظ زبان سے نکال دیئے، حالانکہ طلاق کوئی گالی نہیں ہے جو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے دیدی جائے، یہ نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا وہ انتہائی اقدام ہے جس کے نتائج بڑے سنگین ہیں، اس سے صرف نکاح کا رشتہ ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ خاندانی زندگی کے بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، میاں بیوی ایک دوسرے

کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں، بچوں کی پرورش کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، املاک کی تقسیم میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، مہر، نفقہ اور عدت کے معاملات پر اس کا اثر پڑتا ہے، غرض نہ صرف میاں بیوی، بلکہ ان کی اولاد، بلکہ پورے خاندان پر اس کے دور رس اثرات پڑتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاں طلاق کی اجازت دی ہے، وہاں اسے "ابغض المباحات،، قرار دیا ہے، یعنی یہ وہ چیز ہے جو جائز کاموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہے، عیسائی مذہب کا اصل تصور یہ تھا کہ میاں بیوی جب ایک مرتبہ نکاح کے رشتے میں بندھ جائیں تو اب طلاق دینے یا لینے کا کوئی راستہ نہیں ہے، بائبل میں تو طلاق کو بدکاری کے برابر قرار دیا گیا ہے، اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لئے اس نے طلاق کے بارے میں یہ سخت موقف تو اختیار نہیں کیا، اس لئے کہ میاں بیوی کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مرحلے پیش آجاتے ہیں، جب دونوں کے لئے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ شرافت کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، ایسے موقع پر نکاح کے رشتے کو ان پر زبردستی تھوپے رکھنا دونوں کی زندگی کو عذاب بنا سکتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ عیسائی مذہب طلاق کے بارے میں اپنے اس قدیم موقف پر قائم نہیں رہ سکا، جس کی داستان بڑی طویل اور عبرتناک ہے) اس لئے اسلام نے طلاق کو ناجائز یا حرام تو قرار نہیں دیا، اور نہ اس کے ایسے لگے بندھے اسباب متعین کئے جو علیحدگی کے معاملے میں میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں، لیکن اول تو آنحضرت ﷺ نے صاف صاف فرمادیا کہ مباح (جائز) چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے، دوسرے میاں بیوی کو ایسی ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے تو طلاق کی نوبت کم سے کم آئے، تیسرے اگر طلاق کی نوبت آہی جائے تو اسکا ایسا طریقہ بتایا ہے جس میں خرابیاں کم سے کم ہوں، آج اگر لوگ ان ہدایات اور احکام کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور ان پر عمل

کریں تو نہ جانے کتنے گھریلو تنازعات اور خاندانی مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔

جہاں تک ان ہدایات کا تعلق ہے جو طلاق کے سد باب کے لئے دی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی ہدایت تو آنحضرت ﷺ نے یہ دی ہے کہ اگر کسی شوہر کو اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے، تو اسے اسکی اچھی باتوں پر بھی غور کرنا چاہئے، مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بے عیب نہیں ہوتا، اگر کسی میں ایک خرابی ہے تو دس اچھائیاں بھی ہوسکتی ہیں، ایک خرابی کو لے بیٹھنا اور دس اچھائیوں سے آنکھ بند کر لینا انصاف کے بھی خلاف ہے، اور اس سے کوئی مسئلہ حل بھی نہیں ہوسکتا، بلکہ قرآنِ کریم نے تو یہاں تک فرمادیا کہ ,,اگر تمہیں اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے تو (یہ سوچو) کہ شاید تم جس چیز کو برا سمجھ رہے ہو، اللہ تعالی نے اس میں تمہارے لئے کوئی بڑی بھلائی رکھی ہو،، (سورۂ نساء:۱۹)

دوسری ہدایت قرآن کریم نے یہ دی ہے کہ جب میاں بیوی آپس میں اپنے اختلافات طے نہ کرسکیں اور نرم وگرم ہر طریقہ آزمانے کے بعد بھی تنازعہ برقرار رہے تو فوراً علیحدگی کا فیصلہ کرنے کے بجائے دونوں کے خاندان والے ایک ایک شخص کو ثالث بنائیں، اور یہ دونوں طرف کے نمائندے آپس میں ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لے کر میاں بیوی کے درمیان تنازعہ ختم کرنے کی کوشش کریں، ساتھ ہی اللہ تعالی نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر یہ دونوں نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالی ان کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا۔

(سورۂ نساء:۳۵)

لیکن اگر یہ تمام کوششیں بالکل ناکام ہوجائیں اور طلاق ہی کا فیصلہ کرلیا جائے تو اللہ تعالی نے قرآن کریم میں یہ حکم دیا ہے کہ شوہر اس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرے، مناسب وقت کی تشریح آنحضرت ﷺ نے یہ فرمائی ہے کہ طلاق اس وقت دی جائے جب بیوی طہر کی حالت میں ہو، یعنی اپنے ماہانہ نسوانی دورے سے فارغ ہوچکی ہو، اور فراغت کے بعد سے دونوں کے درمیان وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی نوبت نہ آئی ہو، لہذا اگر

عورت طہر کی حالت میں نہ ہو تو ایسے وقت طلاق دینا شرعاً گناہ ہے، نیز اگر طہر ایسا ہو کہ اس میں میاں بیوی کے درمیان ازدواجی قربت ہو چکی ہو، تب بھی طلاق دینا شرعاً نہیں، ایسی صورت میں طلاق دینے کے لئے شوہر کو اگلے مہینے تک انتظار کرنا چاہئے۔

اس طریقِ کار میں یوں تو بہت سی مصلحتیں ہیں، لیکن ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ طلاق کسی وقتی منافرت یا جھگڑے کا نتیجہ نہ ہو، شوہر کو مناسب وقت کے انتظار کا حکم اس لئے بھی دیا گیا ہے کہ اس عرصے میں وہ تمام حالات پر اچھی طرح غور کرلے، اور جس طرح نکاح سوچ سمجھ کر ہوا تھا، اسی طرح طلاق بھی سوچ سمجھ کر ہی دی جائے، چنانچہ عین ممکن ہے کہ اس انتظار کے نتیجے میں دونوں کی رائے بدل جائے، حالات بہتر ہو جائیں، اور طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔

پھر اگر مناسب وقت آجانے پر بھی طلاق کا ارادہ برقرار رہے تو شریعت نے طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ بتایا ہے کہ شوہر صرف ایک طلاق دے کر خاموش ہو جائے، اس طرح ایک رجعی طلاق ہو جائیگی، جس کا حکم یہ ہے کہ عدت گذر جانے پر نکاح کا رشتہ شرافت کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گا، اور دونوں اپنے اپنے مستقبل کے لئے کوئی فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

اس طریقے میں فائدہ یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اگر مرد کو اپنی غلطی کا احساس ہو، اور وہ یہ سمجھے کہ حالات اب بہتر ہو سکتے ہیں تو وہ عدت کے دوران اپنی دی ہوئی طلاق سے رجوع کر سکتا ہے، جس کے لئے زبان سے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "میں نے طلاق سے رجوع کرلیا"، اس طرح نکاح کا رشتہ خود بخود تازہ ہو جائے گا، اور اگر عدت بھی گذر گئی ہو اور دونوں میاں بیوی یہ سمجھیں کہ اب انہوں نے سبق سیکھ لیا ہے، اور آئندہ وہ مناسب طریقے پر زندگی گذار سکتے ہیں تو ان کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے دوبارہ از سر نو نکاح کرلیں (جس کے لئے نیا ایجاب و قبول، گواہ اور مہر سب ضروری ہے)۔

اگر مذکورہ سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوے میاں بیوی نے پھر سے نکاح کا رشتہ تازہ کرلیا ہو، اور پھر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہوجائے، تب بھی دوسری طلاق دینے میں جلدی نہ کرنی چاہئے، بلکہ ان تمام ہدایات پر عمل کرنا چاہئے جواوپر بیان ہوئیں، ان تمام ہدایات پر عمل کے باوجود اگر شوہر پھر طلاق ہی کا فیصلہ کرے تو اس مرتبہ بھی ایک ہی طلاق دینی چاہئے، اب مجموعی طور پر دو طلاقیں ہوجائیں گی، لیکن معاملہ اسکے باوجود میاں بیوی کے ہاتھ میں رہے گا۔

یعنی عدت کے دوران شوہر پھر رجوع کرسکتا ہے، اور عدت گذرنے کے بعد دونوں باہمی رضامندی سے تیسری بار پھر نکاح کرسکتے ہیں۔

یہ ہے طلاق کا وہ طریقہ جو قرآن وحدیث میں بیان ہوا ہے، اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قرآن وسنت نے نکاح کے رشتے کو برقرار رکھنے اور اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لئے درجہ بہ درجہ کتنے راستے رکھے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص ان تمام درجوں کو پھلانگ جائے تو پھر نکاح وطلاق آنکھ مچولی کا کوئی کھیل نہیں ہے جو غیر محدود زمانے تک جاری رکھا جائے، لہذا جب تیسری طلاق بھی دیدی جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اب نکاح کو تازہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں، اب نہ شوہر رجوع کرسکتا ہے، نہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے نیا نکاح کرسکتے ہیں، اب دونوں کو علیحدہ ہونا ہی پڑے گا۔

ہمارے معاشرے میں طلاق کے بارے میں انتہائی سنگین غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ تین سے کم طلاقوں کو طلاق ہی نہیں سمجھا جاتا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا لفظ صرف ایک یا دو مرتبہ لکھا جائے تو اس سے طلاق ہی نہیں ہوتی، چنانچہ جب کبھی طلاق کی نوبت آتی ہے تو لوگ تین طلاقوں سے کم پر بس نہیں کرتے، اور کم سے کم تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا طلاق صرف ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہوجاتی ہے، بلکہ شریعت کے مطابق طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ

یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہا یا لکھا جائے، اس طرح طلاق تو ہو جاتی ہے، لیکن اگر بعد میں سوچ سمجھ کر نکاح کا رشتہ تازہ کرنا ہو تو اسکے دروازے کسی کے نزدیک مکمل طور پر بند نہیں ہوتے، بلکہ ایک ساتھ تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا شرعاً گناہ ہے، اور حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں فقہی مکاتبِ فکر کے نزدیک اس گناہ کی ایک سزا یہ ہے کہ اس کے بعد رجوع یا نئے نکاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، اور جو لوگ ان فقہی مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اکثر تین طلاقیں ایک ساتھ دینے کے بعد شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہذا طلاق کے معاملے میں سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے طلاق نہیں ہوتی، اور یہ بات اچھی طرح لوگوں میں عام کرنی ضروری ہے کہ طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، اگر عدت کے دوران شوہر کے رجوع کا حق ختم کرنا مقصود ہو تو ایک طلاق بائن دیدی جائے، یعنی طلاق کے ساتھ بائن کا لفظ بھی ملا لیا جائے تو شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کرنے کا حق نہیں رہے گا، البتہ باہمی رضامندی سے دونوں میاں بیوی جب چاہیں نیا نکاح کرسکیں گے۔ یہ بات کہ طلاق کا احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک طلاق دی جائے، پوری امت میں مسلم ہے، اور اس میں کسی مکتب فکر کا اختلاف نہیں ہے، ضرورت ہے کہ علماء کرام اپنے خطبوں میں اس مسئلے کو عوام کے سامنے واضح کریں، اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی طلاق کے یہ احکام لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

۵/محرم ۱۴۱۷ھ

۲۳/مئی ۱۹۹۶ء

دنیا کے اُس پار
(۱)

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس سوال کا قطعی اور یقینی جواب صرف قرآنِ کریم اور متواتر احادیث ہی سے معلوم ہوسکتا ہے آج کوئی بھی شخص اپنے مشاہدے کی بنیاد پر اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، اس لئے کہ جو شخص واقعۂ موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے وہ پلٹ کر یہاں نہیں آتا۔

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

لیکن چند سال پہلے ایک کتاب میرے مطالعے میں آئی جس میں کچھ ایسے لوگوں کے دلچسپ تجربات ومشاہدات جمع کئے گئے ہیں جو موت کی دہلیز تک پہنچ کر واپس آ گئے، اور انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ انہوں نے موت کے دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھا؟ کتاب کا نام ہے Life after Life (زندگی کے بعد زندگی) اور یہ ایک امریکی ڈاکٹر ریمنڈ اے مودی (Raymond A. Moodi) کی لکھی ہوئی ہے، ڈاکٹر مودی اصلاً فلسفے کے پی ایچ ڈی ہیں پھر انہوں نے میڈیکل سائنس کے مختلف شعبوں میں کام کیا ہے، بالخصوص نفسیات اور فلسفۂ ادویہ سے انہیں خصوصی شغف ہے۔ ان صاحب کو سب سے پہلے ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر جارج ریچی کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ ڈبل نمونیا کے دوران ایک مرحلے پر وہ موت کے بالکل قریب پہنچ گئے، اور پھر ڈاکٹروں نے مصنوعی تنفس وغیرہ

کے آخری طریقے (Resuscitation) استعمال کئے، جس کے بعد وہ واپس آئے، اور صحتمند ہوگئے، صحت مند ہونے کے بعد انہوں نے بتایا کہ جب انہیں مردہ سمجھ لیا گیا تھا، اس وقت انہوں نے کچھ عجیب و غریب مناظر کا مشاہدہ کیا،ڈاکٹر مودی کو اس قسم کے چند مزید واقعات علم میں آئے، تو انہوں نے اہمیت کے ساتھ ایسے لوگوں کی جستجو اور ان سے ملاقاتیں شروع کیں، یہاں تک کہ تقریباڈیڑھ سو افراد سے انٹرویو کے بعد انہوں نے یہ کتاب لکھی یہ کتاب جب شائع ہوئی تو اسکی تیس لاکھ کاپیاں ایک ہی سال میں فروخت ہو گئیں،ڈاکٹر مودی نے اس کے بعد بھی اس مسئلے کی مزید تفتیش جاری رکھی، اور اسکے بعد اس موضوع پر مزید کئی کتابیں لکھیں، ان میں سے تین کتابیں میں تین چار سال پہلے امریکہ سے خرید لایا تھا، انکے نام یہ ہیں:

1. Life After Life
2. The Light Beyond
3. Reflections on Life After Life

اور جو کچھ میں آگے بیان کر رہا ہوں، وہ ان تینوں کتابوں سے ماخوذ ہے، ان تینوں کتابوں میں صرف ان لوگوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں جنہیں بیماری کی انتہائی شدت میں مردہ (Clinically dead) قرار دے دیا گیا، لیکن ایسی حالت میں آخری چارۂ کار کے طور پر ڈاکٹر صاحبان دل کی مالش اور مصنوعی تنفس دلانے کی جو کوششیں کرتے ہیں، وہ ان پر کامیابی سے آزمائی گئیں، اور وہ واپس ہوش میں آگئے، ڈاکٹر مودی کا کہنا ہے کہ جن لوگوں سے انہوں نے انٹرویو کیا وہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے، اور مختلف جگہوں کے باشندے تھے، ان میں سے ہر ایک نے اپنی نظر آنے والی کیفیت کو اپنے اپنے طریق پر بیان کیا، کسی نے کوئی بات زیادہ کہی، کسی نے کوئی بات کم بتائی، لیکن بحیثیت مجموعی جو مشترک باتیں (Common elements) ان میں سے تقریباً ہر شخص کے

بیان میں موجود تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

"ایک شخص مرنے کے قریب ہے، اسکی جسمانی حالت ایسی حد پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ خود سنتا ہے کہ اس کے ڈاکٹر نے اس کے مردہ ہونے کا اعلان کردیا، اچانک اسے ایک تکلیف دہ سا شور سنائی دیتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ انتہائی تیز رفتاری سے ایک طویل اور اندھیری سرنگ میں جارہا ہے، اسکے بعد اچانک وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے جسم سے باہر آگیا ہے، وہ اپنے ہی جسم کو فاصلے سے ایک تماشائی بن کر دیکھتا ہے، اسے نظر آتا ہے کہ وہ خود کسی نمایاں جگہ پر کھڑا ہے، اور اس کا جسم جوں کا توں چارپائی پر ہے، اور اسکے ڈاکٹر جسم پر جھکے ہوے اس کے دل کی مالش کررہے ہیں، یا مصنوعی تنفس دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

تھوڑی دیر میں وہ اپنے حواس بجا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نئی حالت میں بھی اس کا ایک جسم ہے، لیکن وہ جسم اس جسم سے بالکل مختلف ہے، جو وہ چھوڑ آیا ہے، اسکی کیفیات بھی مختلف ہیں، اور اس کو حاصل قوتیں بھی کچھ اور طرح کی ہیں، اسی حالت میں کچھ دیر بعد اسے اپنے وہ عزیز اور دوست نظر آتے ہیں جو مر چکے تھے، اور پھر اسے ایک نورانی وجود (being of light) نظر آتا ہے، جو اس سے یہ کہتا ہے کہ تم اپنی زندگی کا جائزہ لو، اس کا یہ کہنا ماوراء الفاظ (nonverbal) ہوتا ہے، اور پھر وہ خود اس کے سامنے تیزی سے اس کی زندگی کے تمام اہم واقعات لا کر ان کا نظارہ کراتا ہے، ایک مرحلے پر اسے اپنے سامنے کوئی

رکاوٹ نظر آتی ہے، جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیوی زندگی اور موت کے بعد کی زندگی کے درمیان ایک سرحد ہے، اس سرحد کے قریب پہنچ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ اسے اب واپس جانا ہے، ابھی اسکی موت کا وقت نہیں آیا، اس کے بعد کسی انجانے طریقے پر وہ واپس اپنے اسی جسم میں لوٹ آتا ہے، جو وہ چارپائی پر چھوڑ کر گیا تھا۔

صحت مند ہونے کے بعد وہ اپنی یہ کیفیت دوسروں کو بتانا چاہتا ہے، لیکن اول تو اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے اسے تمام انسانی الفاظ ناکافی معلوم ہوتے ہیں، دوسرے اگر وہ لوگوں کو یہ باتیں بتائے بھی تو وہ مذاق کرنے لگتے ہیں، لہذا وہ خاموش رہتا ہے،،۔

ڈاکٹر مودی نے ڈیڑھ سو افراد کے انٹرویو کا یہ خلاصہ بیان کرتے ہوئے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی ہے کہ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ڈیڑھ سو افراد میں سے ہر شخص نے یہ پوری کہانی اسی ترتیب کے ساتھ بیان کی، بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ کسی نے یہ پوری کہانی بیان کی، کسی نے اس کے کچھ حصے بتائے، کچھ چھوڑ دیئے، کسی کی ترتیب کچھ تھی، کسی کی کچھ اور، بلکہ اس بات کو بیان کرنے کے لئے اکثر افراد نے مختلف الفاظ اور مختلف تعبیرات اختیار کیں، اور یہ بات تقریبا ہر شخص نے کہی کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، اسے لفظوں میں تعبیر کرنا ہمارے لئے سخت مشکل ہے، ایک خاتون نے اپنی اسی مشکل کو قدرے فلسفیانہ زبان میں اس طرح تعبیر کیا:

،،میں جب آپ کو یہ سب کچھ بتانا چاہتی ہوں تو میرا ایک حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ جتنے الفاظ مجھے معلوم ہیں، وہ سب سہ ابعادی (Three- dimensional) ہیں، (یعنی طول، عرض، عمق کے

تصورات میں مقید ہیں) میں نے اب تک جیومیٹری میں یہی پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین بعد ہیں، لیکن جو کچھ میں نے (مردہ قرار دیئے جانے کے بعد) دیکھا اس سے پتہ چلا کہ یہاں تین سے زیادہ ابعاد ہیں۔ اسی لئے اس کیفیت کو ٹھیک ٹھیک بتانا میرے لئے بہت مشکل ہے، کیونکہ مجھے اپنے ان مشاہدات کو سہ ابعادی الفاظ میں بیان کرنا پڑ رہا ہے،،

بہر کیف! ان مختلف افراد نے جو کیفیات بیان کی ہیں، ان میں سے چند بطورِ خاص اہمیت رکھتی ہیں، ایک تاریک سرنگ، دوسرے جسم سے علیحدگی، تیسرے مرے ہوئے رشتہ داروں اور دوستوں کو دیکھنا، چوتھے ایک نورانی وجود، پانچویں اپنی زندگی کے گذرے ہوئے واقعات کا نظارہ، ان تمام باتوں کی جو تفصیل مختلف افراد نے بیان کی ہے، اس کے چند اقتباسات دلچسپی کا باعث ہوں گے:

تاریک سرنگ سے گذرنے کے تجربے کو کسی نے یوں تعبیر کیا ہے کہ میں ایک تاریک خلا میں تیر رہا تھا، کسی نے کہا ہے کہ یہ ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا، اور میں اس میں نیچے بیٹھتا جا رہا تھا، کسی نے اسے ایک کنویں سے تعبیر کیا ہے، کسی نے اسے اندھیرے غار کا نام دیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ وہ ایک تاریک وادی تھی، کوئی کہتا ہے کہ میں اندھیرے میں اوپر اٹھتا چلا گیا، مگر یہ بات سب نے کہی ہے کہ یہ الفاظ اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔

جس مشاہدے کو تمام افراد نے بڑی حیرت کے ساتھ بیان کیا، وہ یہ تھا کہ وہ اپنے جسم سے الگ ہو گئے، ایک خاتون جو دل کے دورے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل تھیں، بیان کرتی ہیں کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل دھڑکنا بند ہو گیا ہے، اور میں اپنے جسم سے پھسل کر باہر نکل رہی ہوں، پہلے میں فرش پر پہنچی، پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگی،

یہاں تک کہ میں ایک کاغذ کے پرزے کی طرح اڑتی ہوئی چھت سے جالگی، وہاں سے میں صاف دیکھ رہی تھی کہ میرا جسم نیچے بستر پر پڑا ہوا ہے، اور ڈاکٹر اور نرسیں اس پر اپنی آخری تدبیریں آزمارہے ہیں، ایک نرس نے کہا، اوہ خدایا! یہ تو گئی، اور دوسری نرس نے میرے جسم کے منہ سے منہ لگا کر اسے سانس دلانے کی کوشش کی، مجھے اس نرس کی گدی پیچھے سے نظر آرہی تھی، اور اسکے بال مجھے ابتک یاد ہیں، پھر وہ ایک مشین لائے جس نے میرے سینے کو جھٹکے دیئے، اور میں اپنے جسم کو اچھلتا دیکھتی رہی۔

جسم سے باہر آنے کی اس حالت کو بعض افراد نے اس طرح تعبیر کیا ہے کہ ہم ایک نئے وجود میں آگئے تھے جو جسم نہیں تھا، اور بعض نے کہا ہے کہ وہ بھی ایک دوسری قسم کا جسم تھا جو دوسروں کو دیکھ سکتا تھا، مگر دوسرے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، اس حالت میں بعض افراد نے نظر آنے والے ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرنے کی بھی کوشش کی، مگر وہ ان کی آواز نہ سن سکے، یہ بات بھی بہت سے افراد نے بتائی کہ وہ ایک بے وزنی کی کیفیت تھی، اور ہم اس بے وزنی کے عالم میں نہ صرف فضا میں تیرتے رہے، بلکہ اگر ہم نے کسی چیز کو چھونے کی کوشش کی تو ہمارا وجود اس شے کے آرپار ہو گیا، بہت سوں نے یہ بھی بتایا کہ اس حالت میں وقت ساکت ہو گیا تھا، اور ہم یہ محسوس کررہے تھے کہ ہم وقت کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں۔

اسی حالت میں کئی افراد نے اپنے مرے ہوئے عزیزوں دوستوں کو بھی دیکھا، اور کچھ لوگوں نے بتایا کہ ہم نے بہت سی بھٹکتی ہوئی روحوں کا مشاہدہ کیا، یہ بھٹکتی ہوئی روحیں انسانی شکل سے ملتی جلتی تھیں، مگر انسانی صورت سے کچھ مختلف بھی تھیں، ایک صاحب نے ان کی کچھ تفصیل اس طرح بتائی:

> ''ان کا سر نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا، وہ بہت غمگین اور افسردہ نظر آتے تھے، وہ سب آپس میں ایک دوسرے میں اسطرح پیوست

معلوم ہوتے تھے جیسے زنجیروں میں بندھا ہوا کوئی گروہ ہو، مجھے یاد
نہیں آتا کہ میں نے ان کے پاؤں بھی دیکھے ہوں، مجھے معلوم نہیں
وہ کیا تھے، مگر ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے، وہ بالکل ست تھے،
اور مٹیالے نظر آتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ
گتھے ہوئے خلا میں چکر لگا رہے ہیں، اور انہیں پتہ نہیں ہے کہ
انہیں کہاں جانا ہے، وہ ایک طرف کو چلنا شروع کرتے، پھر بائیں
کو مڑ جاتے، چند قدم چلتے، پھر دائیں کو مڑ جاتے اور کسی بھی طرف
جاکر کرتے کچھ نہ تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی چیز کی تلاش میں ہیں،
مگر کس چیز کی تلاش میں؟ مجھے معلوم نہیں، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ
خود اپنے بارے میں بھی کوئی علم نہیں رکھتے کہ وہ کون اور کیا ہیں؟
انکی کوئی شناخت نہیں تھی، بعض اوقات ایسا بھی محسوس ہوا کہ ان
میں سے کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا۔

(Reflections P.19)

ڈاکٹر مودی نے جتنے لوگوں کا انٹرویو کیا، ان کی اکثریت نے اپنے اس تجربے کے دوران ایک ''نورانی وجود'' (Being of Light) کا بھی ضرور ذکر کیا ہے، ان لوگوں کا بیان ہے کہ اسے دیکھ کر یہ بات تو یقینی معلوم ہوتی تھی کہ وہ کوئی وجود ہے، لیکن اسکا کوئی جسم نہیں تھا، وہ سراسر روشنی ہی روشنی تھی، ابتدا میں وہ روشنی ہلکی معلوم ہوتی، لیکن رفتہ رفتہ تیز ہوتی چلی جاتی، لیکن اپنی غیر معمولی تابانی کے باوجود اس سے آنکھیں خیرہ نہیں ہوتی تھیں، بہت سے لوگوں نے بتایا کہ اس نورانی وجود نے ان سے کہا کہ تم اپنی زندگی کا جائزہ لو، بعض نے اسکی کچھ اور باتیں بھی نقل کیں، لیکن یہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس نورانی وجود نے جو کچھ کہا، وہ لفظوں اور آواز کے ذریعے نہیں کہا، یعنی اس کے کوئی

لفظ انہیں سنائی نہیں دیتے، بلکہ یہ بالکل نرالا اندازِ اظہار تھا، جس کے ذریعے اسکی باتیں خود بخود ہمارے خیالات میں منتقل ہو رہی تھیں۔

جن لوگوں نے اس بے جسمی کی حالت میں ایک نورانی وجود کو دیکھنے کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اکثر کا کہنا یہ ہے کہ اس نورانی وجود نے ہم سے ہماری سابق زندگی کے بارے میں کچھ سوال کیا، سوال کے الفاظ مختلف لوگوں نے مختلف بیان کئے ہیں، مگر مفہوم سب کا تقریباً یہ ہے کہ تمہارے پاس اپنی سابق زندگی میں مجھے دکھانے کے لئے کیا چیز ہے؟

"What do you have to show me that you have

done with your life?"

پھر ان لوگوں کا بیان ہے کہ اس نورانی وجود نے ہماری سابق زندگی کے واقعات ایک ایک کر کے ہمیں دکھانے شروع کئے، یہ واقعات کس طرح دکھائے گئے؟ اسکی تفصیل اور زیادہ دلچسپ ہے، لیکن وہ میں انشاء اللہ اگلے ہفتے بیان کروں گا، اور اسی کے ساتھ ان واقعات کے بارے میں اپنا تبصرہ بھی۔

۱۲/ محرم ۱۴۱۶ھ

۳۰/ مئی ۱۹۹۶ء

دنیا کے اُس پار
(۲)

پچھلے ہفتے میں نے امریکہ کے ڈاکٹر ریمنڈ اے مودی کی کتابوں کے حوالے سے ان لوگوں کے کچھ تجربات ومشاہدات ذکر کئے تھے جو کسی شدید بیماری یا حادثے کے نتیجے میں موت کے دروازے تک پہنچ کر واپس آ گئے، ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہ بتایا کہ ایک تاریک سرنگ سے گذرنے کے بعد انہیں ایک عجیب وغریب نورانی وجود نظر آیا، اس نے ہم سے ہماری پچھلی زندگی کے بارے میں سوال کیا، اور پھر اس نے پل بھر میں خود ہی ہمیں ہماری زندگی کے سارے واقعات ایک ایک کر کے دکھا دیئے، مثلاً ایک خاتون اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

,,جب مجھے وہ نورانی وجود نظر آیا تو اس نے سب سے پہلے مجھ سے یہ کہا کہ تمہارے پاس اپنی زندگی میں مجھے دکھانے کے لئے کیا ہے؟ اور اس سوال کے ساتھ ساتھ پچھلی زندگی کے نظارے مجھے نظر آنے شروع ہو گئے، میں سخت حیران ہوئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے،؟ کیونکہ اچانک ایسا لگا کہ میں اپنے بچپن کے بالکل ابتدائی دور میں پہنچ گئی ہوں، اور پھر میری آج تک کی زندگی کے ہر سال کا نظارہ ایک ساتھ میرے سامنے آ گیا، میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹی سی

لڑکی ہوں، اور اپنے گھر کے قریب ایک چشمے کے پاس کھیل رہی ہوں، اسی دور میں بہت سے واقعات جو میری بہن کے ساتھ پیش آئے تھے، مجھے نظر آئے، اپنے پڑوسیوں کے ساتھ گذرے ہوئے واقعات دیکھے، میں اپنے آپ کو کنڈر گارٹن میں نظر آئی، میں نے وہ کھلونا دیکھا جو مجھے بہت پسند تھا، میں نے اسے توڑ دیا تھا، اور دیر تک روتی رہی تھی، پھر میں گرلز اسکاؤٹس میں شامل ہو گئی، اور گرامر اسکول کے واقعات میرے سامنے آنے لگے، اسی طرح میں جونیر ہائی اسکول سینئر ہائی اسکول اور گریجویشن کے مراحل سے گذرتی رہی، یہاں تک کہ موجودہ دور تک پہنچ گئی،،

تمام واقعات میرے سامنے اسی ترتیب سے آرہے تھے جس ترتیب سے وہ واقع ہوئے، اور یہ سب واقعات انتہائی واضح نظر آرہے تھے، مناظر بس اس طرح تھے جیسے تم ذرا باہر نکلو اور انہیں دیکھ لو، سب واقعات مکمل طور پر سہ ابعادی(Three- dimensional) تھے، اور رنگ بھی نظر آرہے تھے، ان میں حرکت تھی، مثلاً جب میں نے اپنے آپ کو کھلونا توڑتے دیکھا تو میں اسکی تمام حرکتیں دیکھ سکتی تھی۔

جب مجھے یہ مناظر نظر آرہے تھے، اس وقت میں اس نورانی وجود کو دیکھ نہیں سکتی تھی، وہ یہ کہتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا کہ تم نے کیا کچھ کیا ہے؟ اسکے باوجود میرا احساس یہ تھا کہ وہ وہاں موجود ہے، اور وہی یہ مناظر دکھا رہا ہے، ایسا نہیں تھا کہ وہ خود یہ معلوم کرنا چاہتا ہو، کہ میں نے اپنی زندگی میں کیا کیا ہے؟ وہ پہلے ہی سے

یہ ساری باتیں جانتا تھا، لیکن وہ یہ واقعات میرے سامنے لا کر یہ چاہتا تھا کہ میں انہیں یاد کروں۔

یہ پورا قصہ ہی بڑا عجیب تھا، میں وہاں موجود تھی، میں واقعۃً یہ سب مناظر دیکھ رہی تھی، اور یہ سارے مناظر انتہائی تیزی سے میرے سامنے آرہے تھے، مگر تیزی کے باوجود وہ اتنے آہستہ ضرور تھے کہ میں ان کا بخوبی ادراک کر سکتی تھی، پھر بھی وقت کا دورانیہ اتنا زیادہ نہ تھا، مجھے یقین نہیں آتا، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک روشنی آئی اور چلی گئی، ایسا لگتا تھا کہ یہ سب کچھ پانچ منٹ سے بھی کم میں ہو گیا، البتہ غالباً تیس سیکنڈ سے زیادہ وقت لگا ہوگا، لیکن میں آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا ہی نہیں سکتی،،

ایک اور صاحب نے اپنے اس مشاہدے کا ذکر اس طرح کیا:

,,جب میں اس طویل اندھیری جگہ سے گذر گیا تو اس سرنگ کے آخری سرے پر میرے بچپن کے تمام خیالات، بلکہ میری پوری زندگی مجھے وہاں موجود نظر آئی جو میرے بالکل سامنے روشنی کی طرح چمک رہی تھی، یہ بالکل تصویروں کی طرح نہیں تھی، بلکہ میرا اندازہ ہے کہ وہ خیالات سے زیادہ ملتی جلتی تھی، میں اس کیفیت کو آپ کے سامنے بیان نہیں کر سکتا، مگر یہ بات طے ہے کہ میری ساری زندگی وہاں موجود تھی، وہ سب واقعات ایک ساتھ وہاں نظر آرہے تھے، میرا مطلب ہے کہ ایسا نہیں تھا کہ ایک وقت میں ایک چیز نظر آئے، اور دوسرے وقت دوسری، بلکہ ہر چیز بیک وقت نظر آرہی تھی، میں وہ چھوٹے چھوٹے برے کام بھی دیکھ سکتا

تھا جو میں نے کئے تھے، اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کاش میں نے یہ کام نہ کئے ہوتے، اور کاش میں واپس جا کر ان کاموں کو منسوخ (undo) کر سکتا۔

(Life After Life p. 65-69)

جن لوگوں نے اپنے یہ مشاہدات ڈاکٹر مودی کے سامنے بیان کئے، ان میں سے بعض نے یہ بھی بتایا کہ اس مشاہدے کے آخری مرحلے پر انہوں نے کوئی ایسی چیز دیکھی جیسے کوئی رکاوٹ ہو، اور یا تو کسی نے کہا یا خود بخود ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے لئے اس رکاوٹ کو عبور کرنے کا وقت نہیں آیا، اور اسی کے معاً بعد وہ دوبارہ اپنے جسم میں واپس آ گئے، اور معمول کی دنیا کی طرف پلٹ آئے، بعض لوگوں نے بتایا کہ یہ رکاوٹ پانی کے ایک جسم کی ی تھی، کسی نے کہا کہ یہ ایک مٹیالے رنگ کی دھند تھی، کسی نے اسے دروازے سے تعبیر کیا، کسی نے کہا کہ وہ اس طرح کی ایک باڑھ تھی جو کھیت کے گرد لگا دی جاتی ہے، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ وہ صرف ایک لکیر تھی۔

ڈاکٹر مودی کی یہ کتاب Life After Life سب سے پہلے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی، جس میں انہوں نے آٹھ سال تک تقریباً ڈیڑھ سو افراد سے انٹرویو کے نتائج بیان کئے تھے، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی انکی یہ ریسرچ نہ پوری طرح سائنٹفک ثبوت کہلانے کی مستحق ہے، نہ وہ اس قسم کے واقعات کے ذمہ دارانہ اعداد و شمار دینے کی پوزیشن میں ہیں، لیکن انکی اس کتاب نے دوسرے بہت سے ڈاکٹروں کو اس موضوع کی طرف متوجہ کیا، اور ان کے بعد بہت سے لوگوں نے اس قسم کے مشاہدات کو اپنا موضوع بنایا، اور اس پر مزید کتابیں لکھیں، ان میں سے ایک کتاب ڈاکٹر میلون مورس (Melvin Morse) نے لکھی ہے جو Closer To the Light کے نام سے شائع ہوئی ہے، یہ صاحب بچوں کے امراض کے اسپیشلسٹ ہیں، اور انہوں نے اس بات کی

جستجو شروع کی کہ کیا اس قسم کے مشاہدات بچوں کو بھی پیش آئے ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ بالغ لوگ اپنے ذہنی تصورات سے مغلوب ہو کر کچھ نظارے دیکھ سکتے ہیں، لیکن بچے اس قسم کے تصورات سے خالی الذہن ہوتے ہیں، اس لئے اگر ان میں بھی ان مشاہدات کا ثبوت ملے تو ان نظاروں کی واقعی حیثیت مزید پختہ ہو سکتی ہے، چنانچہ اس کتاب میں انہوں نے بتایا ہے کہ بہت سے بچوں نے بھی اس قسم کے مشاہدات کئے ہیں، اور انہوں نے خود ان بچوں سے ملاقات کر کے ان کے بیانات کو مختلف ذرائع سے ٹسٹ کیا ہے، اور ان کا تأثر یہ ہے کہ ان بچوں نے جھوٹ نہیں بولا، بلکہ واقعۃً انہوں نے یہ مناظر دیکھے ہیں۔ ۲۳۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اسی قسم کے بیانات اور انکے سائنٹفک تجزیے پر مشتمل ہے۔

ایک اور صاحب پالسٹر جارج گیلپ Pollster George Gallup نے پورے امریکہ میں ایسے لوگوں کا سروے کیا جو اس قسم کے مشاہدات سے گذر چکے تھے، ان کے سروے کا چونکا دینے والا خلاصہ یہ ہے کہ امریکہ کی کل آبادی کے تقریباً پانچ فیصد افراد موت کے قریب پہنچ کر اس قسم کے مشاہدات سے گذر چکے ہیں۔ ڈاکٹر مودی نے بھی اپنی تحقیق مزید جاری رکھی، اور اپنی دوسری کتاب The Light Beyond میں انہوں نے لکھا ہے کہ پہلے ڈیڑھ سو افراد کے بعد انہوں نے مزید ایک ہزار افراد سے انٹرویو کیا، اور اس کے نتائج بھی کم و بیش وہی تھے، البتہ اس دوران بعض افراد نے کچھ نئی باتیں بھی بتائیں، مثلاً پہلے ڈیڑھ سو افراد میں سے کسی نے صراحۃً جنت یا دوزخ قسم کی کسی چیز کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن اس نئی تحقیق کے دوران کئی افراد نے ایک روشنیوں کے خوبصورت شہر کا ذکر کیا، بعض نے بڑے خوبصورت باغات دیکھے، اور اپنے بیان میں انہیں جنت سے تعبیر کیا، بعض افراد نے صاف صاف دوزخ کے مناظر بھی بیان کئے، ایک صاحب نے بتایا کہ میں نیچے چلتا گیا، نیچے اندھیرا تھا، لوگ بری طرح چیخ چلا رہے تھے، وہاں آگ تھی،

وہ لوگ مجھ سے پینے کے لئے پانی مانگ رہے تھے، انٹرویو کرنے والے نے پوچھا کہ کیا آپ کسی سرنگ کے ذریعے نیچے گئے تھے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں، وہ سرنگ سے زیادہ بڑی چیز تھی، میں تیرتا ہوا نیچے جا رہا تھا، پوچھا گیا کہ وہاں کتنے آدمی چیخ پکار کر رہے تھے؟ اور انکے جسم پر کپڑے تھے یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ اتنے تھے کہ آپ انہیں شمار نہیں کر سکتے، میرے خیال میں ایک ملین ضرور ہونگے، اور ان کے جسم پر کپڑے نہیں تھے۔ (The Light Beyond P.26,27)

ان تمام مشاہدات کی حقیقت کیا ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مغربی ملکوں میں پر اسراریت کا شوق ایک جنون (Craze) کی حد تک بڑھتا جا رہا ہے، اور یہ کتابیں اسی جنون کا شاخسانہ ہوسکتی ہیں، اگرچہ اس احتمال سے بالکلیہ صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، لیکن ۱۹۷۵ء کے بعد سے جس طرح مختلف سنجیدہ حلقوں نے ان واقعات کا نوٹس لیا ہے، اور ان پر جس طرح ریسرچ کی گئی ہے، اس کے پیش نظر یہ احتمال خاصا بعید ہوتا جا رہا ہے، ڈاکٹر مودی نے اس احتمال پر بھی خاصی تفصیل سے بحث کی ہے کہ جن لوگوں سے انہوں نے انٹرویو کیا وہ بے بنیاد گپ لگانے کے شوقین تو نہیں تھے، لیکن بالآخر نتیجہ یہی نکالا ہے کہ اتنے سارے آدمیوں کا جو مختلف علاقوں اور مختلف طبقہ ہائے خیال سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ہی قسم کی گپ لگانا انتہائی بعید از قیاس ہے۔

بعض ڈاکٹروں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ بعض منشیات اور دواؤں کے استعمال سے بھی اس قسم کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں، جن میں انسان اپنے آپ کو ماحول سے الگ محسوس کرتا ہے، اور بعض اوقات اس کا دماغ جھوٹے تصورات کو مرئی شکل دیدیتا ہے، ایسے میں اسے بعض پر فریب نظارے (Hallucinations) نظر آنے لگتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان افراد کو اسی قسم کی کسی کیفیت سے سابقہ پیش آیا ہو، لیکن ڈاکٹر مودی نے دونوں قسم کی کیفیات کا الگ الگ تجزیہ کرنے کے بعد یہی رائے ظاہر کی ہے کہ جن لوگوں سے انہوں

نے انٹرویو کیا بظاہر ان کے مشاہدات ان پر فریب نظاروں سے مختلف تھے، ڈاکٹر میلون مورس نے اس احتمال پر زیادہ سائنٹفک انداز میں تحقیق کرنے کے بعد اپنا حتمی نتیجہ یہ بتایا ہے کہ یہ مشاہدات(Hallucinations) نہیں تھے۔

انہوں نے اس احتمال پر بھی گفتگو کی ہے کہ ان لوگوں کے مذہبی تصورات ان کے ذہن پر اس طرح مسلط تھے کہ بے ہوشی یا خواب کے عالم میں وہی تصورات ایک محسوس واقعے کی شکل میں ان کے سامنے آگئے، ڈاکٹر مودی نے اس احتمال کو بھی بعید قرار دیا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے انکی ملاقات ہوئی، ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو مذہب کے قائل نہ تھے، یا اس سے اتنے بے گانہ تھے کہ ان پر مذہبی تصورات کی کوئی ایسی چھاپ غالب نہیں آسکتی تھی۔

پھر یہ مشاہدات کیا تھے؟ ان سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اور اس بارے میں قرآن وسنت سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ اس موضوع پر انشاءاللہ آئندہ ہفتے کچھ عرض کروں گا۔

۱۸/ محرم ۱۴۱۷ھ
۵/ جون ۱۹۹۶ء

دنیا کے اُس پار
(۳)

پچھلی دو قسطوں میں میں نے ان لوگوں کے بیانات کا خلاصہ ذکر کیا تھا جو موت کے دروازے پر پہنچ کر واپس آ گئے، انہوں نے اپنے آپ کو اپنے جسم سے جدا ہوتے ہوئے دیکھا، ایک تاریک سرنگ سے گذرے، ایک نورانی وجود کا مشاہدہ کیا، اور پھر اس نورانی وجود نے ان کے سامنے انکی سابقہ زندگی کا پورا نقشہ پیش کر دیا۔

یہ بات تو واضح ہے کہ ان لوگوں کو موت نہیں آئی تھی، اگر موت آ گئی ہوتی تو یہ دوبارہ دنیا میں واپس نہ آتے، خود ڈاکٹر مودی جنہوں نے ان لوگوں کے بیانات قلمبند کئے وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے موت نہیں دیکھی، البتہ موت کے نزدیک پہنچ کر کچھ عجیب وغریب مناظر ضرور دیکھے، چنانچہ ان مشاہدات کے لئے انہوں نے جو اصطلاح وضع کی ہے، وہ ہے Near-death Experiences (قریب الموت تجربات) جسے مخفف کر کے وہ .N.D.E سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہی اصطلاح بعد کے مصنفین نے بھی اپنائی ہے، لہٰذا اگر ان لوگوں کے بیانات کو سچ مان لیا جائے۔ اور ڈاکٹر مودی کی حتمی رائے یہ ہے کہ اتنے بہت سے افراد کو بیک وقت جھٹلانا ان کے لئے آسان نہیں، تو بھی یہ بات ظاہر ہے کہ انہوں نے موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کا مشاہدہ نہیں کیا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ازخود رفتگی کے عالم میں انہیں اس جہان کی کچھ جھلکیاں نظر آئیں جس کا

دروازہ موت ہے۔

میڈیکل سائنس چونکہ صرف ان چیزوں پر یقین رکھتی ہے جو آنکھوں سے نظر آجائیں، یا دوسرے حواس کے ذریعے محسوس ہو جائیں، اس لئے ابھی تک وہ انسانی جسم میں روح نام کی کسی چیز کو دریافت نہیں کر سکی، اور نہ روح کی حقیقت تک اسکی رسائی ہو سکی ہے، (اور شاید روح کی مکمل حقیقت اسے جیتے جی کبھی معلوم نہ ہو سکے، کیونکہ قرآن کریم نے روح کے بارے میں لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمادیا ہے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے، اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) لیکن قرآن وسنت سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ زندگی جسم اور روح کے مضبوط تعلق کا نام ہے، اور موت اس تعلق کے ٹوٹ جانے کا۔

اس سلسلے میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہم اپنی بول چال میں موت کے لئے جو وفات کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ قرآن کریم کے ایک لفظ "توفی" سے ماخوذ ہے، قرآن کریم سے پہلے عربی زبان میں یہ لفظ "موت" کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا، عربی زبان میں موت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے تقریباً چوبیس الفاظ استعمال ہوتے تھے، لیکن وفاۃ یا "توفی" کا اس معنی میں کوئی وجود نہ تھا، قرآن کریم نے پہلی بار یہ لفظ موت کے لئے استعمال کیا، اور اسکی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں نے موت کے لئے جو الفاظ وضع کئے تھے، وہ سب ان کے اس عقیدے پر مبنی تھے، کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، قرآن کریم نے "توفی" کا لفظ استعمال کر کے لطیف انداز میں انکے اس عقیدے کی تردید کی، "توفی" کے معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا، اور موت کے لئے اس لفظ کو استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ موت کے وقت انسان کی روح کو اسکے جسم سے علیحدہ کر کے واپس بلا لیا جاتا ہے، اسی حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کرتے ہوئے سورۂ زمر میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِىْ لَمْ تَمُتْ فِىْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِىْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾

یعنی اللہ تعالیٰ انسانوں کی موت کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے، اور جو لوگ مرے نہیں ہوتے، انکی روحیں انکی نیند کی حالت میں واپس لے لیتا ہے، پھر وہ جنکی موت کا فیصلہ کر لیتا ہے انکی روحیں روک لیتا ہے، اور دوسری روحوں کو ایک معین وقت تک چھوڑ دیتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو غور فکر کرتے ہیں۔

(سورۃ الزمر۔ ۴۲)

دوسری طرف حضرت آدم علیہ السلام کو زندگی عطا کرنے کے لئے قرآن کریم نے ان کے اندر روح پھونکنے سے تعبیر فرمایا ہے، قرآن کریم کے ان ارشادات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ زندگی نام ہے جسم کے ساتھ روح کے قوی تعلق کا، جسم کے ساتھ روح کا تعلق جتنا مضبوط ہوگا، زندگی کے آثار اتنے ہی زیادہ واضح اور نمایاں ہونگے، اور یہ تعلق جتنا کمزور ہوتا جائے گا زندگی کے آثار اتنے ہی کم ہوتے جائیں گے۔ بیداری کی حالت میں جسم اور روح کا یہ تعلق نہایت مضبوط ہوتا ہے، اس لئے اس حالت میں زندگی اپنی بھرپور علامات اور مکمل خواص کے ساتھ موجود ہوتی ہے، اس حالت میں انسان کے تمام حواس کام کر رہے ہوتے ہیں، اس کے تمام اعضاء اپنے اپنے عمل کے لئے چوکس اور تیار ہوتے ہیں، انسان اپنے اختیار کو پوری طرح استعمال کرتا ہے، اور اسکے سوچنے سمجھنے پر کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہوتی، لیکن نیند کی حالت میں جسم کے ساتھ روح کا تعلق قدرے کمزور پڑ جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سونے کی حالت میں انسان پر

زندگی کی تمام علامتوں کا ظہور نہیں ہوتا، وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، نیند کی حالت میں وہ اپنے اختیار سے اپنے اعضاء کو استعمال نہیں کرسکتا، نہ اس وقت معمول کے مطابق سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی روح کا تعلق جسم کے ساتھ اتنا مضبوط ضرور ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر وارد ہونے والے واقعات کا احساس باقی رہتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اس کے جسم میں سوئی چبھودے تو اسکی تکلیف محسوس کر کے وہ بیدار ہو جاتا ہے۔

نیند سے بھی آگے ایک اور کیفیت بے ہوشی کی ہے، اس کیفیت میں جسم کے ساتھ روح کا رشتہ نیند کی حالت سے بھی زیادہ کمزور ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مکمل بے ہوشی کی حالت میں انسان کے جسم پر نشتر بھی چلائے جائیں، تو اسے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، اور بے ہوشی کی اسی صفت سے فائدہ اٹھا کر اس حالت کو بڑے بڑے آپریشنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس حالت میں انسان کے جسم سے زندگی بیشتر علامات اور خاصیتیں غائب ہو جاتی ہیں، البتہ دل کی دھڑکن اور سانس کی آمدورفت باقی رہتی ہے جس سے اس کے زندہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

بے ہوشی سے بھی آگے ایک اور کیفیت بعض لوگوں پر شدید بیماری کے عالم میں طاری ہوتی ہے جسے عرفِ عام میں ,,سکتہ،، سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس حالت میں زندگی کی تمام ظاہری علامات ختم ہو جاتی ہیں، اور صرف عام آدمی ہی کو نہیں، ڈاکٹر کو بھی بظاہر زندگی کی کوئی رمق معلوم نہیں ہوتی، دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ہے، سانس رک جاتا ہے، بلڈ پریشر غائب ہو جاتا ہے، جسم کی حرارت تقریباً ختم ہو جاتی ہے، لیکن دماغ کے کسی مخفی گوشے میں زندگی کی کوئی برقی رو باقی ہوتی ہے، یہی وہ حالت ہے جس میں ڈاکٹر صاحبان آخری چارۂ کار کے طور پر تنفس یا دل کی دھڑکن کو بحال کرنے کے لئے کچھ مصنوعی طریقے آزماتے ہیں، بعض افراد پر یہ طریقے کامیاب ہو جاتے ہیں، اور مریض

اس عمل کے بعد معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے، اور اس کے واپس آجانے ہی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ابھی تک مرا نہیں تھا، اور اسکی روح بالکلیہ جسم سے جدا نہیں ہوئی تھی، یہ زندگی کا کمزور ترین درجہ ہے جس میں روح کا تعلق انسان کے جسم کے ساتھ بہت معمولی سارہ جاتا ہے۔

پھر روح کا تعلق جسم سے جتنا کمزور ہوتا ہے، اتنی ہی وہ جسم کی قید سے آزاد ہوتی ہے، نیند کی حالت میں یہ آزادی کم ہے، بے ہوشی کی حالت میں اس سے زیادہ اور ,, سکتے ،، کی حالت میں اس سے بھی زیادہ، لہذا سکتے کی یہ حالت جس میں روح کا تعلق جسم کے ساتھ بہت معمولی رہ جاتا ہے، اور وہ جسم کی قید سے کافی حد تک آزاد ہو چکی ہوتی ہے، اس حالت میں اگر کسی انسان کا ادراک اپنی روح کے سفر میں شریک ہو جائے اور اسے مادی زندگی کے اس پار دوسرے عالم کی کوئی جھلک نظر آجائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، اور تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں اس قسم کے لوگوں نے عالمِ بالا کے کچھ مناظر کا مشاہدہ کیا، جن لوگوں کے بیانات میں نے پیچھے ڈاکٹر مودی کے حوالے سے نقل کئے ہیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ جھوٹ اور دھوکے کے عمل دخل سے خالی ہیں تو ان کے یہ مشاہدات بھی اسی نوعیت کے ہو سکتے ہیں، لیکن انکے بارے میں چند باتیں ذہن نشین رکھنی ضروری ہیں:

(۱) جن لوگوں کو یہ مناظر نظر آئے انہیں ابھی موت نہیں آئی تھی، لہذا جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ دوسرے جہاں کی جھلکیاں تو ہو سکتی ہیں، لیکن مرنے کے بعد پیش آنے والے واقعات نہیں۔

(۲) جس حالت میں ان لوگوں نے یہ مناظر دیکھے وہ زندگی ہی کی ایک حالت تھی، اور کم از کم دماغ کے مخفی گوشوں میں ابھی زندگی باقی تھی، لہذا ان نظاروں میں دماغ کے تصرف کا امکان بعید از قیاس نہیں۔

(۳) جن لوگوں نے اپنے مشاہدات بیان کئے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ ان مشاہدات کی تفصیل وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے، پھر بھی انہوں نے یہ کیفیات بیان کرنے کے لئے محدود لفظوں ہی کا سہارا لیا، چنانچہ یہ بات اب بھی مشکوک ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے ان کیفیات کو بیان کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے؟ نیز انہیں کونسی بات کتنی صحت کے ساتھ یاد رہی؟

ان وجوہ سے ان مشاہدات کی تمام تفصیلات پر تو بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، نہ انہیں ما بعد الموت کے بارے میں کسی عقیدے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے، مابعد الموت کے جتنے حقائق ہمیں معلوم ہونے ضروری ہیں وہ وحی الٰہی کے بے غبار راستے سے آنحضرت ﷺ نے ہمیں پہنچادیئے ہیں، اور وہ اپنی تصدیق کے لئے اس قسم کے بیانات کے محتاج نہیں، لیکن ان مشاہدات کی بعض باتوں کی تائید قرآن و سنت کے بیان کردہ حقائق سے ضرور ہوتی ہے، مثلاً ان تمام بیانات کی یہ قدرِ مشترک قرآن و سنت سے کسی شک و شبہ کے بغیر ثابت ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی حد تک محدود نہیں جو ہمیں اپنے گردوپیش میں پھیلی نظر آتی ہے، بلکہ دنیا کے اس پار ایک عالم اور ہے جس کی کیفیات کا ٹھیک ٹھیک ادراک ہم مادی کثافتوں کی قید میں رہتے ہوئے نہیں کر سکتے، وہاں پیش آنے والے واقعات زمان و مکان کے ان معروف پیمانوں سے بالاتر ہیں جن کے ہم دنیوی زندگی میں عادی ہو چکے ہیں، یہاں ہم یہ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک کام جسے انجام دینے کے لئے سالہا سال درکار ہوتے ہیں وہ ایک لمحہ میں کیسے انجام پا سکتا ہے؟ لیکن وہاں پیش آنے والے واقعات وقت کی اس قید سے آزاد ہیں، قرآن کریم فرماتا ہے:۔

﴿إِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ﴾

"تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک دن تمہاری گنتی کے لحاظ سے ایک ہزار سال کے برابر ہے" (سورۃ الحج۔ ۴۷)

یہ عالم کیا ہے؟ اسکے تقاضے کیا ہیں؟ اور اس تک پہنچنے کے لئے کس قسم کی تیاری ضروری ہے؟ یہی باتیں بتانے کے لئے انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے ہیں، کیونکہ یہ باتیں ہم صرف اپنے حواس اور اپنی عقل سے معلوم نہیں کرسکتے، آخری دور میں یہ باتیں ہمیں حضور نبی کریم ﷺ نے اسلامی شریعت کے ذریعہ بتادی ہیں، اور جسے اس عالم کے لئے ٹھیک ٹھیک تیاری کرنی ہو، وہ اس شریعت کو سیکھ لے، اس پر اس عالم کے حقائق بھی واضح ہو جائیں گے، اور وہاں تک پہنچنے کا صحیح طریقہ بھی آجائے گا۔

۲۵/ محرم ۱۴۱۷ھ
۱۲/ جون ۱۹۹۶ء

مفت کا عہدہ

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی (رحمۃ اللہ علیہ) دارالعلوم دیوبند کے مشہور اساتذہ میں سے تھے، ایسے اساتذہ میں سے کہ جس کسی شخص نے ایک مرتبہ ان سے پڑھ لیا وہ عمر بھر ان کی بارعب شفقت کو بھلا نہ سکا، وہ اپنے شاگردوں کے لئے ایک ناقابلِ فراموش شخصیت تھے، دن رات پڑھنے پڑھانے میں غرق اور اپنے ایک ایک شاگرد کے ذاتی حالات تک سے واقف، وہ پابندیٔ وقت کے ساتھ درس وتدریس میں اس طرح مشغول رہتے تھے کہ ان کو درسگاہ کے دروازے پر دیکھ کر گھڑی ملائی جاسکتی تھی، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والا ہر شخص تو انہیں جانتا تھا، لیکن عوام میں ان کی شہرت اس لئے زیادہ نہیں ہوئی کہ نہ وہ تقریر وخطابت کے آدمی تھے، نہ سیاست کے، ان کی اردو تصانیف بھی بہت کم ہیں (ان کی تقریباً تمام تصانیف عربی میں ہیں، اور درسی موضوعات سے متعلق ہیں جن سے علماء دن رات فائدہ اٹھاتے ہیں) یوں بھی طبعی طور پر وہ نام ونمود سے کہیں دور اور گوشہ نشین بزرگ تھے جو شہرت کے اسباب سے نفرت کرتے ہیں، اور ان کی ساری تگ ودو اپنے اللہ سے رابطہ استوار رکھنے میں صرف ہوتی ہے، وہ اپنی بے نام ونشان زندگی میں مگن رہتے ہیں، اور ان کی بے نام ونشان زندگی دوسروں کے لئے سینکڑوں نشان چھوڑ جاتی ہے۔

یہی حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ میرے والد ماجد (حضرت مفتی محمد شفیعؒ

صاحبؒ) کے بھی استاد تھے، ایک مرتبہ والد صاحبؒ اور دارالعلوم کے کچھ اور اساتذہ اکٹھے کسی سفر پر جانے لگے، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ ان سب کے استاد تھے، اور وہ بھی ان کے ساتھ تشریف لے جارہے تھے، جب تمام حضرات ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو کر ریل کا انتظار کرنے لگے تو حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے ساتھیوں سے فرمایا کہ شریعت کے مطابق جب کئی افراد سفر پر جارہے ہوں تو انہیں اپنے میں سے کسی کو امیر بنا لینا چاہئے، لہذا اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کرلو۔

میرے والد صاحبؒ نے عرض کیا کہ ,, حضرت! انتخاب کا کیا سوال ہے؟ امیر تو پہلے ہی ہم میں موجود ہیں،، (والد صاحبؒ کا اشارہ خود مولانا کی طرف تھا) مولانا نے پوچھا ,, کیا آپ مجھے امیر بنانا چاہتے ہیں؟،،

جی ہاں! سب حضرات نے یک آواز ہو کر جواب دیا، آپ کی موجودگی میں کسی اور کے امیر بننے کا سوال ہی کیا ہے؟

مولانا نے فرمایا ٹھیک ہے، مجھے کوئی تکلف یا اعتراض نہیں، لیکن یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ امیر کا حکم ماننا ضروری ہے آپ کو بھی میرے احکام ماننے ہوں گے۔

سب نے کہا کہ آپ کا حکم ویسے بھی ہمارے لئے واجب التعمیل ہے، امیر بننے کے بعد تو اور بھی زیادہ واجب الاطاعت ہوگا۔ اس طرح مولاناؒ نے اپنے تمام ساتھیوں سے حکم ماننے کا اقرار لے لیا، اور اطمینان سے ریل آنے کا انتظار کرنے لگے، تھوڑی دیر میں ریل آگئی تو مولاناؒ بجلی کی سی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھے، اور جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کا سامان سمیٹ کر اٹھانے لگے، ایک عدد ہاتھ میں، ایک بغل میں ایک دوسرے ہاتھ میں اور اس طرح جتنے عدد خود اٹھا سکتے تھے انہوں نے خود اٹھا لئے، ساتھی سب ان کے شاگرد تھے، اس لئے یہ صورت دیکھ کر بے تاب ہوگئے، اور ہر شخص نے آگے بڑھ کر مولانا کے ہاتھ سے سامان چھینا چاہا، لیکن مولانا نے سختی سے سامان سنبھالے رکھا، اور جب

ساتھیوں نے التجا کی کہ سامان ہمیں دیدیجئے تو مولانا نے فرمایا میں آپ سب کا امیر ہوں، اور آپ وعدہ کر چکے ہیں کہ میرا کہنا مانیں گے،لہذا میں بحیثیتِ امیر آپ کو حکم دیتا ہوں کہ مجھے سامان اٹھانے دیں اور مجھ سے چھیننے کی کوشش نہ کریں۔

اسکے بعد پورے سفر میں مولانا کا معمول یہی رہا کہ جب کوئی محنت یا مشقت کا کام آتا مولانا خود آگے بڑھ کر وہ کام اپنے ہاتھوں سے کرتے، اور ساتھی اصرار کرتے تو ہر بار انہیں امیر کا حکم سنا کر ان کا وعدہ یاد دلادیتے، اور ساتھی لاجواب ہو کر رہ جاتے، یہاں تک کہ ایک موقع پر ایک بے تکلف شاگرد نے کہدیا کہ حضرت! ہم تو آپ کو امیر بنا کر بہت پچھتائے، مولانا جواب میں مسکرادیئے مطلب غالباً یہی تھا کہ امیر کا صحیح مطلب سمجھانا بھی تو میری ذمہ داری تھی۔

یہ تھا امیر کا صحیح مفہوم جو حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے اپنی طرف سے ایجاد نہیں کر لیا تھا، بلکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے قول و فعل سے امیر کا یہی مطلب بتایا تھا، اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام جو آپ ﷺ کے بعد امیر بنے انہوں نے بھی اسی پر عمل کر کے دکھایا، لیکن ہوتے ہوتے ہم امیر اور سربراہ کا یہ مطلب بھول گئے، اور اسی راستے پر چل پڑے جو قیصر و کسری کا راستہ تھا۔

اسلام کی تقریباً تین چوتھائی تعلیمات حقوق العباد سے متعلق ہیں، اور ان کا محور آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ ,, تمام لوگوں میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے،، یعنی ان کی خدمت کرے، خدمت کے رنگ اور انداز الگ الگ ہیں، لیکن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان سب کا بھلا چاہے، اور ایثار سے کام لے کر دوسروں کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے۔

آج کی مادہ پرست دنیا میں ہم نے لذت و راحت کو روپے پیسے سے اس طرح وابستہ کر لیا ہے کہ ہم صرف اسی لذت کو لذت سمجھتے ہیں جو نوٹوں کی گنتی اور اسباب راحت کی

فراہمی سے حاصل ہوتی ہے، ہمیں اس لذت اور قلبی سکون کی ہوا بھی نہیں لگی جو اپنے کسی بھائی بہن کا دکھ دور کر کے یا اسے آرام پہنچا کر حاصل ہوتی ہے، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے خدمتِ خلق کا ذوق عطا فرمایا ہے، ان کے دل سے پوچھئے کہ کسی ضرورت مند کا کام کر کے یا کسی غمزدہ کے چہرے پر مسکراہٹ اور اطمینان لا کر قلب و روح کو جو تسکین اور لذت میسر آتی ہے، اس کے آگے نفسانی خواہشات کی ساری لذتیں ہیچ ہیں۔

میرے مربی بزرگ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفیؒ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے عہدے اور منصب ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جسے حاصل کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہو، اگر کوئی شخص کسی ملک، ادارے یا جماعت کا سربراہ بننا چاہے تو ہزار کوشش کے باوجود ضروری نہیں کہ اس مقصد میں کامیاب ہو جائے، کتنے لوگ ہیں جو یہی جدوجہد کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن اس عہدے تک نہ پہنچ سکے، پھر اگر کسی کو اس قسم کا کوئی عہدہ مل بھی جائے تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ عہدہ ہمیشہ قائم رہیگا، نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو عہدہ و منصب رکھنے والوں کے خلاف حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں، اور بہت سے انہیں اس عہدے سے اتارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اور بسا اوقات کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، اور کل کے حکمران آج جیل کی کوٹھڑی میں نظر آتے ہیں، لیکن ان سارے عہدوں اور مناصب سے ہٹ کر میں تمہیں ایک ایسا مفت کا عہدہ بتاتا ہوں جس کا حصول تمہارے اپنے اختیار میں ہے، ہر شخص جب چاہے وہ عہدہ حاصل کر سکتا ہے، اور جبتک انسان خود نہ چاہے کوئی دوسرا اس کو اس عہدے سے معزول بھی نہیں کر سکتا، وہ عہدہ ہے خادم کا عہدہ اپنے آپ کو اللہ کی مخلوق کا خادم قرار دیدو، اور یہ طے کر لو کہ میں جہاں کہیں ہونگا، اور جس حیثیت میں ہونگا، دوسروں کی خدمت کی کوشش کروں گا، بس تمہیں اپنے اختیار سے یہ عہدہ مل گیا، اور یہ عہدہ ایسا ہے کہ نہ اس کی وجہ سے کوئی تم پر حسد کرے گا، نہ کوئی تم سے یہ منصب چھیننے کی

کوشش کرے گا، نہ کوئی تمہیں اس عہدے سے معزول کر سکے گا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد تمہارا جو قدم اٹھیگا وہ عبادت شمار ہوگا، ایسی عبادت جو تمام نفلی عبادتوں سے افضل ہے، اور جس کے بارے میں مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے کہ ؎

زتسبیح وسجادہ ودلق نیست

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

(طریقت یعنی تصوف تسبیح، جانماز اور گدڑی سے حاصل نہیں ہوتا، تصوف خدمتِ خلق کے بغیر نامکمل ہے)

لہذا جن اللہ کے بندوں کو اس مفت کے اختیاری عہدے کی لذت اور اسکے مفادات کا صحیح ادراک حاصل تھا، وہ دنیا کے معروف عہدوں میں سے خواہ کتنے اونچے عہدے پر پہنچ گئے ہوں، لیکن کسی حالت میں انہوں نے خادم کا یہ اختیاری عہدہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے، اور انہیں مفتی اعظم ہند کا نام دیا جاتا تھا، ان کے لکھے ہوئے فتاوی کا انتخاب دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے، اور ابھی تک نامکمل ہے، لیکن ان کا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ صبح کو دفتر جانے سے پہلے اپنے محلے کی بیوہ خواتین کے گھر جاتے، ان کا حال معلوم کرتے، اور ان سے پوچھتے کہ اگر آپ کو بازار سے سودا منگوانا ہو تو بتا دیجئے، وہ خواتین مولانا کو اپنی ضروریات بتاتیں، اور مولانا خود بازار جا کر ان کا سودا سلف لاتے، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی خاتون کہتی مفتی صاحب! یہ چیز تو آپ غلط لے آئے، میں نے فلاں چیز منگوائی تھی، مفتی صاحب یہ سنکر دوبارہ بازار جاتے اور غلطی کی تلافی فرماتے۔

مفتی صاحب کے بہت سے شاگرد تھے، اور وہ یہ کام خود کرنے کے بجائے اپنے شاگردوں سے بھی کرا سکتے تھے، لیکن ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ نبی کریم ﷺ اور خلفاء

راشدینؓ کی سنت ہے، وہ حضرات دونوں جہاں کے اتنے بڑے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود اپنے ہاتھوں سے لوگوں کی خدمت کرتے تھے، اس لئے خدمت خلق کی یہ لذت اور اس کا اجر و ثواب میں خود براہ راست کیوں حاصل نہ کروں؟

یہ تھا خادم کا وہ اختیاری منصب جو ان حضرات نے دوسرا بڑے سے بڑا اعزاز ملنے کے بعد بھی نہیں چھوڑا، غور فرمائیے کہ اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے عام غیر اختیاری عہدوں کے ساتھ ساتھ یہ مفت کا اختیاری عہدہ بھی حاصل کر لے اور اسے مستقل سنبھالے رکھے تو معاشرے کے کتنے زخم بھر جائیں! ہم اگر دوسروں کا سامان نہ اٹھائیں، ان کے گھر میں پانی نہ بھریں، اور بیواؤں کا سودا سلف خود اپنے ہاتھوں سے نہ لائیں، تو کم از کم اتنا ہی کر لیں کہ جب ان میں سے کوئی شخص ہم سے ہمارے فرائض منصبی میں سے کسی کام کا مطالبہ کرے اس کا کام ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ کر دیں۔

جشنِ آزادی کے دِن

14 راگست کا دن تھا۔ پورا شہر آزادی کی پچاسویں سالگرہ کا جشن منانے میں محو نظر آتا تھا، اور صرف عمارتیں ہی نہیں، کاریں، بسیں اور موٹر سائیکلیں بھی سبز ہلالی پرچم سے سجی ہوئی تھیں۔ میں اس روز دوپہر کو نیشنل اسٹیڈیم کی عقبی گلی سے گزر رہا تھا جو عموماً سنسان پڑی رہتی ہے، پیدل چلتا ہوا کوئی آدمی اکّا دکّا ہی نظر آتا ہے، البتّہ گاڑیاں کسی مختصر راستے کی تلاش میں ادھر سے گذرتی رہتی ہیں۔ جونہی میں مرکزی سڑک سے اس گلی میں مُڑا تو کچھ فاصلے پر نظر آیا کہ سڑک کے کنارے کوئی پیلی پیلی چیز بکھری ہوئی ہے، دور سے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے زرد رنگ کا سفوف بکھیر دیا ہو، پھر اس کے قریب ہی ایک آدمی بھی بیٹھا ہوا نظر آیا، جب گاڑی قریب پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ پیلی پیلی چیز چھولے تھے اور قریب بیٹھا ہوا شخص انہیں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اندازہ ہو گیا کہ کسی غریب خوانچہ فروش کے چھولے زمین پر گر گئے ہیں، اور وہ انہیں اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے، جب گاڑی اور قریب پہنچی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نظر آئے۔ میں گاڑی رکوا کر اس کے پاس پہنچا تو وہ ایک پچیس تیس سال کی عمر کا نوجوان تھا، جس کے سر سے لیکر پاؤں تک ہر چیز مفلوک الحال کی داستان سنا رہی تھی، اور وہ گرے ہوئے چھولوں کو سمیٹتے ہوئے بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کے گرد آلود رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں صاف نظر آ رہی تھیں، میں نے اس کے قریب پہنچ کر ماجرا معلوم کرنا چاہا تو شروع میں اس کے منہ سے آواز نہ نکلی، پھر بمشکل اس نے یہ الفاظ ادا کئے کہ ''میں چھولے بیچنے کے لئے لیجا رہا تھا،

ایک اسکوٹر والا پیچھے سے آیا اور اس نے ٹکر ماردی، میرے سارے چھولے زمین پر گر گئے، میں نے دیکھا کہ اس نے اوپر اوپر کے چھولے تو جوں توں کر کے اٹھا کر اپنی ٹوکری میں رکھ لئے تھے، لیکن باقی چھولوں کو اٹھاتے وقت وہ یہ تمیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان میں سے کونسے اٹھانے کے قابل ہیں اور کونسے مٹی میں مل جانے کی وجہ سے بیچنے کے لائق نہیں۔ اتنے میں پیچھے سے ایک اور کار فرّاٹے بھرتی ہوئی آئی، اور انہی بچے کچھے چھولوں کو روند کر ان کو خاک آلود آٹا بناتی ہوئی نکل گئی، اس نوجوان کی ہچکیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ کبھی گرے ہوئے چھولوں کو دیکھتا، کبھی اپنی ٹوکری کو، اور کبھی مجھے، جیسے زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ ''یہ دیکھنے میں تھوڑے سے چھولے ہیں، مگر میری تو پوری کائنات تھی جو جشن آزادی میں مست اسکوٹر نے ایک ہی جھٹکے میں مٹی میں ملادی، میں نے یہ چھولے تیار کرنے کے لئے نہ جانے کس طرح پیسے مہیا کئے، کس طرح انہیں تیار کیا اور کس طرح انہیں سر پر اٹھا کر پیدل فاصلہ طے کیا، تا کہ انہیں بیچ کر شام کو کچھ پیسے گھر لیجا سکوں، مگر آن کی آن میں میری پونجی لٹ گئی۔

کہنے کو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اس میں ہمارے معاشرے کی انتہائی متضاد تصویر چھپی ہوئی ہے، وہ مفلوک الحال نوجوان کتنا قابلِ قدر تھا جس نے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے بجائے محنت کر کے چھولے بیچنے کو ترجیح دی، لیکن اس کے مقابلے میں اس شکم سَیر نوجوان کا تصور کیجئے جو اسکوٹر دوڑاتے ہوئے اس مسکین کی ساری کائنات تباہ کر گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، اور اس کار نشین کو دیکھئے جو اس مصیبت زدہ شخص کو دیکھتے ہوئے بھی اس کے گرے ہوئے چھولوں کو روندتا ہوا گذر گیا۔

اول تو اس بے پروائی اور غفلت کی ساتھ گاڑیاں دوڑانا بذاتِ خود ایک ناجائز فعل ہے، اور اگر بالفرض یہ غلطی ہو بھی جائے اور اس کے نتیجے میں کسی کو نقصان پہنچ جائے تو گری سے گری حالت میں بھی انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس نقصان کی حتی الامکان تلافی کی کوشش کی جائے۔ اور ضرر رسیدہ شخص سے کم از کم معذرت اور ہمدردی کا اظہار ہی کر لیا جائے، مگر جو قوم اپنے

غریبوں کو ان کا یہ کم سے کم حق دینے کو بھی تیار نہ ہو، کیا اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی ''آزادی'' کا جشنِ مسرّت منائے؟ کیا آزادی کے پچاس سال میں ہم نے اپنی یہی تربیت کی ہے؟

واقعہ بظاہر چھوٹا سا تھا، مگر میرے دل ودماغ پر چھا گیا۔ اس کے بعد جہاں کہیں جشن آزادی کے طرب کدے دیکھتا، ان کے عین درمیان مجھے وہ خاک آلود چھولے والا نظر آجاتا...... ملک بھر میں اس طرح کے نہ جانے کتنے چھولے والے ہیں جو عیش وطرب کے ھنگاموں کے عین درمیان روزانہ کھڑے کھڑے لُٹ جاتے ہیں اور نہ جانے کتنے اسکوٹر والے اور کار والے ہیں جو چشم زدن میں ان کی ساری کائنات خاک میں ملا کر ان کی مفلوک الحالی کی ہنسی اڑاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ جب تک ہمارے دلوں میں اس صورتِ حال کی نفرت اور اسے دور کرنے کا ناقابلِ شکست جذبہ پیدا نہیں ہوتا، اس وقت تک ہماری نسبت سے ''جشنِ آزادی'' کا لفظ ایک مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

اسلام نے اول تو تہواروں اور رسمی جشنوں کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی، دوسرے سال بھر میں جو دو خوشی منانے کے دن رکھے ہیں، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ، ان میں خوشی منانے کا طریقہ بھی یہ سکھایا ہے کہ عید الفطر کی نماز کو جانے سے بھی پہلے صدقۃ الفطر ادا کرو، یعنی اس دن بیدار ہونے کے بعد اور دن کا آغاز کرنے سے پہلے اس بات کی فکر کرو کہ کہیں کچھ لوگوں کے چولھے آج بھی ٹھنڈے تو نہیں؟ سبق یہ دیا گیا کہ جو شخص دوسرے کے آنسو نہیں پونچھ سکتا، اسے مسکراہٹوں اور قہقہوں کا حق نہیں پہنچتا، اس کے برعکس جو شخص دوسرے کو آنسوؤں میں نہلا کر خود قہقہے لگانا چاہتا ہے، وہ اپنی روح کے زخموں پر بے حسی کے کتنے پردے ڈال لے، بالآخر اس کے قہقہے ایک نہ ایک دن چیخوں میں ضرور تبدیل ہو کر رہیں گے۔

نشری تقریریں
مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴